خوش فکر شاعر۔ خضر تمیمی
تحقیق، تدوین، جائزہ
جو پرانے ہیں انہیں یاد ہے شاعر کا پتا
جو نئے ہیں انہیں معلوم ہو کیا خضرؔ کا فن
صفدر علی شاہ

خوش فکر شاعر

خضر تمیمی

(تحقیق، تدوین، جائزہ)

صفدر علی شاہ

دریچہء ادب پاکستان ۔ جھنگ

KHUSH FIKR SHAER
KHIZAR TAMIMI
WRITTEN bY
SAFDAR ALI SHAH
MOBILE # 0333-6732552

اشاعت اوّل — مئی 2010

سرورق — محمد معصوم

کمپوزنگ — محمد ارشد سنگرش، محمد تنزیل شہزاد
شہزاد گرافکس اینڈ فلیکس پوائنٹ فوارہ چوک جھنگ صدر

مطبع — سلطان باہو پرنٹنگ پریس جھنگ صدر

ناشر — وسیم عباس شاہ

باہتمام — دریچۂ ادب پاکستان، جھنگ

قیمت — 250 روپے

سٹاکسٹ

☆ شیخ محمد حسین کتب فروش، فوارہ چوک جھنگ صدر
☆ ورائٹی بکس، یوسف شاہ روڈ جھنگ صدر
☆ آصف کتاب گھر، فوارہ چوک جھنگ صدر
☆ مسلم کتاب گھر، شاہی منڈی، چنیوٹ

انتساب

ان تعلیمی اداروں کے نام
جہاں سے میں نے اکتساب علم وفیض کیا

مشمولات

پیش تحریر

مجھے شعر سننے اور پڑھنے کا شوق اس عمر سے ہے جب میں نے شعور کی منزل پر قدم رکھا تھا۔ مجھ میں شعر گوئی کی صلاحیت تو نہیں ہے تاہم جو شعر دل میں اتر جائے اس کی لذت سے طویل عرصے تک سرور و کیف حاصل کرتا رہتا ہوں تاوقتیکہ کوئی اور شعر اس کی جگہ نہ لے لے۔ کسی بھی شعر کے بارے میں میری پسندیدگی کا معیار یہ ہے کہ اس میں کوئی فکر و فلسفہ ہو، پیغام ہو، سماجی ناہمواریوں کی زبان ہو، تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار ہو، احساس جمال سے معمور ہو یا قومی امنگوں کا ترجمان ہو۔ اس آئینہ میں دیکھا جائے تو میرے نزدیک ضلع جھنگ کا دامن ایسے شعراء سے کبھی خالی نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ معروف ادبی مراکز سے دور ہونے یا نارسائی کے سبب چند ایک کے علاوہ بیشتر ارباب علم و فن خاطر خواہ پذیرائی حاصل نہیں کر سکے۔ ان کے شعر و ادب کا مطالعہ کیا جائے تو کئی جہتیں پوری تابناکی کے ساتھ دل و دماغ اور شعور و فکر کو متاثر کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں ظفر ترمذی، مجید امجد، شیر افضل جعفری، جعفر طاہر، طاہر سردھنوی، کبیر انور جعفری، رفعت سلطان، رام ریاض، بیدل پانی پتی اور معین تابش جیسی قد آور شخصیات گو بقید حیات نہیں مگر اپنے فکر و فن کی بدولت زندہ جاوید ہیں۔ کچھ اہل قلم جھنگ سے نقل مکانی کر گئے اور کچھ کو بے رحم وقت کی چادر نے ڈھانپ لیا۔ زمانے کی گرد میں پوشیدہ ان گہر ہائے نایاب کو منظر عام پر لانے کی کوئی منظم اور سنجیدہ کاوش نہیں کی گئی۔ ان کا بعض مضامین و مقالات میں صرف تبرکاً ذکر مل جاتا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ نوجوان نسل بالخصوص طلبا و طالبات ان کے کام تو کیا نام سے بھی واقف نہیں ہے۔ یہاں جھنگ کے عہد حاضر کے شعر و ادب میں سمیع اللہ قریشی، صفدر سلیم سیال، مظہر اختر، علی کوثر جعفری، فرخ زہرا گیلانی، مطاہر ترمذی، انیس انصاری، محسن مگھیانہ، انتظار باقی اور اشفاق انجم سمیت متعدد اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔ جن کے شعور کی گہرائی و گیرائی کو زیر مطالعہ لانے کی اشد ضرورت ہے۔

ضلع جھنگ کی تحصیل چنیوٹ کو یکم جولائی 2009ء سے ضلع کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ دریائے چناب کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے اس شہر

نے کئی لازوال داستانوں، ثقافت، روایات اور اقدار کو تابندگی عطا کی ہے۔ اس شہر کی وجہ تسمیہ میں شہزادی چندن کا نام لیا جاتا ہے۔ بلال زبیری نے 'تاریخ جھنگ' میں شہزادی کا نام 'چنی' لکھا ہے جو بغرض شکار اس علاقے تک آن پہنچی۔ اس کی جغرافیائی صورت حال اور زمینی حقائق سے متاثر ہو کر یہاں شہر بسانے کا حکم دیا جو چندن پوٹ، چنی اوٹ یا چین اوٹ ہوا اور بعد میں چنیوٹ کہلایا۔ یہ شہر لکڑی کے کام کی وجہ سے بھی بے حد مشہور ہے۔ مختلف اقوام اس شہر کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لیتی چلی آ رہی ہیں۔ چنیوٹ کی علمی و ادبی تاریخ قدیم ہے۔ اس میں ایسی شخصیات کا ذکر ملتا ہے جو کئی قوموں اور قبیلوں کے طرز زندگی اور انداز فکر پر اثر انداز ہوئیں۔ ایک روایت ہے کہ برہمن خاندان کے ایک فرد چانکیہ کوتلہ کا تعلق اس خطہ سے تھا جو سکندر اعظم کے حملے کے وقت ٹیکسلا میں بطور استاد تعینات تھا۔ اس کی کتاب "ارتھ شاستر" مدنی سیاست اور نظام حکومت پر پہلی کتاب تصور کی جاتی ہے۔ محمد بن قاسم برصغیر میں دیبل کے راستے سندھ میں داخل ہوا تو اپنی فتوحات کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے چنیوٹ آ کر اسلامی پرچم لہرایا۔ مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان یہیں کے رہنے والے تھے۔ خضر تیمی کے لواحقین ان کو اپنے خاندان کا فرد بتاتے ہیں۔ ٹوڈر مل اور نواب وزیر خان اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ضلع چنیوٹ کے علاقہ بھوآنہ کے قریب سلطان ٹیپو کے آباؤ اجداد رہتے تھے جو جتہ خاندان کے فرد بتائے جاتے ہیں ۔ یہاں دریائے چناب کی رنگین وادی میں جلیل القدر بزرگ حضرت شاہ برہانؒ قادری کا مزار مرجع خاص و عام ہے جس کی حیثیت ایک فیض رساں ادارے کی ہے۔ حضرت بوعلیؒ شاہ شرف قلندر سے منسوب دریا کے وسط میں شاہ شرف کے کوٹھے کے نام سے قیام گاہ موجود ہے۔ چنیوٹ کی تاریخ میں ایک دلدوز واقعہ پیش آیا۔ گلزار محمد اپنے رئیس والد شیخ عمر حیات کی اکلوتی اولاد تھا۔ شب زفاف غسل خانے میں اپنے قدموں پر چل کر گیا مگر کاندھے پر سوار ہو کر باہر نکلا۔ اس کی ناگہانی اور پُر اسرار موت کے بارے میں متعدد قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ ان کا یہ محل اب عمر حیات لائبریری کی صورت میں بطور یادگار موجود ہے۔ اس لائبریری سے میں نے استفادہ کیا۔ چناب کی ایک قدیم اور معروف عمارت تاج محل ہے جو مغلیہ طرز تعمیر کا ایک نادر اور یادگار نمونہ ہے۔ یہ عمارت مسلمان حکمرانوں کی عظمت پارینہ کی یاد دلاتی ہے۔

چنیوٹ کی ادبی و صحافتی تاریخ میں بیسویں صدی نہایت اہم ہے۔ حافظ برخوردار نے مرزا صاحبان کا رومانوی قصہ پنجابی زبان میں نظم کیا۔ حافظ محمد صدیق لالی ایک مذہبی شخصیت

تھے۔ بحر العشق ،نور الحقیقت اور رسالہ چہل حدیث ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ حافظ خدا بخش صغیر نے ادبی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ عزیز علی عزیز کو نومسلم ہونے کی وجہ سے ابتدائی طور پر متعدد سماجی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ نذیر مجیدی نے شمع علم وصحافت کو روشن کئے رکھا۔ ثاقب سلیمانی شعرو ادب کا ایک معروف نام ہے جو علم نجوم اور علم جفر سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ مولانا جعفر قاسمی کا شمار چنیوٹ کی معتبر شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ تحریر وتقریر میں باکمال تھے۔ چرخ چنیوٹی فروغ وتخلیق ادب میں ہمیشہ فعال وسرگرم رہے۔ غلام محمد رنگین پنجابی اور اردو زبان کے شاعر تھے۔ ''غنچہ رنگین'' اور'' فسانہ ءملت'' ان کے شعری مجموعے شائع ہوئے۔ حیران جعفری کا شعری مجموعہ'' سوز دروں'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ قصبہ بھوآنہ کے رہائشی احمد نواز کا ناول 'چمن زار وفا' مقبول ہوا۔ ان کے علاوہ بھی اس سرزمین نے اپنے دامن میں متعدد نامور شخصیات اور داستانوں کو چھپا رکھا ہے۔ اس ادبی ماحول میں خضر تمیمی بھی گیسوئے ادب سنوارتے رہے۔

صحافت کی دنیا میں بھی چنیوٹ کا علم بلند رہا۔ غلام حسین جوئیہ نے 1898ء میں ہفت روزہ'' المنیر'' جاری کیا جو کچھ عرصے بعد بند ہو گیا۔ 1905ء میں حافظ خدا بخش صغیر نے اس میں نئی روح پھونکی۔ 1921ء میں ماہنامہ'' دیہاتی'' کا اجراء ہوا۔ جو 1931ء میں بند ہو گیا۔ 1911ء میں جھنگ سے لالہ بانکے دیال اور لالہ دینا ناتھ نے'' جھنگ سیال' جاری کیا۔ غلام محمد رنگین نے 1965ء میں پندرہ روزہ'' رحیل'' جاری کیا جو زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ عزیز علی عزیز نے جنوری 1937ء میں چنیوٹ سے ماہنامہ'' یادخدا'' جاری کیا جو ستمبر 1936ء سے ہفتہ وار کر دیا گیا۔ بالآخر یہ بھی 1959ء میں اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔ 5 دسمبر 1937ء کو چنیوٹ ہی سے ہفت روزہ'' جہاں نما'' شائع ہوا۔ خضر تمیمی اس کے مشیر ونگران تھے جو بعد میں سرپرست بھی ہو گئے۔ 1933ء میں جھنگ سے ہفت روزہ'' عروج'' جاری ہوا جو تادم تحریر بطور روزنامہ شائع ہو رہا ہے۔ 1948ء میں جھنگ سے کرنل عابد حسین اور شیخ محمد سعید کی سرپرستی میں ہفت روزہ '' وقار'' جاری ہوا جو 1952ء تک شائع ہوتا رہا۔ 1949ء میں پندرہ روزہ' قلندر' اور' سکندر' کے نام سے اخبارات شائع ہوئے۔ یہ بھی تقریباً تین سال بعد اختتام پذیر ہوئے۔ اس ادبی وصحافتی پس منظر کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ چنیوٹ اور جھنگ کے اہل علم وقلم نے ادبی فضاؤں کو اپنی نگارشات سے مسلسل معطر کئے رکھا۔ مولانا ظفر علی خان اور اختر شیرانی جیسی نابغہء روزگار شخصیات کا اس شہر چنیوٹ کی ادبی محافل سے رشتہ مستحکم رہا۔ عصر حاضر بھی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی سے

بھرپور مناظر پیش کر رہا ہے۔

ان ارباب فکر و فن میں ایک اہم شخصیت خضر تمیمی ہیں جو تقریباً 36 سال قبل ایک بھرپور زندگی بسر کرنے کے بعد عدم آباد کو روانہ ہو گئے ۔ وہ اپنے عہد حیات میں پیروڈی اور مناظرہ نگاری کی وجہ سے ایک واضح شناخت رکھتے تھے مگر افسوس یہ ہے کہ عہد جدید اُن کی ادبی کامرانیوں سے کلی طور پر بے خبر ہے۔ خضر تمیمی نے سماج کے رویوں کو برسوں پہلے بھانپ لیا تھا اس لیے انہوں نے کہا تھا:

جو پرانے ہیں انہیں یاد ہے، شاعر کا پتا　　جو نئے ہیں انہیں معلوم ہو کیا خضر کا فن

خضر تمیمی پر یہ کتاب تحریر کرنے کی وجہ میری ذاتی پسند ہے۔ خضر تمیمی نے بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں آنکھ کھولی تو اس وقت مقامی اور عالمی سطح پر سماج کئی کروٹیں بدل رہا تھا۔ معاشرتی اونچ نیچ کا فرق اپنی شدت کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ نسلی، لسانی اور تہذیبی امتیازات سماج کے مختلف گروہوں میں تقویت پکڑ رہے تھے۔ عالمی سطح پر عظیم جنگوں کے خطرات سروں پر منڈلا رہے تھے بالآخر حالات اس نہج پر پہنچے کہ جنگیں تباہی و بربادی کا پیغام لے کر آئیں۔ لاکھوں لوگ لقمۂ اجل بنے، معذور اور اپاہج ہوئے، زمین بھی آگ کے بگولوں سے جل اُٹھی۔ قیامت صغریٰ کے مناظر اور دلدوز سانحات نے دنیا کو کئی لحاظ سے تقسیم کر دیا۔ سیاسی تحریکوں نے مخصوص مفادات کے پیش نظر گروہ بندیوں کو مضبوط کیا جبکہ دوسری طرف ادبی تحریکیں اپنے اثرات مرتب کرنے کے لیے کوشاں تھیں ۔ یہ ادبی اور سیاسی تحریکیں کبھی باہم آمیز ہو کر اور کبھی جدا ہو کر معاشرتی، سماجی اور ثقافتی اقدار کی تشکیل و تعمیر میں شریک ہونے لگیں۔

خضر تمیمی شعوری عمر کو پہنچنے کے بعد ان تبدیلیوں کو شدت سے محسوس کرنے لگے۔ یہ تضادات ان کے لیے سوہانِ روح بننے لگے۔ سماجی تفاوت اور برتری کے اثرات قلب ماہیت کا واضح نقشہ پیش کرنے لگے۔ خضر تمیمی کو یہ اتار چڑھاؤ گوارا نہ ہوا۔ انہوں نے اپنے احساسات کا اظہار شعر و ادب کی تخلیق کی صورت میں کیا۔ ان کی نظموں کے موضوعات ضرورتِ وقت کے تابع ہیں ۔ وہ ہمہ وقت شاعر نہیں تھے اس کے باوجود وہ سنجیدہ اور مزاحیہ نظموں میں خیالات کی تاثیر اور معنویت کو ابھارتے رہے۔ شعر گوئی میں ان کے کوئی استاد نہیں تھے۔ انہیں خداداد صلاحیت اور تجربے و مشاہدے نے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ وہ ایک کثیر المطالعہ شخص بھی تھے جو اردو، پنجابی، انگریزی اور فارسی زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ وہ شخصی خوبیوں میں قناعت پسند، درویش منش،

خوش فکر، ہمدرد، دوست دار، نیک طینت اور مجلسی زندگی کے دلدادہ تھے۔ دوسری طرف وہ بیک وقت شاعر، ایڈووکیٹ، مترجم، صحافی اور طبلہ نواز تھے۔ اپنی شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی کے سبب محفل پر چھا جانے کا فن اور گر خوب جانتے تھے۔ انہوں نے اپنے کلام کو کتاب کی صورت دینے میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ اسی لیے آج تک ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ تاہم ان کا کلام اپنے وقت کے ادبی رسائل، اخبارات اور کتب کے بیشتر صفحات پر موجود ہے۔ اتنے اہم مزاحیہ شاعر کے بارے میں اہل نظر نے اپنے مختصراً تاثرات تو پیش کئے ہیں مگر ان پر کوئی جامع کتاب نہیں لکھی گئی جبکہ اردو مزاح نگاری کی روایت کے تناظر میں اہم مزاح نگاروں کے ساتھ خضر تمیمی کی مزاح نگاری کا تقابلی مطالعہ نہایت عمدہ ثابت ہوتا۔ وہ زندگی کی تاریک راہوں میں افکار و خیالات کی شمعیں فروزاں کرتے رہے۔ انہوں نے قیام پاکستان کے وقت نہ صرف پرآشوب دور دیکھا تھا بلکہ وہ اس تجربے کا حصہ بھی رہے۔ انہوں نے تحریک پاکستان کی جدوجہد میں عملی طور پر حصہ لیا۔ ان اذیت ناک مناظر سے ان کی بے تابیوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ تہذیب مغرب کی بے لگامی، استحصالی قوتوں کے غلبے، پسے ہوئے طبقے کے مسائل اور کھوکھلے ہندو مسلم تعلقات نے ان کی قوم پرستی اور اپنی تہذیب و ثقافت سے محبت کی حساسیت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اسی لئے ان کی منظومات میں فطری بہاؤ، طبیعت کی جولانی اور خیالات کی روانی کا احساس اجاگر ہوتا رہا۔ خضر تمیمی نے اپنی شاعری میں طنز و مزاح کا ایک متوازن امتزاج پیش کیا ہے۔ عصری ادبی رجحانات اور نئے تنقیدی شعور کے تحت ان کے ادبی مقام و مرتبہ کا تعین بے حد ضروری ہے۔ ان کی شاعری اپنے عہد کے اہم واقعات، حالات اور سماجی رویوں کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ پروفیسر محمد حیات خان مرحوم جھنگ کے اہل قلم پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خضر تمیمی کے بیٹے نوشاد بخت تمیمی کو خط لکھا جس کے جواب مرقومہ 8 اگست 1979ء میں انہوں نے بتایا کہ والد مرحوم کی زندگی میں کوئی صاحب ان سے تمام مسودہ برائے اشاعت لے گئے۔ اس کے فوراً بعد والد صاحب انتقال فرما گئے اور ان کا آج تک کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ حالانکہ امروز اخبار کے منیر احمد صاحب 'منو بھائی' نے اپنے کالم "گریبان" میں بھی بہت لکھا اور اُن صاحب کو خدا کا واسطہ بھی دیا لیکن آج تک اس شریف آدمی کو توفیق نہیں ہوئی کہ ہم پر یہ احسان کردے۔ خضر تمیمی کا اپنا کوئی شعری مجموعہ تو سامنے نہ آسکا البتہ انہوں نے 1965ء میں امریکی سپریم کورٹ کے جج ولیم۔ او۔ ڈگلس کی کتاب "A LIVING BILL OF RIGHTS" کا نہایت شستہ اور

سادہ اردو زبان میں ''بنیادی انسانی حقوق کا مسئلہ'' کے عنوان سے ترجمہ کیا اور یہ کتاب شائع ہوئی جسے وکلا کے طبقہ نے پذیرائی بخشی۔ خضر تمیمی کی کئی نظمیں ادبی رسائل و کتب میں شائع ہوئیں۔ بیشتر غیر مطبوعہ قلمی تحریریں اُن کے گھر اور احباب سے دستیاب ہوئیں۔ ڈاکٹر محمد امجد ثاقب چنیوٹ میں اسسٹنٹ کمشنر تعینات ہوئے تو انہوں نے چنیوٹ کے بارے میں ''شہرلب دریا'' کے عنوان سے 1993ء میں تاریخی وادبی حالات پر کتاب تحریر کی۔ اس کتاب میں خضر تمیمی کے حال احوال کے لیے چند صفحات مختص کیے مگر انہوں نے کچھ تساہل سے کام لیتے ہوئے مزاحیہ شعرا اکبر لاہوری اور عاشق محمد غوری کا مطبوعہ کلام خضر تمیمی سے منسوب کر دیا۔ وہ ''شہرلب دریا'' کے صفحہ نمبر 170 پر لکھتے ہیں کہ اختر شیرانی اکثر چنیوٹ میں خضر تمیمی کے پاس آتے تھے۔ ایک بار قیام کے دوران انہوں نے اپنی مشہور نظم ''او! دیس سے آنے والے بتا'' کی پیروڈی تمیمی صاحب سے بڑے اہتمام سے سنی: پیروڈی کے جو بند درج کئے ہیں وہ یہ ہیں:

او دیس سے آنے والے بتا
برسات میں دِلدل بنتے ہیں سب کوچہ و بازار اب کہ نہیں
کیچڑ میں لت پت ہوتے ہیں پیراہن و شلوار اب کہ نہیں
دو چار قدم جو چلتا ہے گرتا ہے وہ دس بار اب کہ نہیں
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وطن کی گلیوں میں راتوں کو کتے بھونکتے ہیں
اور ان کی عف عف بھوں بھوں سے بیچارے بچے چونکتے ہیں
کیا اب بھی سلمٰی کے دادا دن رات دمے سے ہونکتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی سحر دم کچھ جوتے مسجد سے چرائے جاتے ہیں
بیچارے غازی بے جوتے چپ چاپ گھروں کو آتے ہیں
رستے میں کوئی مل جائے انہیں تو جھینپتے ہیں کتراتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وطن میں ایسے ہی شام اور سویرا ہوتا ہے
کیا دن کو روشنی ہوتی ہے راتوں کو اندھیرا ہوتا ہے
اور مچھلیوں کا دریا میں یا پیڑوں پہ بسیرا ہوتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا

یہ نظم الحاقی ہے کیونکہ اس پیروڈی کو عاشق محمد غوری نے لکھا ہے اور یہ 'نقوش' طنز و مزاح نمبر 1959ء صفحہ 836 تا 837 شائع ہوئی ہے۔ اس کے تیسرے بند میں غازی کی بجائے نمازی ہونا چاہیے تھا۔ مجھے یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے تاہم انہوں نے اس پیروڈی کو خضر تمیمی سے منسوب کیا ہے جو کہ سراسر غلط ہے۔ اس کے پہلے دو بند 'نوادرات سخن' مرتبہ طاہر شادانی و ضیا محمد ضیا، صفحہ نمبر 182 پر شائع ہوئے ہیں۔ اسی طرح اختر شیرانی کی ایک اور مشہور غزل 'دیکھے کوئی بہار گلستانِ آرزو' کی پیروڈی ''شہر لب دریا'' کے صفحہ 171 پر موجود ہے۔ اس کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

مژدہ ہو آج تم کو مریضانِ آرزو — لاحق مجھے بھی ہو گیا یرقانِ آرزو
مائل ہوا ہے اک بت ترسا پہ دل مرا — گرجے میں جا بسا ہے مسلمانِ آرزو
سب کاروبار چھوڑ کے سڑکیں ہوں ناپتا — دینا تھا کچھ نہ کچھ مجھے تاوانِ آرزو
مُلا کے وعظ کا ہوا اثر مجھ پہ کس طرح — سر پر مرے سوار ہے شیطانِ آرزو
میرا رقیب بوجھ سے مرنے کے ہے قریب — پُر حسرتوں سے اس کا ہے دامانِ آرزو
گردن مروڑ ان کی یا دانے کھلا انھیں — چلا رہے ہیں دیر سے مرغانِ آرزو
میرے جنون نے اسے لینے دیا نہ چین — وہ چین حسن ہے تو میں جاپانِ آرزو
مجروح عشق ہو کے رہے گا وہ سنگدل — عاشق نے بھی ہے سونت لی کرپانِ آرزو

اختر شیرانی کی اس نظم کی یہ پیروڈی بھی عاشق محمد غوری نے لکھی ہے جو 'نقوش' طنز و مزاح نمبر 1959ء صفحہ 837 پر شائع ہوئی ہے لیکن ''شہر لب دریا'' کے ان صفحات پر اسے بھی خضر تمیمی سے منسوب کیا ہے جو کہ تحقیق و شواہد کی بنیاد پر درست نہیں ہے حالانکہ اسی غزل کے مقطع میں شاعر کا نام 'عاشق' بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے اسی کتاب کے صفحہ نمبر

178 پر درج ذیل اشعار اور ان کی توضیح کی ہے، ملاحظہ ہوں۔

آ بتادوں تجھ کو اے ہمراز اک رمز حیات — جس کو سن کر رہبران قوم بھی کہہ دیں گے "ہاں"
لڑنے بھڑنے کے لیے پیدا کیا انسان کو — "ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں"

یہ اشعار "نوادرات سخن" کے صفحہ 168 پر اکبر لاہوری کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہی اشعار "نقوش" طنز و مزاح نمبر، صفحہ 38 پر بھی اکبر لاہوری کے نام سے موجود ہیں۔ اس کے بعد اسی صفحہ پر مصنف نے توصیفی جملوں کے بعد ایک مکالمہ لکھا ہے۔

فراش:

حضور 'ہال' کا قالین ہے بہت گندہ — جو حکم ہو کسی ماہر سے صاف کروالیں

قانون ساز:

ٹھہر کہ مجلس قانون بیٹھنے کو ہے — اسی سے کیوں نہ یہ قانون پاس کروا دیں
ہمارے ہال کے قالین کو جو گندہ کہے — وہ بد زبان سزا پائے اور ڈنڈ بھرے

فاضل مصنف نے ان اشعار کو بھی خضر تمیمی سے منسوب کیا ہے جبکہ یہ اشعار مع توضیحات 'نقوش' کے طنز و مزاح نمبر 1959ء کے صفحہ 838 پر لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے شاعر کا نام بھی اکبر لاہوری ہے۔ یہ بات یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ "شہر لب دریا" کے صفحہ 179 پر درج مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

حافظ کے زمانے میں کچھ لوگ حماقت سے — پالان گدھے والا کس دیتے تھے گھوڑے پر
اور جس کی اذیت سے سنتے ہیں کہ وہ گھوڑا — رہتا تھا مصیبت میں چلتا تھا تو رک رک کر
اکبر کے زمانے کا دستور نرالا ہے — دیکھا کہ گدھے صاحب سوار ہیں گھوڑے پر
اور لطف یہ ہے کوئی فریاد نہیں سنتا — چابک پہ مگر چابک ہنٹر پہ مگر ہنٹر
تم دیر سے مانو گے ہم نے تو یہ مانا ہے — وہ اور زمانہ تھا یہ اور زمانہ ہے

اسی صفحہ پر توضیحی نوٹ کے ساتھ درج ذیل اشعار بھی شامل کئے ہیں:

ایک روٹی کے نہ ملنے سے ہوا مایوس وہ — اور ڈھونڈی اپنے ہاتھوں ہی سے مرگ ناگہاں
کل عدالت نے سنایا اس کو اپنا فیصلہ — جمع کروا دے خزانے میں وہ نو سو روٹیاں
ساتھ ہی اکبر سزا یہ دی ہے مجھ مجنون کو — جج کو فاضل اور اسلامی کہوں قانون کو

مصنف نے یہ اشعار اور توضیح بھی حرفاً حرفاً درج کی ہے جبکہ یہ اشعار اکبر لاہوری کے

ہیں جو ''نقوش'' کے صفحہ 839 پر موجود ہیں انہوں نے ایک شعر ''شہر لب دریا'' کے صفحہ 180 پر درج کیا ہے، وہ یہ ہے:

اک بھینسے اور انسان کے ٹکراؤ میں یہ نکتہ پنہاں ہے
جو رہ جائے وہ بھینسا ہے جو مر جائے وہ انسان ہے

یہ شعر بھی اکبر لاہوری کا ہے جس کے قافیہ میں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے جو ''نقوش'' طنز و مزاح نمبر 1959ء صفحہ 840 پر موجود ہے۔ یہ تمام اشعار اور ان کے ساتھ درج توضیحات اسی ''نقوش'' طنز و مزاح نمبر سے نقل کی گئی ہیں۔ اکبر لاہوری کی ان دونوں پیروڈیوں میں ان کا تخلص پہلی اور دوسری نظم کے پانچویں مصرع میں لکھا ہوا ہے۔ یہ سارا الحاقی کلام ہے جو خضر تمیمی سے منسوب کیا گیا ہے۔

'تاریخ جھنگ' کے مصنف بلال زبیری نے بھی کئی غیر مستند بیانات کو اپنی کتاب میں قلم بند کیا ہے۔ وہ ''تاریخ جھنگ'' کے صفحہ نمبر 140 پر لکھتے ہیں کہ وہ (خضر تمیمی) 1896ء میں پیدا ہوئے۔ 1922ء میں مزاحیہ شاعری شروع کی ۔۔۔۔1936ء میں چنیوٹ سے ماہنامہ 'چناب' جاری کیا۔۔۔۔ان کا شاعری کا مجموعہ 1956ء میں شائع ہوا۔۔۔۔1973ء میں وفات پائی۔ ان کے اس بیان میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ ان بیانات کی مستند حوالوں اور منطقی دلائل کے ساتھ آئندہ صفحات میں تردید کر دی گئی ہے نیز داخلی اور خارجی شہادتوں کے ساتھ تصحیح کی گئی ہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا جس کا ذکر ادبی و تحقیقی دیانت داری سے بھی ہے۔ میں نے اس امر کی نشاندہی کر کے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اس کتاب میں قارئین اور محققین کی دلچسپی و تحقیق کے نئے در وا کرنے کے لیے خضر تمیمی کے نام و نسب سے لے کر وفات تک مختصراً مگر اہم واقعات درج کئے ہیں۔ اس کے بعد ان کے دستیاب کلام کو شامل کیا ہے۔ خضر تمیمی کے عزیز، دوست اور ان کے منشی چرخ چنیوٹی جو خود بھی باکمال شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے ایک خط بنام نوشاد بخت تمیمی محررہ یکم اکتوبر 1977ء میں لکھا کہ چونکہ غزل گوئی کو وہ (خضر تمیمی) مخرب الاخلاق سمجھتے تھے اس لئے غزلیات سے متعلق ان کے دیوان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خضر تمیمی بنیادی طور پر صرف نظم ہی کے شاعر تھے۔ ان کی منظومات کی روشنی میں موضوعاتی، فکری و فنی جائزہ پیش کیا ہے۔ تحقیقی کام کے بعد اگلا مرحلہ تدوین کلام تھا۔ اس ضمن میں جس پہلو کو پیش نظر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ جو کلام ایک

بار شائع ہوا ہے یا غیر مطبوعہ صورت میں حاصل ہوا ہے۔ اس کو سنوارنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی لیکن جو کلام ایک سے زائد بار شائع ہوا ہے ان میں جہاں سے زیادہ اشعار دستیاب ہوئے ہیں انہیں متن کا حصہ بنایا ہے اور دیگر کو حواشی میں متنی اختلافات کی وضاحت کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ کلام متن میں موجود ہے۔ تدوین کے مروجہ اصولوں کے مطابق اشعار کی ترتیب وتصحیح، الفاظ کا اختلاف، املائی فرق، تضمین اور دیگر وضاحت طلب امور حواشی میں بیان کئے ہیں۔ اس طرح بے وزن مصرعوں یا رکن کی کمی کو پورا کرنے اور صحت متن کو برقرار رکھنے میں قیاسی تصحیح سے کام لیا ہے۔ چند اشعار ایسے بھی ملے ہیں جو کہ کرم خوردہ کاغذ پر تحریر تھے۔ یہاں ایک دو الفاظ کی قیاسی تصحیح تو جائز قرار دی جاسکتی ہے مگر نصف یا پورا مصرع قیاسی صورت میں لکھنا روا نہیں ہوتا۔ اسی لیے ایسی نظموں کے اشعار کو بعینہٖ رہنے دیا ہے۔ ممکن ہے کہیں سے اصل اور مکمل صورت میں دستیاب ہو جائیں اور یوں ان کی روح مجروح ہونے سے محفوظ رہے۔ ترتیب کلام کے ضمن میں دو پہلو اہم خیال کئے جاتے ہیں ایک تو یہ ہے کہ انہیں زمانی ترتیب دی جائے اور دوسرا یہ کہ کلام کو موضوعاتی اعتبار سے شامل کیا جائے۔ مطبوعہ کلام کو ترتیب دینا چنداں دشوار نہیں ہوتا۔ ایسا کلام بھی ملا ہے جن پر تواریخ درج نہیں ہیں یا ان کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ ایک طریقہ ذہن میں یہ آیا کہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد کو الگ الگ کر دیا جائے۔ اس میں یہ قباحت نظر آئی کہ غیر مطبوعہ مواد کی ترتیب میں وہی مشکل آڑے آئے گی۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تمام کلام کو موضوعاتی اعتبار سے ترتیب دیا جائے۔ اگر کسی کلام کے ساتھ تاریخ درج ہے تو اس کو حواشی میں لکھ دیا جائے۔ تحقیق وتدوین کے مراحل طے کرنے کے بعد خضر تمیمی کے کلام کا موضوعاتی، فکری اور فنی تجزیہ کیا ہے۔ ان کے معاصرین اور عصری تقاضوں کے علاوہ مزاحیہ ادب کے رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے مقام ومرتبہ کا تعین کیا ہے۔ خضر تمیمی نے مختلف موضوعات پر اردو، پنجابی اور انگریزی زبان میں متعدد مضامین لکھے جن میں کچھ معروف ادبی رسائل وکتب میں شائع ہوئے۔ ان میں سنجیدہ اور شگفتہ دونوں طرز کی تحریریں شامل ہیں۔ انہوں نے کئی موقعوں کا اہل خانہ اور دوست احباب کے نام خطوط لکھے تھے۔ یہ تمام دستیاب نثری تحریریں بھی اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں تا کہ قارئین، محققین اور نقادان کی ہمہ جہت شخصیت سے مکمل طور پر واقفیت حاصل کر سکیں۔ ان تحریروں کا پس منظر اور وضاحت کو حواشی وحوالہ جات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ نثری مضامین میں خضر تمیمی کے قلم کی روانی اور اسلوب کی شیرینی قارئین، محققین

اور نقادوں کی توجہ ضرور حاصل کرے گی۔ میری رائے ہے کہ کوئی بھی مضمون کسی طرح سے کمزور نہیں ہے۔ شاعری کی طرح نثر میں بھی ان کی گرفت مضبوط ہے۔ حصہ نثر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ خضر تیمی کے اسلوب نثر اور موضوعات نثر کا جامعیت کے ساتھ جائزہ لیا جائے تاکہ ان کے نثری محاسن کا یہ پہلو بھی تشنہ نہ رہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ آنے والے محققین اس پہلو کو فراموش نہیں کریں گے۔ یہ حصہ بھی خضر تیمی کے فکر وفن کے لیے باعث تنویر وتاثیر ہوگا۔

اہل علم جانتے ہیں کہ تحقیق وتدوین ایک دشوار گزار راستہ اور صبر آزما عمل ہے۔ اس تلاش وجستجو اور چھان پھٹک کے دوران کئی طرح کے حوصلہ شکن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ وسائل کی کمی، ماخذات ومصادر تک عدم رسائی، تدریسی مصروفیات، غیر تدریسی ذمہ داریاں، گھریلو معاملات اور دیگر بہت سی مشکلات کے باعث تحقیقی وتدوینی کام متاثر ہوتا رہا ہے۔ میں اس کتاب کی پیش کش پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے صحت، قوت، جذبہ اور حوصلہ عطا کیا۔ خضر تیمی کی نجی زندگی اور گھر میں موجود منظومات کی فراہمی میں محمد وریام تیمی اور حافظ توقیر احمد تیمی کے علاوہ بطور خاص منظور نسیم تیمی کا بہترین تعاون حاصل رہا۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی اور حکمت ادیب نے اپنی لائبریریوں میں سے مطبوعہ مواد اور رسائل فراہم کئے۔ جناب احمد ندیم قاسمی، جناب غلام جیلانی اصغر، اور پروفیسر تقی الدین انجم نے خطوط کے ذریعے کچھ واقعاتی مزاح سے مطلع کیا۔ استاد گرامی پروفیسر ابوبکر صدیقی کا ممنون احسان ہوں جنھوں نے ناسازیٔ طبیعت اور پیرانہ سالی کے باوجود مسودے کا بغور مطالعہ کیا۔ اُن سے مفید مشورے ملے اور اپنی رائے تحریری طور پر دی۔ چنیوٹ کی متعدد شخصیات سے ملاقات اور عمر حیات لائبریری سے مواد حاصل کرنے کے لیے پروفیسر علی عمران شاہ ہمیشہ میرے ہم رکاب رہے اور خوش دلی سے میزبانی کرتے رہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم ضیا کا شکر گزار ہوں جنھوں نے تحقیقی مواد کی پرکھ اور تدوین متن میں کئی مشکل مراحل کو آسان کیا۔ میں چیئرمین دریچہ ادب پاکستان، جھنگ کی حیثیت سے اس ادبی تنظیم کی سرپرست اعلیٰ سیدہ فرخ زہرا گیلانی، سرپرست سید مطاہر ترمذی، بانی رکن قمر ہمدانی، ڈاکٹر یاسین جاوید (مرحوم)، سید وزیر علی زیدی اور انتظار باقی کا بطور خاص شکریہ ادا کرتا ہوں جن کا بھرپور اخلاقی تعاون حاصل رہا۔ کتاب کی کمپوزنگ کے لیے تنزیل شہزاد اور محمد ارشد سنگرش نے بہت شوق سے کام کیا۔ شیخ محمد معصوم نے سرورق کو نہایت مہارت سے دلکش بنایا۔ طباعت کے لیے حاجی محمد فیاض شہزاد سلطان باہو پرنٹنگ پریس جھنگ صدر نے تمام تر فنی صلاحیتوں اور جمالیاتی خوبیوں

کے امتزاج سے نکھار پیدا کیا۔ مجھے اپنی بیگم، بیٹیوں فرزانہ صفدر اور رضوانہ ثمرین کے علاوہ بیٹوں وسیم عباس شاہ، توقیر عباس شاہ اور نعیم عباس شاہ نے گھر میں پر سکون ماحول فراہم کیا اور پروف ریڈنگ میں بطور خاص معاونت کی۔ مجھے قوی امید ہے کہ میری یہ دوسری تحقیقی کتاب نہ صرف خضر تمیمی کے فکر و فن اور اہم شخصی پہلوؤں سے متعارف کرانے کا ذریعہ ہوگی بلکہ مورخین اور محققین کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوگی۔ یہ کتاب ماضی کے پردوں میں نہاں ارباب قلم کو منصۂ شہود پر لانے کی ایک حقیری کوشش ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ خضر تمیمی کا مزید کلام کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے مگر ان تک میری رسائی بوجوہ نہیں ہو سکی۔ اگر مزید کلام دستیاب ہوا تو آئندہ اشاعت میں احباب کے شکریہ کے ساتھ شامل کتاب کروں گا۔ میں قارئین سے ایک توقع رکھتا ہوں کہ احوال و کلام کی صحت کے بارے میں اپنی آراء سے ضرور مطلع کریں گے۔ آپ کی رائے اور مفید مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

صفدر علی شاہ
0333-6732552

مئی 2010ء

نقشِ رفتگاں

گزشتہ صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی بڑی ہنگامہ خیز تھی ۔تحریک خلافت کا پیدا کردہ جوش وخروش ابھی باقی تھا۔عوام میں آزادی کا شعور بیدار ہورہا تھا۔تعلیم عام ہونے کے باعث روشن خیالی زور پکڑ رہی تھی۔اس دور کی ہنگامہ آرائی ہمہ گیر تھی۔زندگی کا کوئی پہلو بھی اس سے اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکا۔معاشی،معاشرتی،سیاسی،علمی غرض ہر لحاظ سے یہ زمانہ جوش وخروش کا مظہر تھا۔

اس دور میں ادبی منظر نامہ بھی بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔شاعری میں قومی اور اصلاحی خیالات غالب عنصر کی حیثیت اختیار کررہے تھے۔اسی دور میں علامہ اقبال کی شاعری عروج پر تھی انہوں نے دوقومی نظریہ بھی اسی دور میں پیش کیا۔مولانا ظفر علی خان کا نعرۂ مستانہ فضاؤں میں گونج رہا تھا۔جوش ملیح آبادی،مجاز لکھنوی،حفیظ جالندھری،احسان دانش،غرض بڑے بڑے شعرا اس دور میں موجود تھے اور اپنے خیالات سے ماحول کو گرمارہے تھے۔جہاں قومی،سیاسی اور آزادی کے نغمے گونج رہے تھے وہیں اختر شیرانی کے مدھر،شیریں اور رومان پرور نغمے بھی موجود تھے۔ان ہنگامہ خیز حالات میں شعرائے کرام کے فکری دھارے بہت زوردار اور تیز رفتار تھے۔افکار کی یہ تندی وتیزی غزل میں نہ سماسکتی تھی۔لہذا اس دور کے کم وبیش تمام شعرا نے نظم کا راستہ اختیار کیا۔اس دور کو نظم جدید کے احیا کا دور قرار دیا جاسکتا ہے۔لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ غزل مرگئی تھی۔رئیس المتغزلین حضرت حسرت موہانی جیسے استاد غزل گو بھی اس دور میں موجود تھے۔

خضر تمیمی کی شاعری کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔یہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا۔طبیعت زوروں پر تھی۔انہوں نے بھی نظم گوئی کا راستہ اختیار کیا اور طول طویل نظمیں لکھیں۔نظم سے ان کا عشق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کوئی غزل ان کے ہاں نظر نہیں آتی۔انہوں نے نظم کی تمام صورتیں استعمال کیں۔حمد ونعت،منقبت،سیاسی نظمیں،تہنیتی اور تعزیتی نظمیں،تقریبات سے متعلق نظمیں، غرض نظم کی کم وبیش تمام صورتیں ان کے ہاں موجود ہیں۔مختلف تقاریب کے سلسلہ میں انہوں نے بڑی زوردار نظمیں لکھی ہیں اور زود گوئی کا مظاہرہ کیا ہے۔تقاریب کے لئے نظمیں لکھنا تلوک چند

محروم کا خاص میدان تھا۔محروم صاحب بھی اس دور میں موجود تھے۔شاید خضر تمیمی صاحب نے ان کا اثر قبول کیا ہو۔ ویسے بھی شعرائے کرام میں تقاریب کی مناسبت سے نظمیں لکھنے کا رواج زمانہء قدیم سے چلا آ رہا ہے اور اب بھی ہے۔نظم گوئی کے میدان میں خضر تمیمی صاحب کا ایک امتیاز ان کی مزاح گوئی ہے انہوں نے مزاح پیدا کرنے کے لئے مضحک صورت حال کے علاوہ تحریف سے بھی کام لیا ہے ان کی بعض تحریفات بڑی برجستہ اور قابل داد ہیں۔انہوں نے دو اشخاص یا دو اشیاء کے درمیان مقابلے اور مناظرے کی صورت پیدا کر کے طنز و مزاح کی گنجائش نکالی ہے۔ان مناظروں میں طنز کی صورت غالب ہے۔میم اور بیگم کا مناظرہ اور طبلے اور سارنگی کا مناظرہ خاصے کی چیز ہیں۔شاید اس لئے بھی کہ خضر تمیمی صاحب طبلہ نوازی کے رموز سے بخوبی آگاہ تھے۔مناظرے اور مقابلے کا انداز دو اشیاء کے درمیان نظم جدید کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔حالی کا مناظرۂ رحم و انصاف وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔تقریباتی منظومات میں خضر تمیمی صاحب سہرا گوئی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں بلکہ کلاسیکی انداز میں بڑے زوردار سہرے لکھتے ہیں۔ تحریفات کے سلسلے میں خضر تمیمی صاحب نے اختر شیرانی کی بعض مشہور نظموں کی تحریف کی ہے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کی نظم شکوہ بھی ان کی زد میں آئی ہے۔

مختصر یہ کہ خضر تمیمی صاحب نے نظم کی تمام صورتیں استعمال کی ہیں اور کامیابی سے آگے بڑھے ہیں۔خضر صاحب چنیوٹ جیسے دور افتادہ قصبے میں پلے بڑھے اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں سے حاصل کی۔شاعری کا آغاز بھی وہیں سے کیا۔ان دنوں لاہور علم و ادب کا مرکز تھا۔تمام بڑے بڑے شاعر اور ادیب لاہور ہی میں تھے۔لاہور کتب و رسائل کی اشاعت کا مرکز تھا۔اس مرکز سے بہت دور چنیوٹ ایک قصبہ تھا۔جہاں خضر تمیمی صاحب نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔گھر کا ماحول بھی غیر ادبی تھا۔وسائل بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ان تمام نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے خضر تمیمی صاحب آگے بڑھتے رہے۔انھوں نے ایم اے۔ایل ایل بی کیا۔ چنیوٹ میں وکالت کی اور پھر لاہور منتقل ہو گئے۔وہاں انھوں نے وکالت بھی کی اور لاء کالج میں وکیلوں کو پڑھایا بھی۔وکالت کے ساتھ ساتھ شاعری کا سلسلہ بھی جاری رہا۔اس زمانے میں لاہور میں شاعری کرنا اور اپنے آپ کو بطور شاعر تسلیم کروانا بہت مشکل کام تھا۔علامہ اقبال اور ظفر علی خان جیسے شعراء وہاں موجود تھے۔خضر تمیمی صاحب نے اس دور میں بھی نہ صرف اپنی شاعری کو زندہ رکھا بلکہ اس دور کے اساتذہ سے بھی داد حاصل کی۔

چھوٹے شہروں اور قصبات میں بڑے اچھے اچھے شعرا پیدا ہوتے ہیں لیکن نشر واشاعت کے مراکز سے دور ہونے کے باعث پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔آہستہ آہستہ ان کی تخلیقات بھی ضائع ہو جاتی ہیں اور وہ خود بھی فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔اگر خضر تمیمی صاحب کو صفدر علی شاہ جیسا قدر دان میّسر نہ آتا تو ان کا بھی یہی حال ہوتا۔شاہ صاحب نے بڑی محنت سے ریزہ ریزہ جمع کیا۔ پرانے رسائل واخبارات کھنگالے،خضر صاحب کے دوستوں کو ڈھونڈا اور ان کی یادداشت سے فائدہ اٹھایا،ان کے اعزا واقربا کو کرید کرید کر بہت کچھ حاصل کیا اور کئی سالوں کی محنت کے بعد ان سب کو ایک کتاب کی صورت میں یکجا کیا۔اب جو یہ کتاب ''۔خوش فکر شاعر۔خضر تمیمی'' وجود میں آئی ہے تو یہ خضر تمیمی صاحب کے حالات وافکار کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔اس میں ان کے مصدقہ حالات،ان کی تخلیق کردہ منظومات،منظومات پر تنقید وتبصرہ،متن کی اصلاح،متون میں اختلاف کی وضاحت،اختلاف املا کی صورت حال،غرض یہاں سب کچھ موجود ہے۔

خوش قسمت ہیں خضر تمیمی صاحب جنہیں صفدر علی شاہ جیسا محقق میّسر آیا جس نے ان کے نام کو زندہ کر دیا۔یہ مقام تو کسی چنیوٹی کو ملنا چاہیے تھا لیکن

یہ رتبہ ء بلند ملا جس کو مل گیا

پروفیسر ابوبکر صدیقی

23 جنوری 2010ء

احوال

نام ونسب

خضر تمیمی (1) ضلع چنیوٹ سے گزرنے والے دریائے چناب کے مشرقی کنارے پر واقع شہری علاقہ کے محلّہ قصاباں میں 11 مارچ 1909ء (2) کو پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام اللہ دتہ المعروف بلھا تھا۔ان کی ذات وڈ قصاب تھی جو جٹ تھہیم (3) کہلاتے تھے۔تھہیم کو تمیم بھی کہا جاتا ہے جس کی بدولت یہ قبیلہ تمیمی مشہور ہوا۔خضر تمیمی کی والدہ کا نام بختاور تھا۔ان کی صرف نرینہ اولاد تھی جو کہ تین بیٹے تھے۔ان بھائیوں میں خضر تمیمی سب سے بڑے تھے۔منجھلے بھائی کا نام محمد وریام تمیمی اور سب سے چھوٹے بھائی غلام محمد خالد تھے۔اب یہ تینوں بھائی تو اس دنیا میں نہیں ہیں تاہم ان کے خاندان کے زیادہ تر افراد یہیں چنیوٹ میں رہائش پذیر ہیں۔خضر تمیمی کے آباؤ اجداد قصاب کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ان کے والد نے یہی پیشہ اپنایا اور کچھ عرصہ تک تینوں بھائی اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

خضر تمیمی کے والدین ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دلانے کی شدید آرزو رکھتے تھے۔اس شہر میں تعلیم عام نہیں تھی اس لئے اکثر گھرانے تعلیم کی دولت سے عاری تھے۔ان میں خضر تمیمی کا اپنا گھرانہ بھی شامل تھا۔ایک ایسا ماحول جہاں تعلیم کا عام چلن نہ ہو اس دور میں خضر تمیمی کے والدین اپنی اولاد کے شاندار مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگے۔خضر تمیمی کو سب سے پہلے قریبی مسجد میں حافظ شہاب دین سے قرآن پاک پڑھنے کے لیے بھیجا گیا۔اس تعلیم کے ساتھ ہی اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں پہلی جماعت میں داخلہ دلوایا اور یہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا (4)۔وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج لائل پور میں داخل ہوئے (5)۔انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔اے آنرز کیا۔شخصیت کے رویے اور مزاج کی تبدیلیوں میں توارث اور ماحول بہت حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔زندگی کے تجربے اور مشاہدات اس عمل کو آگے بڑھانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے ہیں۔خضر تمیمی کے گھریلو مالی حالات کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھے۔اردگرد کے ماحول میں بھی غریب اور متوسط طبقے

کے افراد رہتے تھے۔ انہیں سیر و سیاحت اور گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ اپنے شہر کی خستہ حالی غریبوں کی مجبوریاں اور بے بسی کی کیفیات بھی ان کے سامنے تھیں۔ غالب گمان ہے کہ انہی محرومیوں سے متاثر ہوکر انہوں نے ایل۔ایل۔بی کرنے کے لیے لاء کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ یہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آبائی وطن لوٹ آئے اور ادبی و سماجی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ ان معاملات کے ساتھ ساتھ مزید تعلیم حاصل کرنے کے شوق کو نہ دبا سکے۔ وہ گہری دلچسپی کی وجہ سے نجی طور پر فارسی پڑھتے رہے اور بالآخر ایم۔اے فارسی کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ انہوں نے F.E.L کے دوران مالی تنگدستیوں اور گھریلو پریشانیوں کے پیش نظر ملازمت کی تلاش جاری رکھی۔ ان کے حالات اس حد تک بگڑ گئے کہ وہ F.E.L کی کلاس کو باقاعدگی سے جاری نہ رکھ سکے۔ اسی دوران اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں مئی 1931ء تا جنوری 1932ء جونیئر انگلش ماسٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ یہ ملازمت ختم ہونے کے بعد وکالت کی تعلیم کا سلسلہ پھر جوڑ لیا۔ ایل۔ایل۔بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد شیخ محمد امین مگوں ایڈووکیٹ چنیوٹ جو شاہی مسجد چنیوٹ کے متولی بھی تھے ان کی شاگردی میں اپرنٹس شپ مکمل کی اور اسی کچہری چنیوٹ میں پریکٹس کا آغاز کر دیا۔ خضر تمیمی ایم۔اے پاس کرنے کے بعد لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس کی تمنا رکھتے تھے۔ چنیوٹ میں سب جج کے علاوہ تحصیل دار کی کچہری تھی۔ یہاں کا معاشرہ قدامت پسند تھا۔ جس کی وجہ سے وکلاء کے پاس مخصوص گھرانوں اور خاندانوں کے مقدمات ہوتے تھے۔ چونکہ خضر تمیمی کا خاندانی پس منظر مضبوط نہیں تھا اس لیے یہاں وکالت پھیکی رہی اور لاہور منتقل ہونے کے لیے پر تولنے لگے۔ انہیں ابتدائی طور پر لاہور میں بھی کوئی خاص کامیابی نہ مل سکی۔ وہ چنیوٹ اور لاہور میں پریکٹس کے دوران ضلع کچہری جھنگ میں مقدمات اور وکلا سے ملاقات کے سلسلے میں آتے جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے اس عرصہ کے دوران بھی ملازمت کی تلاش جاری رکھی۔ بالآخر انہیں گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج دھرم سالہ کانگڑہ (انڈیا) میں بطور لیکچرار فارسی یکم جنوری تا 28 فروری 1937ء صرف دو ماہ کے لیے عارضی طور پر پڑھانے کا موقع ملا۔ وہ اس ملازمت سے فارغ ہوکر چنیوٹ آ گئے اور پھر یہیں وکالت کرنے لگے۔ اس بارے میں خضر تمیمی خود لکھتے ہیں۔

"مجھے گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج دھرم سالہ (کانگڑہ) میں فارسی، اردو اور تاریخ پڑھانے کا شرف حاصل رہا۔ لیکن دل میں یہ خلش

> بدستور پنگیاں لیتی رہی کہ وکالت پیشہ آدمی کو کیا ضرورت ہے کہ
> وہ "شہر سے دور شہر یار سے دور" ملازمت کی جھک مارتا پھرے۔
> وکالت کے میدان میں متوقع کامیابیوں کے پیش نظر میں نے
> استعفیٰ دیا اور واپس اپنے وطن چنیوٹ آ پہنچا" (6)

خضر تمیمی 18 اکتوبر 1941ء تک بطور وکیل کام کرتے رہے۔ اسی دوران آل انڈیا ریڈیو لاہور سے دیہاتیوں کے بارے میں ان کی ایک تقریر نشر ہوئی جسے وزیر اعظم پنجاب سر سکندر حیات نے خود سنا۔ وہ اس تقریر سے متاثر ہوئے اور انہیں قانونی مشیر تحریک پنجاب مقرر کر دیا۔ اس تقرر کے بارے میں خضر تمیمی کا بیان ان کے دیرینہ دوست کیپٹن ممتاز ملک نے اپنے ایک آرٹیکل میں یوں نقل کیا ہے:۔

> "1942ء میں جنگ عظیم ثانی کے دوران میں نے ریڈیو پر
> لاہور سے تقریر نشر کی۔ موضوع دیہاتی رسوم تھا اور زبان پنجابی۔
> اتفاق سے سر سکندر حیات خان مرحوم وزیر اعظم پنجاب نے اسے
> سن پایا اور ہمارے علم کے بغیر بالا بالا ہی یہ فیصلہ ہو گیا کہ تحریک
> پنجاب کے سلسلہ میں قانونی مشیر کی حیثیت سے مجھے لاہور میں
> تعینات کیا جائے" (7)

اس دوران انہوں نے پنجاب کے محکمہ امداد باہمی کے ہفت روزہ "پنچایت" کی ادارتی ٹیم میں شمولیت اختیار کر لی۔ خضر تمیمی کے دیرینہ دوست کیپٹن ممتاز ملک فوج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر لاہور آئے تو ان سے ملے اور پریکٹس شروع کرنے کی ترغیب دی۔ 1951ء میں خضر تمیمی یہ ملازمت ترک کرنے کے بعد وکالت کی طرف پلٹے تو ایک ہندو بیرسٹر کی متروکہ لائبریری الاٹ ہو گئی اور مزنگ روڈ لاہور پر اپنا دفتر قائم کر لیا۔ انہوں نے جملہ قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد 31 اگست 1949ء سے لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس کرنے کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ یہاں وکالت کے دوران 31 مئی 1950ء سے فیڈرل کورٹ آف پاکستان میں بطور اٹارنی خدمات سرانجام دینے کی اجازت مل گئی۔ خضر تمیمی کا شوق بڑھتا گیا اور 7 اپریل 1966ء سے سپریم کورٹ آف پاکستان میں سینئر اٹارنی کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

وکالت کے میدان میں کامیابیوں کے نتیجہ میں پنجاب یونیورسٹی لاء کالج لاہور میں

اعزازی لیکچرار تعینات ہوئے۔ یہاں 1952ء تا 1957ء قانون سے متعلقہ مضامین شام کی شفٹ میں پڑھاتے رہے۔ 65-1964ء کے دورانیہ کے لیے مغربی پاکستان ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن لاہور کے انتخابات ہوئے۔ اس انتخاب میں نائب صدر کے عہدہ کے لئے مقابلہ کیا اور کامیاب ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد بار ایسوسی ایشن کے صدر فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے گئے تو انہوں نے اس تین ماہ کے عرصہ میں قائم مقام صدر کی ذمہ داریاں انجام دیں۔ خضر تمیمی کی صلاحیتوں کا اعتراف عام سطح پر ہونے لگا تو انہیں گورنمنٹ انجمن حمایت اسلام لاء کالج لاہور میں وائس پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اسی دوران پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اعزازی لیکچرار پنجابی کی پیشکش بھی قبول کر لی۔ وکالت کے ساتھ ساتھ یہ ملازمت تادم آخر قائم رہی۔

خضر تمیمی بی۔ اے آنرز کا امتحان دینے کے بعد آبائی گھر چنیوٹ میں آئے تو والدین نے ان کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ خضر تمیمی کی شادی اپنے حقیقی ماموں محمد بخش کی بیٹی عائشہ بی بی سے ہوئی۔ ان کا نکاح شریعت محمدیہ ﷺ کے مطابق غیر تحریری ہوا جو قریبی مسجد کے مولوی شہاب دین نے پڑھایا۔ خضر تمیمی کی اولاد میں سب سے پہلے بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کا نام فاطمہ درّ نظر رکھا گیا۔ اس کے بعد علی الترتیب منظور نسیم تمیمی (بیٹا)، منورہ خاتون (بیٹی)، شمیم فاخرہ (بیٹی)، نوشاد بخت تمیمی (بیٹا)، ساجد نعیم تمیمی (بیٹا)، درشہوار (بیٹی) اور آخری اولاد درنجف (بیٹی) پیدا ہوئی۔ اس طرح یہ اولاد آٹھ افراد پر مشتمل ہے جن میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ خضر تمیمی کی بیٹی فاطمہ درّ نظر اور بیٹا منظور نسیم تمیمی چنیوٹ میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد محکمہ پنچایت میں ملازمت کے سلسلہ میں 1941ء میں لاہور منتقل ہو گئے۔ باقی اولاد لاہور میں پیدا ہوئی۔ اس محکمہ میں جز وقتی ملازمت کی وجہ سے گورنمنٹ چوبرجی کوارٹرز میں رہائش کے لیے الاٹمنٹ ہوئی تو بیوی بچوں سمیت یہاں منتقل ہو گئے۔ اس ملازمت سے علیحدگی کے بعد کرایہ کے مکان واقع مزنگ، مسلم گنج، گلی نمبر 5، مکان نمبر 1 لاہور میں منتقل ہوئے۔ مناسب سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے اس مکان کو چھوڑ دیا اور 1960ء میں ایک اور کرایہ کے مکان واقع جین مندر، پرانی انارکلی، 2/14 لاج روڈ لاہور میں چلے گئے اور تادم آخر یہیں قیام پذیر رہے۔(8)

چنیوٹ کی زیادہ تر آبادی مسلکاً اہل سنت والجماعت ہے۔ خضر تمیمی خود اور ان کے والدین اسی مسلک سے وابستہ تھے۔ دیگر مسالک کے لوگ باہمی احترام اور مذہبی رواداری کی بنیاد پر مل جل کر خوشگوار زندگی بسر کرتے تھے۔ مذہبی تقریبات باہمی اشتراک و عقیدت سے منائی

جاتی تھیں۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ قیام پاکستان سے قبل ہندو اور سکھ یہاں بھی معیشت اور تجارت پر مضبوط گرفت رکھتے تھے۔جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کا آپس میں اتحاد و اتفاق فطری تھا۔خضر تمیمی کا خاندان ایام عاشورہ نہایت عقیدت سے مناتا تھا۔اس شہر میں عرصہ دراز سے سات بڑے تعزیے اور ذوالجناح وعلم کے جلوس برآمد ہورہے ہیں۔ان میں ایک ''قصائیوں والا تعزیہ'' کے نام سے معروف ہے۔یہ تعزیہ اور ذوالجناح خضر تمیمی کے خاندان کے افراد مل کر نکالتے ہیں۔خضر تمیمی لاہور میں قیام کے دوران محرم الحرام کے ان ایام عاشورہ میں اکثر چنیوٹ آتے اور مجالس عزا میں شرکت کرتے تھے۔ان کے مزاج میں درویشی کا رنگ نمایاں تھا۔وہ لاہور میں قیام کرتے ہوئے ولی کامل کی صحبت اور قربت کے متلاشی رہے۔اپنے قلب کی تسکین کے لیے پنجابی زبان کا عارفانہ کلام خاص طور پر خواجہ غلام فریدؒ کی کافیاں گہری عقیدت کے ساتھ خوش الحانی سے پڑھتے اور سننے والوں کو بھی مسحور کردیتے تھے۔ان دنوں لاہور میں صوفی بزرگ حضرت حافظ برکت علی قادریؒ دینی اور روحانی علوم کی بنا پر شہرت عام رکھتے تھے۔ان کے مریدین اور عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔اس روحانی شخصیت کے کردار وعمل سے متاثر ہوکر اپنے دوست چوہدری محمد افضل (9) کی وساطت سے اس فقیر کامل کے دست حق پرست پر بیعت کی اور روحانی سلسلہ عالیہ قادریہ کے حلقہ مریدین میں شامل ہوگئے۔اس بزرگ کی ذات گرامی سے فیوض وبرکات حاصل کرنے کے لیے در نیاز پر اکثر حاضر ہوتے رہتے تھے۔خضر تمیمی کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؓ سے بھی گہری قلبی عقیدت تھی۔تصوف کی کتب ان کے زیر مطالعہ رہتیں۔کئی بزرگان دین کا عربی اور فارسی کلام نوک زباں پر رہتا تھا۔قصیدہ غوثیہ انہماک سے پڑھتے تھے۔اس بارے میں مولانا جعفر قاسمی لکھتے ہیں۔

> ''نطق ان کا واقعی تمیمی تھی۔عربی تاثیر رکھتا تھا۔سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت تھے۔حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا عربی وفارسی کلام ازبر تھا۔ ان کی شان میں منقبت بھی کہتے تھے۔وہ قصیدہ غوثیہ پڑھتے وقت دنیا و مافیہا سے لاتعلق معلوم ہوتے تھے''(10)

خضر تمیمی درویشوں اور بزرگوں کے ساتھ کس حد تک عقیدت رکھتے تھے۔یہ بھی ان کی صوفیانہ زندگی کا ایک درخشاں پہلو ہے۔اس کی وجہ ان کے مرشد حضرت برکت علی قادریؒ کی باطنی نظر معلوم ہوتی ہے۔خضر تمیمی نے ایک محیر العقول واقعہ اپنے افراد خانہ کو یوں سنایا:۔

> ''ایک دفعہ حافظ برکت علی کو خواب میں حضرت سلطان العارفین

سلطان باہوؒ نے گلہ دیا کہ تیرے مرید جھنگ تک جاتے ہیں آگے نہیں آتے۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد میں بیدار ہوا تو مرشد کہنے لگے کہ مجھے ایک گلہ ملا ہے کہ تم جھنگ سے آگے نہیں جاتے۔ اس لئے ایک دن قصداً لاہور سے دربار سلطان باہو کے لیے روانہ ہوا۔ دربار کے قریب جنگلی بوٹے بہت زیادہ تھے۔ جس کی وجہ سے راستہ کھو بیٹھا۔ راستہ تلاش کرنے کی کشمکش میں تھا کہ ایک خوش شکل سفید ریش شخص اچانک میرے سامنے آ گیا۔ اسے سلام کہا اور راستہ پوچھا اس نے راستے کی نشاندہی کی۔ تھوڑی دور تک وہ شخص نظروں کے سامنے رہا لیکن پھر اچانک غائب ہو گیا۔ دربار شریف پر حاضری دینے کے بعد مرشد کے پاس لاہور آیا تو انہوں نے اس سفر عقیدت کا حال دریافت کیا تو میں نے کہا کہ لعل پایا تھا مگر گم کر بیٹھا ہوں۔ مرشد نے اس شخص کے بارے میں بتایا کہ وہ حضرت سلطان باہو تھے"۔(11)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ان کی عقیدت کا ایک بیان ڈاکٹر محمد امجد ثاقب نے لکھا ہے جو خضر تمیمی کی درویشی اور استغنا کی اہم مثال ہے:۔

"اگر کوئی موکل حضرت غوث اعظمؒ کا نام بھی لیتا تو اس سے فیس قبول نہیں کرتے تھے۔ دراصل وکالت کو انہوں نے کبھی بھی دولت کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا۔ توکل اور استغنا کی بدولت حرص زر سے بہت دور رہے"۔(12)

جن دنوں خضر تمیمی نے چنیوٹ میں وکالت کی اس دوران انہیں موروثی زمینداروں اور وڈیروں کے رویوں کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس طرح ان کے اندر ایک تڑپ اٹھی کہ عوامی نمائندہ بن کر غریب لوگوں کی خدمت کی جائے۔ 1937ء میں بلدیہ چنیوٹ کے انتخابات کا اعلان ہوا۔ چنیوٹ کے سیاسی طور پر با اثر قاضی خاندان کے مقابلے میں کاغذات نامزدگی جمع کرائے۔ اس بارے میں خضر تمیمی کے بیان کو ان کے قریبی دوست ملک محمد باقر نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔

''میں آج کل حد درجہ معروف ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ
ہمارے شہر میں انتخابات بلدیہ کی تیاریاں بڑے زوروں پر
ہیں۔ بدقسمتی سے جملہ قصابان کرام کی طرف سے واحد نمائندہ
ہونے کی فال بنام من دیوانہ زدہ اند'' (13)

قاضی خاندان کے فرد کے کاغذات نامکمل ہونے کی بنا پر مسترد کر دیئے گئے مگر خضر تمیمی کی برادری کے ایک شخص محمد عظیم نے بھی کاغذات جمع کروا رکھے تھے۔ قاضی خاندان نے اس کی پشت پناہی کی اور خضر تمیمی کے مقابلے میں حمایت کی جس کی وجہ سے خضر تمیمی یہ انتخاب ہار گئے۔ اس کا انہیں ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہ لوگوں میں متعارف ضرور ہو گئے۔

1939ء میں ترکی کے شہر اناطولیہ میں زلزلے نے تباہی مچا دی۔ مسلم ممالک نے ترک بھائیوں کی امداد کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شہر شہر میں لوگوں نے چندے جمع کرنا شروع کئے۔ اس سلسلہ میں سٹی مسلم لیگ چنیوٹ کا اجلاس زیر صدارت خان صلاح الدین خان سب جج چنیوٹ، شاہی مسجد چنیوٹ میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر خضر تمیمی نے مصیبت زدگان کی امداد کے لئے تقریر کرتے ہوئے چندہ کے لئے پرزور اپیل کی۔ اس جنگ عظیم دوم کے دنوں میں مملکت برطانیہ کے زیر تسلط ہندوستان کا علاقہ بھی تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح خضر تمیمی حکومت برطانیہ کے بہی خواہوں میں تھے۔ جنگ کے مہیب خطرات کے پیش نظر لوگوں نے بنکوں سے اپنی رقوم وغیرہ نکلوانا شروع کر دیں۔ چنیوٹ میں ڈپٹی کمشنر سردار صاحب بلونت سنگھ نے لوگوں کو اس بات سے روکنے کے لئے اشتہارات اور پمفلٹ تقسیم کرائے۔ اس ضمن میں ان کا ایک مضمون ہفت روزہ 'یاد خدا' میں شائع ہوا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''ہم بانگ دہل کہتے ہیں کہ جب تک ہندوستان برطانیہ کے ماتحت
ہے اور اس میں قانون وقت کے ماتحت حکومت کا بندوبست چلانے
والے مخنتی، دیانت دار اور کارکن افسر موجود ہیں۔ ہندوستانی رعایا کو
کسی شخص سے کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ ہندوستان کو چھوڑ کر تمام دنیا میں
برطانیہ، امن و سلامتی کی بہترین ضمانت ہے۔ حکومت آپ سے کوئی
روپیہ پیسہ مفت نہیں لینا چاہتی۔ اگر آپ اپنی دولت کا حصہ مستقل طور
پر نہ دے سکتے ہوں تو سرکار کو قرضہ جنگ' ہی دیجئے''۔ (14)

سرکاری سطح پر عوامی خدمت کے لئے ''سوک گارڈ فورس'' قائم تھی جو شہریوں کے جان و مال کی بھی حفاظت کرتی تھی۔ مقامی انتظامیہ نے اس کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے تنظیمی ڈھانچہ میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ خضر تمیمی کی سماجی خدمات اور با اثر ہونے کی وجہ سے انہیں ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ اس بارے میں ہفت روزہ 'یادِ خدا' میں یوں خبر شائع ہوئی:۔

> ''سوک گارڈ چنیوٹ کی پلٹون بی کے کمانڈر قاضی غلام شبیر صاحب کو ٹاؤن کمانڈر اور میاں مولا بخش صاحب خضر پلیڈر سیکٹر پلٹون آفیسر کوان کی جگہ پلٹون کمانڈر بنایا گیا۔ قاضی صاحب نے اپنا چارج مولا بخش صاحب کو دے دیا ہے'' (15)

محکمہ دیہات سدھار پنچایت میں ملازمت کے دوران پنجاب بھر کے قصبوں اور گاؤں کے لوگوں سے براہ راست ملنے کا موقع ہاتھ آیا۔ ان کی اذیت ناک حالت سے آگاہی ہوئی۔ وہ اس خراب صورت حال کو ملکی تناظر میں دیکھ رہے تھے۔ اس لئے مسلم لیگ کی قیام پاکستان کی سرگرمیوں میں عملی طور پر شامل رہے۔ خضر تمیمی کے دوست قمر تسکین نے اپنے ایک مضمون میں لکھا:۔

> ''قیام پاکستان کی تحریک میں خضر تمیمی نے سرگرم حصہ لیا۔ وہ قبل ازیں پنجاب کے سینکڑوں ہزاروں گاؤں میں گھوم پھر کر دیہی عوام کی کسمپرسی اور ہندو مہاجن کی گرفت اور مکاریوں کا مشاہدہ کر چکے تھے اور اپنے صوبہ کی مسلم آبادی کی دگرگوں حالت سے بخوبی آشنا تھے۔ جو ہندوؤں کے تعصب اور معاشی برتری کا شکار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ خضر تمیمی نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں پورے خلوص اور لگن سے حصہ لیا تھا'' (16)

خضر تمیمی زر پرستوں اور زر پسندوں سے نفرت کرتے تھے۔ وہ ان سیاست دانوں کے اس روّیے سے سخت نالاں رہتے تھے جو قیام پاکستان کے بعد تعمیر و استحکام کی بجائے دولت سمیٹنے اور اپنی تجوریاں بھرنے لگ گئے تھے۔ وہ ملک کی ترقی اور خوشحالی کے خواب دیکھا کرتے تھے لیکن قائداعظم کے انتقال کے بعد سیاستدانوں اور مفاد پرستوں کی جنگ زرگری نے انہیں مایوس کر دیا۔ اسی لیے وہ خود غرض اور لالچی سیاستدانوں سے شدید نفرت کرتے تھے۔ دراصل وطن کی محبت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک دفعہ ٹریفک کے حادثہ میں ان کی ٹانگ زخمی ہو گئی تو دوستوں کے استفسار پر اس بارے میں جو الفاظ ادا کئے وہ قمر تسکین نے اپنے اسی مضمون میں

آگے چل کر یوں لکھے ہیں:۔

"کاش میری یہ ٹانگ ٹریفک حادثہ میں زخمی ہونے کی بجائے کسی جنگ میں زخمی ہوتی۔ایسی جنگ جس میں اپنی وطن کی حفاظت کے لئے دشمنوں سے لڑ رہا ہوتا"(17)

خضر تمیمی 1952ء میں عالمی فری میسن تحریک میں شامل ہوئے۔اس تحریک سے وابستگی کے بعد اپرنٹس شپ حاصل کی اور فیلو کرافٹ پاس کر کے ماسٹر میسن کی ڈگری حاصل کی۔ پھر رائل آرک میسن کی حیثیت سے ممبر پنجاب چیپٹر لاہور رجسٹرڈ ہوئے۔اس کے بعد اچھی کارکردگی کے پیش نظر 'مارک ماسٹر' بنا دیئے گئے۔آہستہ آہستہ 'رائل مارک ماریز' ہو گئے۔ 1957ء میں فری میسن کے لئے قوانین کی تشکیل کے ضمن میں اعانت طلب کی گئی۔یہ ذمہ داری بطریق احسن انجام دینے کے بعد 'ڈسٹرکٹ گرینڈ اِنر گارڈ' کا عہدہ دیا گیا۔عمدہ تعاون اور پروگرام سے متفق ہونے کی بنا پر با قاعدہ 'رائل آرک مین' تسلیم کیا گیا۔ان دلچسپیوں کے پیش نظر 1968ء میں 'انسٹالڈ ماسٹر' اور پھر 1969ء میں 'مارک ماسٹر مین آف پاکستان' کی حیثیت سے ڈسٹرکٹ گرینڈ لاج میں ذمہ داریاں تفویض کی گئیں(18)۔خضر تمیمی کی ان وابستگیوں اور دلچسپیوں کی وجہ سے حلقہ احباب میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں تا ہم ان کی ایسی کسی سرگرمی کی نشاندہی نہیں ہوئی جس کی نتیجے میں کوئی منفی طرز عمل سامنے آئے۔

ایشر داس چرخ چنیوٹی قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے دہلی جا بسے۔ان کی محبت میں بے قرار ہوئے تو مئی 1955ء میں انڈیا چلے گئے۔چند روز قیام کرنے کے بعد واپس لاہور آئے۔اسی سال اکتوبر 1955ء میں بچھڑے دوستوں سے ملنے کے لئے پھر انڈیا گئے۔جنوری 1956ء میں چرخ چنیوٹی کے چھوٹے بھائی مدن لعل کپور کی شادی ہونا قرار پائی۔اس شادی میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے اور اپنے ساتھ سہرا بھی لکھ کر لے گئے۔وہ 19 جنوری 1957ء کو دہلی روانہ ہوئے اور 28 جنوری 1957ء کو واپس لاہور آ گئے۔چناب رنگ کی ان یادوں کے بارے میں ڈاکٹر محمد امجد ثاقب لکھتے ہیں:۔

"فطرت سے محبت اور حسن پرستی کے جو پھول چرخ کی ذات میں کھلے، انہیں چنیوٹ کی زرخیز مٹی اور دریائے چناب کی رومان پرور لہروں نے سینچا تھا اور جب ان پھولوں پہ شباب کا دور آیا تو وہ چنیوٹ

کو خیر باد کہہ کر گنگا اور جمنا کے کنارے جا بسے تھے۔ لیکن ان کی یادوں

کے سفینے آج بھی چناب کی لہروں پہ رواں دواں ہیں" ۔(19)

خضر تمیمی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے گہری عقیدت کی وجہ سے دربار اقدس پر حاضری دینے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ چنانچہ 1956ء میں سات افراد پر مشتمل مریدین کا قافلہ حضرت حافظ برکت علی قادری کی قیادت میں بغداد شریف کے لئے روانہ ہوا۔ خضر تمیمی اس قافلے میں شامل تھے۔ اس پورے قافلے کو مریدین، عقیدت مندوں اور لواحقین کی کثیر تعداد ریلوے اسٹیشن لاہور پر الوداع کہنے کے لئے آئی۔ خضر تمیمی اپنے اس سفر کے بارے میں الوداعی منظر یوں بیان کرتے ہیں:۔

"روانگی کے وقت دیگر مریدان با اخلاص کے علاوہ سید منیر حسین صاحب، ایم۔اے، شیخ داؤد قدس اور حاجی قادر بخش کے علاوہ والد صاحب اور والدہ صاحبہ بھی ریلوے اسٹیشن پر آئے اور دعاؤں سے نوازا" (20)

خضر تمیمی نے اس سفر کی روداد لکھی جس میں اکیس (21) کے عدد کے بارے میں دلچسپ اتفاقات بیان کئے جو ان کے لیے خاص اہمیت اختیار کر گئے تھے۔

خضر تمیمی کے مزاج میں رنگوں کی ایک کہکشاں تھی۔ انہوں نے سکول کے زمانے سے ہی ادبی ذوق کو مزاج کا حصہ بنائے رکھا۔ ان کی شاعری کے آغاز کے بارے میں بلال زبیری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:۔

"خضر تمیمی نے 1922ء میں مزاحیہ شاعری شروع کی"(21)

تاہم اس دور کی شاعری کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکی لیکن اس بات کا پتا چلتا ہے کہ انہیں ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ ڈاکٹر محمد امجد ثاقب نے چنیوٹ کی ادبی محفلوں کے بارے میں لکھا ہے:۔

"ضلع کے ڈپٹی کمشنر شیخ سراج دین اعلیٰ ادبی ذوق کے مالک تھے۔ وہ ادب کی سرپرستی کرتے تھے۔ ان کے زیر سایہ مدرسوں میں طرحی مشاعروں کا اہتمام ہونے لگا جن میں خضر تمیمی، ہلال چنیوٹی، ڈاکٹر فیض احمد فیض اور میاں الٰہی بخش تسلیم وغیرہ مقامی شعرا کی شرکت سے جان پڑ گئی۔ اس طرح کے ایک مشاعرے کا 1927ء میں

اہتمام ہوا جس کا طرح مصرع یہ تھا:

نگاہ شوق رخنہ کرتی ہے دیوار آہن میں" (22)

خضر تمیمی کے بھائی محمد وریام تمیمی نے راقم سے ملاقات کے دوران اس مشاعرہ کی تصدیق کی اور خضر تمیمی کا ایک شعر انہوں نے اپنی زبانی سنایا۔

الٰہی کس بلا کا شور ہے بلبل کے شیون میں
لگادی ایک ہی نغمے سے جس نے آگ گلشن میں (23)

گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج لائل پور کے ادبی ماحول نے ان کے شوق کو ابھارا جس کی وجہ سے سماجی اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے اور یہاں اپنی پہچان قائم کر لی۔ ان دلچسپیوں کا اظہار کالج کے پرنسپل تارا سنگھ نے اپنی قلمی تحریر میں کیا۔

'He was prominent in the social activities of the college and has a marvellous tendency for dramatic programme"(24)

اسلامیہ کالج لاہور میں زمانہ طالب علمی کے دوران سرگرمیاں جاری رہیں۔ ان کی فطری صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لئے یہاں کے ماحول نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں ایم۔ ڈی۔ تاثیر نے خضر تمیمی کے بارے میں اپنی تحریری رائے کا اظہار اس طرح کیا۔

"He was one of our best students and was the leading of the terms. Students with literary bent of literature mind are generally siack in the study of Tex Books but Khizar was an exception"

انہوں نے اپنی ادبی سرگرمیوں سے کالج کے ماحول کو خوشگوار اور پررونق بنائے رکھا جس کی وجہ سے نہ صرف طلبا بلکہ اساتذہ کرام میں بھی مقبول رہے۔ میرزا ادیب، خضر تمیمی سے سینئر طالب علم تھے اور ان سے خوب شناسا تھے۔ اس بارے میں لکھتے ہیں۔

"خضر تمیمی بڑی مزےدار شخصیت کے مالک تھے۔ ریواز ہوسٹل میں اپنی مزاحیہ نظمیں سنایا کرتے تھے اور سارے کالج میں بے حد مقبول تھے۔ "چلم اور سگریٹ" ان کی وہ نظم تھی جس کا چرچا دور دور تک پہنچ

چکا تھا۔ جب حقے کی لے منہ سے ہٹا کر نظم سناتے تھے تو ان کی زبان

سے زیادہ ان کا سر ہلتا تھا"(26)

ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر کے ٹیوٹوریل گروپ میں خضر تمیمی بھی شامل تھے۔ وہ اپنے اس شاگرد کی سرگرمیوں کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے تھے۔ ان کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ میں اپنے قلم سے جملے تحریر کئے:۔

"Mr. Khizar was my student in the Islamia College, Lahore and belonged to my tutorial group. I had an ample opportunity of knowing his activities outside the college. I can say with confidence that he is quite out of the ordinary over of students. He has real literary taste, unusual talent and power of expression. Add to all this, an acute sense of humour and a genial temperament, and you have Maula Bakhsh Khizar, M.A. LLB. He is one of the most promising literati of our province"(27)

خضر تمیمی کو کالج میں نامور محقق حافظ محمود شیرانی سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ وہ بھی ان کے بارے میں اچھے خیالات رکھتے تھے۔

"M.B. Khizar Tamimi, M.A; LL.B was my student in Islamia College Lahore in 1928 and is known to me since then........ He is intelligent, capable and trustworthy. His genius as a student of Oriental literature has always impressed me and I have come across few youngmen of his calibre."(28)

خضر تمیمی نے 1937ء میں چنیوٹ سے ہفت روزہ 'جہاں نما' کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ

صرف مقامی نوعیت کی خبروں پر مشتمل نہیں تھا بلکہ ملکی اور عالمی تناظر میں خبریں اور تبصرے شائع ہوتے تھے۔ ان کی کئی تحریریں اس ہفت روزہ میں شائع ہوئیں۔ یہ ہفت روزہ ہر ماہ کی 7، 14، 21، 28 تاریخ کو نکالا جاتا تھا۔ خضر تمیمی کی لاہور منتقلی کے بعد یہ ہفت روزہ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا اور بالآخر بند ہو گیا۔ کئی دفعہ اس کے دو یا تین شماروں کو بھی ملا کر شائع کیا جاتا رہا۔
خضر تمیمی اور چرخ چنیوٹی دونوں اپنے اوقات اکثر اکٹھے گزارتے تھے۔ دونوں نے چنیوٹ کی ادبی فضا کو نکھارنے اور شعرا کو منظم کرنے کے لیے بلا امتیاز مذہب وملت ''پبلک لٹریری سرکل'' قائم کیا۔ اس 'پبلک لٹریری سرکل' کا سیکرٹری چرخ چنیوٹی کو مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر فروغ ادب کے لئے گرانقدر کام کیا اور ان کا اپنا شعری مجموعہ 'آہیں' 1941ء میں شائع ہوا۔ 1941ء میں خضر تمیمی کو تحریک پنچایت میں قانونی مشیر مقرر کیا گیا۔ بعد میں اس محکمہ کے تحت ہفت روزہ 'پنچایت' بھی شائع ہونے لگا تو یہ اس رسالہ کے قلمی معاونین میں شامل ہوئے۔ خضر تمیمی اس ملازمت کو ترک کر کے پھر وکالت کی طرف پلٹے مگر ادبی رسالوں کے ساتھ ان کی دوستی کبھی ختم نہ ہو سکی۔ ان دنوں مزاحیہ ماہنامہ 'شیرازہ' لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ 'شیرازہ' کے مزاج میں ایک شائستگی اور تہذیب تھی۔ اس میں صحافت سے زیادہ ادب کا رنگ موجود تھا۔ خضر تمیمی کی کئی تحریریں اس رسالہ میں شامل ہوئیں۔ قیام پاکستان کے بعد ایک اور مزاحیہ پرچہ ہفت روزہ 'نمکدان' کراچی سے 28 فروری 1948ء کو جاری ہوا۔ خضر تمیمی نے اپنے قلم کے جوہر اس ہفت روزہ میں بھی دکھائے۔ ان میں کئی تحریریں شائع ہوئیں۔ خضر تمیمی کی تحریفات اختر شیرانی کے ماہنامہ ''رومان'' لاہور میں شائع ہوتی رہیں۔ یہ ماہنامہ مئی 1935ء میں جاری ہوا۔ اختر شیرانی کے ساتھ ان کی گاڑھی دوستی تھی۔ وہ اکثر چنیوٹ آتے اور خضر تمیمی کے ہاں قیام کرتے جہاں چرخ چنیوٹی ان کی بطور خاص خدمت کرتے۔ خضر تمیمی کی اس رسالہ سے وابستگی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اختر شیرانی کے والد پروفیسر حافظ محمود شیرانی سے ان کو اسلامیہ کالج لاہور میں براہ راست فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے اختر شیرانی کے ساتھ ماہنامہ ''خیالستان'' میں بھی کام کیا۔ قلمی معاونت کے حوالے سے کئی تحریفات اور مناظرے شائع ہوئے۔ خضر تمیمی کی ہر کس و ناکس سے تعلق داری تھی۔ تکلف اور ریاکاری ان کے قریب سے بھی نہیں گزری تھی۔ وہ ادب میں کسی گروہ بندی کے قائل نہ تھے۔ اس لئے ہر محفل میں چلے جاتے تھے۔ وہ طرز خاص سے کلام پڑھ کر زبردست داد وصول کیا کرتے تھے۔ شاکر عروجی نے اپنے ایک مضمون ''خضر تمیمی'' ماہنامہ

'پرچم' لائل پور کے شمارہ جون، جولائی 1973ء میں صفحہ نمبر 4 پر لکھا کہ خضر کو ہم نے مشاعروں میں سنا ہے۔ ''اٹھتی جوانی'' میں دیکھا ہے۔ اس کے فنی ''مظاہرات'' یاد نہ کراؤ، ستم نہ ڈھاؤ اور اگر اس عہد کی رعایت سے پوچھتے ہو تو خضر کی شاعری آفت جاں ہے۔ خضر کا مشاعرے میں ادائے خاص سے پڑھنا مصیبت دوراں ہے۔ میاں خضر کو اب بھی مشاعروں میں نہ بلاؤ، اب بھی اس سے نہ پڑھاؤ اور اگر سننا ہی ہے تو رقیق القلب سامعین کا خدا حافظ۔ وہ تو طبل وعلم اور کوس ودہل کا نقیب ہے۔ اس کا آہنگ عجیب ہے، لَے مہیب ہے، سوتوں کو جگا دے، جاگتوں کو تھرا دے، مشاعرے میں جنگ کا بگل بجا دے۔ ع یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔

خضر تمیمی طبقاتی تقسیم اور منافرت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ دوسری طرف مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار نے مسلمانوں سے ان کی شناخت چھیننا شروع کر دی۔ اس بات سے بھی وہ سخت نالاں تھے۔ عوام کی محرومیوں کا بھی قلق تھا۔ وہ ملک کے وقار کو بلند کرنے والی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ غلامی کی زندگی کا کوئی روپ انہیں قبول نہیں تھا۔ انہوں نے ملک کے اندر اٹھنے والی آواز میں اپنی آواز کو شامل کیا اور انگریز کی غلامی کے خلاف صدائے احتجاج میں شامل ہو گئے۔ مزاحیہ تحریروں کے ذریعے اس رجحان کے خلاف لکھتے رہے۔ صحافی قمر تسکین اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''ظاہر ہے ان ایام میں محض قصیدہ گوئی سے کام نہ چل سکتا تھا۔ عوام کے جذبات و احساسات کے پیش نظر غیر ملکی حاکموں پر کڑی تنقید کی ضرورت درپیش تھی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے خضر تمیمی مرحوم نے مزاح کا سہارا لیا اور اس دور کے روزنامہ احرار، جمہور، حریت اور ہفتہ وار جہاں نما، میں کام کرنے لگے ان اخبارات و رسائل میں وہ ایک وطن دوست صحافی اور شاعر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور بطور مزاح نویس اردو دان طبقے سے روشناس ہو گئے'' (30)

ان رسائل کے علاوہ خضر تمیمی کی نظم ونثر کے کئی نمونے ''نقوش'' کے طنز ومزاح نمبر، نوادرات سخن، غبار کارواں، شعرائے پنجاب سمیت متعدد کتب ورسائل میں موجود ہیں۔ انہوں نے سماجی اور معاشرتی مسائل پر مضامین لکھے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب، آب حیات، میں شامل شیخ ابراہیم ذوق کے باب کی پیروڈی ''نقوش'' طنز ومزاح نمبر میں شائع ہوئی۔ چرخ چنیوٹی

کے شعری مجموعہ ''حسن نظر'' کا دیباچہ لکھا۔ پنجابی زبان میں' ساڈی دسوں دے مسلے' کے عنوان سے مذاکرہ ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوا۔ خلیل احمد ملک نے ایم۔اے پنجابی کا مقالہ لکھا تو اس کے نگران خضر تمیمی تھے۔ اس لئے اس کا' تعارف' بھی خود لکھا۔ علامہ اقبال کے ساتھ ملاقات کے بارے میں احوال لکھے۔ قائداعظم کے کردار و سیرت پر مضمون لکھا۔ سفر نامہ بغداد شریف نہایت عقیدت کے ساتھ قلم بند کیا۔ آپ' قلندر' کے قلمی نام سے روزنامہ نوائے وقت میں مضامین لکھتے رہے۔ فرانسیسی افسانہ نگار موپاساں کے ایک افسانے کا ترجمہ ''جذبہ ء بے اختیار'' کے عنوان سے کیا جو ماہنامہ' خیالستان' کے شمارہ مارچ 1932ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ 'لیڈر اور ایڈیٹر کا مناظرہ' دسمبر 1937ء یا اس کے بعد شاید ماہنامہ' رومان' میں شائع ہوا تھا۔ خضر تمیمی بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے ان کی منظومات میں مزاح اور تحریف نگاری کا عنصر زیادہ ہے۔ پھر یہی اسلوب ان کی ادبی پہچان بنا۔ نجی محفلوں کو کشت زعفران بنانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ کسی محفل میں موجود ہوں اور اپنی موجودگی کا احساس نہ دلائیں یہ ممکن ہی نہ تھا۔ کیپٹن ممتاز ملک بتاتے ہیں:۔

> فیض احمد فیض اور میاں الٰہی بخش تسلیم وغیرہ مقامی شعرا کی شرکت سے
> ''خضر تمیمی مرحوم طبعاً خوش مزاج، ہنس مکھ، طنز گو اور جگت باز تھے۔
> چنانچہ وہ جب بھی دوستوں سے ملتے یا کسی مجلس میں شریک ہوتے تو
> ان کے ادبی لطیفوں، چٹکلوں، طنز اور جگت سے محفلیں کشت زعفران
> بن جاتی تھیں''(31)

خضر تمیمی نے وکالت ہی کے دوران امریکی سپریم کورٹ کے جج ولیم۔او۔ڈگلس کی تحریر کردہ قانون کی کتاب A Living Bill of Rights کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ شدہ کتاب کا پیش لفظ جسٹس ایس۔اے۔رحمٰن نے لکھا۔ 1965ء میں یہ کتاب' بنیادی انسانی حقوق کا مسئلہ' کے نام سے شائع ہوئی۔

خضر تمیمی شگفتہ مزاج اور سادہ دل انسان تھے۔ مجلسی زندگی کو بہت پسند کرتے تھے۔ ہر عمر کے شخص کے ساتھ اس کے مزاج اور مرتبہ کے مطابق گفتگو کرتے۔ چنیوٹ سے لاہور منتقل ہوئے تو تادم آخر کرایہ کے مکان میں زندگی بتا دی۔ سائیکل اور خضر تمیمی کا رشتہ اٹوٹ رہا۔ کثیر افراد پر مشتمل گھرانہ مالی تنگدستی کا شکار رہا۔ وکالت کے دوران مالی حالت کچھ بہتر ہوئی تو ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر کار خرید لی۔ جو سید ضمیر جعفری کی نظم ''موٹر کار'' کے بیشتر اوصاف رکھتی تھی۔ جن دنوں

خضر تمیمی اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں طالب علم تھے۔ان کے گھر کے قریب رہنے والے سید مدد علی شاہ کے پوتے ان کے ہم جماعت تھے۔خاندانی تفاوت کی بنا پر دونوں کا آپس میں ملنا جلنا مدد علی شاہ کو پسند نہیں تھا۔اس بارے میں محمد وریام تیمی نے راقم کو ایک دلچسپ بات سنائی۔

''مدد علی شاہ جب خضر تمیمی کو دیکھتا تو چڑانے کے لئے یہ جملہ بلند آواز میں کہتا۔
'آدمی زخاک است وسید زنور است' خضر تمیمی فارسی جملے کے مفہوم کو سمجھتے تھے اس لئے پریشان ہو جاتے۔ ایک دفعہ پھر کسی موقع پر اس شخص نے یہی جملہ دہرایا تو خضر تمیمی نے برجستہ کہا 'آدمیت زسیداں دور است' اس کے بعد وہ مصرع مدد علی شاہ کی زبان سے کبھی نہ سنا گیا''(33)

کیپٹن ممتاز ملک نے خضر تمیمی کی سادگی کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ اپنے مضمون میں لکھا ہے جو خضر تمیمی کے اپنے الفاظ میں انہوں نے اس طرح درج کیا ہے:۔

فیض احمد فیض اور میاں الٰہی بخش تسلیم وغیرہ مقامی شعرا کی شرکت سے''جھنگ کی عدالت میں کسی مقدمے کی پیروی کر کے واپس آئے اور لاری سے اترنے کے بعد سیدھے میرے پاس پہنچے۔ سفید پتلون، سیاہ شیروانی اور کیپ پہن رکھی تھی۔پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ میں نے برقی پنکھا تیز کر دیا اور کہا شیروانی اتار دیجئے۔ مگر انہوں نے میری سنی ان سنی کر دی۔جب میں نے چوتھی بار یہی اصرار کیا تو قہقہہ لگایا اور شیروانی اتار کر دوسری کرسی پر پھینک دی اور میں ہکابکا رہ گیا کہ شیروانی کے نیچے قمیض تھی نہ بنیان۔فرمایا، بھئی ایک ہی قمیض اور بنیان تھی لانڈری میں ڈبل ریٹ پر دے دی کیونکہ مجھے آج صبح جھنگ کی عدالت میں پیش ہونا تھا۔لانڈری والے کا کوئی عزیز انتقال کر گیا اور اس کی دکان بند تھی۔لہٰذا مجھے صرف شیروانی اور پتلون سے جھنگ جانا پڑا''(34)

خضر تمیمی ایک غریب خاندان کے فرد تھے اور اس غریبی کو زندگی کے کسی موڑ پر فراموش نہیں کیا بلکہ اس زندگی نے ان کے اندر خود اعتمادی اور محنت کو پنپنے کا موقع فراہم کیا۔وہ غریبوں کے دکھوں کو بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے اور ان کی حالتِ زار پر کفِ افسوس ملتے رہتے۔

جہاں تک ممکن ہوتا ان کی امداد کرتے۔ ان کی انسان دوستی کا ایک واقعہ ان کے مزاج کو واضح کرتا ہے۔ ممتاز ملک اسی آرٹیکل میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ میں مرحوم خضر تمیمی کے ہمراہ 'پیسہ اخبار' سے نگینہ بیکری، نیلا گنبد جانے کے لئے روانہ ہوا تو آبکاری روڈ پر پیسہ اخبار پولیس اسٹیشن سے دس بارہ قدم دور ایک سپاہی ایک خوانچہ فروش کو تھانہ کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ خوانچہ فروش کی مزاحمت پر سپاہی کو غصہ آ گیا اور اس نے خوانچہ فروش کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اس مار پیٹ کے دوران خوانچہ فروش کا خوانچہ الٹ گیا اور دہی بھلے پکوڑیاں زمین پر گر کر مٹی میں لت پت ہو گئے۔ خوانچہ فروش کی چیخیں بلند ہوئیں تو خضر تمیمی برق رفتاری سے آگے بڑھے اور سپاہی سے لپٹ گئے۔ اسی اثنا میں بیسیوں لوگ جمع ہو گئے تو خضر مرحوم نے سپاہی کو تھانہ چلنے کے لئے کہا۔ تھانہ میں مرحوم خضر تمیمی نے انچارج ایس۔ ایچ۔ او کو سپاہی کے ظلم و ستم سے واقف کیا اور زور دے کر کہا کہ سپاہی سب سے پہلے تو خوانچہ فروش سے معافی مانگے پھر اس کے نقصان کی تلافی کرے تو معاملہ رفع دفع ہو سکتا ہے۔ بصورت دیگر آپ اس واقعہ کی رپورٹ درج کریں اور ہمارے بھی بطور گواہ بیان لیں۔ اس مطالبے کے بعد جونہی مرحوم خضر تمیمی نے یہ کہہ کر اپنا تعارف کرایا کہ وہ وکیل ہیں۔ ایس ایچ او نے سپاہی کو سخت سست کہنے کے علاوہ گالیاں بھی دیں اور خوانچہ فروش سے پوچھا کہ اس کا کتنا نقصان ہوا ہے۔ خوانچہ فروش نے چالیس روپے بتائے اور ایس ایچ او نے فوراً ہی اپنی جیب سے نکال کر پچاس روپے اس کے حوالے کر دیئے۔ پولیس اسٹیشن سے باہر نکل کر خوانچہ فروش مرحوم خضر تمیمی کے پاؤں میں گر گیا اور ان کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ خضر تمیمی مرحوم نے اسے اٹھا کر گلے سے لپٹا لیا اور کہا ایک انسان ہونے کے ناطے ان کا یہ فرض تھا کہ وہ سپاہی کو ظلم و ستم سے باز رکھے۔ خضر تمیمی مرحوم کی شخصیت کے اس رخ نے مجھے ان کی انسان دوستی کا قائل کر دیا۔

خضر تمیمی وکالت کے پیشہ سے منسلک تھے۔ اس بارے میں خاصی احتیاط سے کام لیتے۔ وہ روپے پیسے کے لالچ سے بے نیاز تھے۔ کوئی غریب آدمی اپنا کیس لے کر آتا تو بعض اوقات ان سے فیس بھی نہ لیتے۔ کیس لیتے وقت اس بات کی تسلی کر لیتے کہ موکل حق پر ہے یا نہیں۔ تسلی ہو جاتی تو وہ کیس لے لیتے ورنہ معذرت کر لیتے۔ وہ چونکہ پابند صوم صلوٰۃ تھے۔ اس لئے دروغ گوئی کو ہر حال میں برا سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گہری چھان بین کے بعد صرف اس موکل کا کیس لیتے تھے جس کے بارے میں انہیں یقین ہو جاتا کہ وہ بے گناہ ہے۔ خضر تمیمی 1953ء میں یونیورسٹی لاء کالج لاہور میں قانون کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان دنوں جھنگ کے معروف قانون دان چوہدری محمد ادریس سلیمی ان

کے شاگرد تھے۔انہوں نے نئے تعلیمی سال کے آغاز پر خضر تمیمی کی کلاس میں آمد اور گفتگو کے بارے میں راقم کو بتایا کہ خضر تمیمی کو ہماری کلاس کے دو مضامین اسلامک لاء اور پرنسپلز آف رومن اتھکس سونپے گئے۔اسلامک لاء پڑھانے کے لئے پہلے دن کلاس میں آئے تو طالب علموں نے حسب روایت سیٹیاں وغیرہ بجانا شروع کر دیں۔خضر تمیمی کی بھاری بھرکم شخصیت کو دیکھ کر خاموش ہوئے تو خضر تمیمی نے طالب علموں سے تعارف کا سلسلہ شروع کر دیا۔جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو طلباء نے تعارف کے لئے خضر تمیمی سے کہا۔انہوں نے انگریزی میں جملہ ادا کیا۔

Let me introduce my self. I am son of I.C.S

دراصل I.C.S (Indian Civil Services) کا مخفف ہے مگر طلباء کو I.C.S کی سمجھ نہ آئی تو اس کا مطلب پوچھنے لگے۔خضر تمیمی نے کہا

I.C.S. tense for "Indian Cow Slaughter."

یعنی ''ہندوستانی قصاب'' یہ جملہ سن کر سب ہنس پڑے۔

خضر تمیمی انگریزی مخففات کے بے دریغ استعمال اپنے مخصوص معنی و مفاہیم کی صورت میں کیا کرتے تھے۔اکثر اوقات ان مخففات کی تہہ میں گالیاں ہی ہوتیں۔اس بارے میں مولانا جعفر قاسمی لکھتے ہیں۔

''تمیمی صاحب انگریزی ڈگریوں بی۔اے،ایم۔اے،پی۔ایچ ڈی اور ایل۔ایل بی کو گالیوں کی مختلف تراکیب کے طور پر استعمال کرتے تھے۔یہ ایک طرح کے کوڈ ورڈز ہوا کرتے تھے''۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ مولانا جعفر قاسمی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:۔

> ''ایک جج صاحب اپنے میز پر پاؤں پسارے ساعت مقدمہ فرمانے لگے۔ ثقہ وکلا کمرہ عدالت میں داخل ہوتے یہ منظر دیکھ کر بھونچکے سے رہ جاتے اور الٹے پاؤں باہر آجاتے۔تمیمی صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو کہنے لگے کہ اس L.L.D کو ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔کمرہ عدالت میں داخل ہوئے۔دروازے کے قریب ہی ٹھہرے رہے۔ رسمی انداز میں سر جھکایا، سر اٹھایا، بڑی سنجیدگی کے ساتھ دو تین بار یہ عمل دہرایا۔
>
> جج صاحب نے ان کا نوٹس لیا اور انگریزی زبان میں پوچھا۔
>
> Is anything the matter Mr. Tamimi?

No My Lord, Your Lordship is very kind

قبول نہیں کرتے تھے۔ دراصل وکالت کو انہوں نے کبھی بھی دولت
تو پھر آگے تشریف کیوں نہیں لاتے۔ تمیمی صاحب نے ایک بار سر جھکا
کر اظہار آداب تو کیا مگر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس پر جج صاحب کو
'اپنی ہیت کذائی کا احساس ہوا اور انہوں نے پوچھا کہ انہیں میز پر
ٹانگیں رکھنے پر تو کوئی اعتراض نہیں؟ نو مائی لارڈ آپ چاہیں تو اپنی
ٹانگیں میرے کندھوں پر رکھ سکتے ہیں'' (35)

منیر علی شاہ لیکچرر ہیں جو جھنگ میں رہتے ہیں۔ یہ خضر تمیمی کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے اپنے استاد محترم کے بارے میں ایک واقعہ سنایا کہ 71-1970ء کے سیشن میں حمایت اسلام لاء کالج لاہور میں شام کی شفٹ میں ہم خضر تمیمی سے ایل۔ ایل بی کلاس میں محمڈن لاء پڑھتے تھے۔ کوئی طالب علم اپنی نشست پر درست طریقے سے نہ بیٹھا ہوتا اور خضر تمیمی کی نظر پڑ جاتی تو اسے کہتے B.P بن کر بیٹھو۔ B.P سے مراد تھا 'بندے دا پتر' بن کر بیٹھو۔

خضر تمیمی کے مزاج میں مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ انگریزی مخففات سے ذو معنویت پیدا کرنے کے ماہر تھے۔ جس کی وجہ سے صاف نکل جاتے تھے۔ اس طرح کا ایک واقعہ جو خضر تمیمی اور ایک جج کے درمیان کسی کیس کے سلسلہ میں پیش آیا۔ اس کے بارے میں انہوں نے مزید بتایا۔

''کسی کیس میں جج کے ساتھ قانونی نکتے پر الجھاؤ پیدا ہوا تو کمرہ سے
باہر نکلتے ہوئے غصے میں L.T.C کہا۔ وہاں پر موجود کسی نے جج
سے کہا کہ خضر تمیمی آپ کو غلیظ گالی دے کر چلے گئے ہیں۔ جج نے
انہیں بلایا اور اس L.T.C کی وضاحت مانگی۔ خضر تمیمی نے کہا کہ.
میں نے گالی نہیں دی بلکہ "Let This Conclude" کہا ہے'' (36)

پروفیسر حافظ محمود شیرانی مرحوم کی وجہ سے ان کے بیٹے اختر شیرانی کا شروع شروع میں بے حد احترام کرتے تھے۔ بعد میں یہ احترام دوستی میں بدل گیا جس کی وجہ سے اختر شیرانی چنیوٹ آتے رہتے تھے۔ خضر تمیمی اور چرخ چنیوٹی ان کے لئے چشم براہ رہتے۔ خضر تمیمی کی وضع داری اور مہمان نوازی کا حال خضر کی اپنی زبانی سنیے:۔

"ان دنوں ہم دونوں' تازہ واردان بساط دل' تھے اور ہمارے ذہن
اس مرحلے پر تھے کہ باہر سے جو اثر بھی ملے قبول کرلیں۔ میرے
استاد گرامی پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے فرزند داؤد جنہیں بعد میں
دنیا نے اختر شیرانی کے شہرہ آفاق نام سے جانا اور پہچانا، جب
لاہور کے ہنگاموں سے اکتا جاتے تو 'مزاج کا بدلنے کے لئے'
سیدھا چنیوٹ کا رخ کرتے۔ جہاں راقم اور جناب ایشرداس
چرخ چنیوٹی ان کے لیے چشم براہ رہتے" (37)

شراب نوشی کے بارے میں خضر تمیمی کا مسلک کچھ اور تھا وہ مہمان کی خدمت میں کوئی غفلت نہ برتتے تھے۔ اس کے لئے سب کچھ کر گزرتے تھے۔ وہ حقہ نوش تھے۔ خود شراب نوشی کے قریب نہ پھٹکتے تھے۔

راقم نے خضر تمیمی کے حال احوال دریافت کرنے کے لئے پروفیسر غلام جیلانی اصغر کو ایک خط تحریر کیا جس کے جواب میں انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ سے آگاہ کیا:۔

"ایک دفعہ سرگودھا میاں محمد شفیع (جو اس وقت سرگودھا میں ڈپٹی
کمشنر تھے) سے ملنے آئے اس موقع پر میری ان کی ملاقات مرے
بہنوئی کے جوتوں کی دوکان پر ہوئی۔ مجھ سے کہنے لگے جیلانی
صاحب، میرا یہ مصرع لکھ کر کہیں لگوادیں۔ ہم روٹیاں کماتے ہیں
جوتی کے زور سے" (38)

اسی طرح راقم نے پروفیسر تقی الدین انجم، سابق پرنسپل، گورنمنٹ کالج جھنگ، حال مقیم لاہور کو ایک خط لکھا۔ جس میں انہوں نے خضر تمیمی اور مجید امجد کے بارے میں ایک مزیدار واقعہ بتایا:۔

"امجد مرحوم نے یہ لطیفہ سنایا کہ خضر تمیمی کالج کی ادبی مجلس کے عہدہ
دار تھے۔ ان کا پورا نام مولا بخش خضر تمیمی تھا۔ جس کا مخفف م، بخت
لکھا کرتے تھے۔ ایک نوٹس جو انہوں نے مجلس کی ادبی سرگرمی کے
بارے میں بورڈ پر لگایا۔ اس پر م۔ بخت لکھا۔ امجد مرحوم نے 'م' پر
'ک' کا اضافہ کردیا۔ صورت یہ ہوگئی کم بخت، خضر تمیمی کو کئی دن بعد
پتہ چلا کہ یہ شرارت مجید امجد کی تھی" (39)

خضر تمیمی حقہ کشی کے بہت رسیا تھے۔ جب اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے تو اس وقت بھی حقہ ان کا ساتھی تھا۔ حقہ میں عمدہ قسم کا تمبا کو استعمال کرتے تھے۔ حقہ کے اتنے عادی ہونے کے باوجود اس شوق سے اچانک تائب ہو گئے۔ پھر بقیہ ساری زندگی اسے منہ نہ لگایا۔ شعرائے پنجاب کے مرتبین نے خضر تمیمی کے اپنے بیان کو اس کتاب میں یوں نقل کیا ہے:۔

"حالات زندگی میں البتہ یہ بات قابل یادگار ہے کہ میرے جیسا محقق

(حقہ پینے والا) 22 دسمبر 1933ء سے یکدم حقہ نوشی سے تائب ہو گیا ہے"۔(40)

خضر تمیمی جملہ فنون لطیفہ میں دلچسپی لیتے تھے تاہم ان کا ایک شوق طبلہ بجانا بھی تھا۔ جھنگ سے تقریباً 40 کلومیٹر دور موضع واصل شاہ آبادی شیر کوٹ تھانہ مسن جھنگ کے رہائشی نامور استاد جیون بخش سے طبلہ اور ان کے چچا زاد بھائی نامور استاد علی بخش جو نہایت خوش آواز تھے ان سے سارنگی بجانا سیکھا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا تو معروف موسیقار سرور نیازی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اس شوق میں مزید اضافہ کیا۔ عملی زندگی میں کشمکش روزگار نے پریشان کیا تو یہ سلسلہ ملتوی کر دیا۔ انہوں نے 1932ء کے لگ بھگ لاہور کی ایک میوزک کانسرٹ میں حصہ لیا اور طبلہ نوازی میں اوّل آئے۔ خضر تمیمی گھر میں بیٹھے ہوئے ترنگ میں آتے تو بنیان کو پیٹ کے اوپر سے ہٹا کر انگلیوں سے توند پر طبلہ کی طرح بجانا شروع کر دیتے تھے جس سے وہ خوب لطف حاصل کرتے تھے۔

خضر تمیمی کی طبیعت میں بذلہ گوئی اور حاضر جوابی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لیے اپنے بے تکلف دوستوں کی مجلس میں مغتنمات میں شمار کئے جاتے تھے۔ خضر تمیمی کے قہقہوں کا پس منظر اداسیوں اور محرومیوں کی گود میں تھا۔ دوستوں کے سامنے دکھوں کا اظہار کرنے کی بجائے قہقہے لگاتے اور زندہ دلی کی تصویر بن جاتے۔ یہی تلقین اپنے ملنے والوں کو بھی کیا کرتے۔ اپنی صحافی دوست قمر تسکین کو ایک ملاقات میں مشورہ دیتے ہیں۔

"قہقہہ دل و دماغ کے لئے ایک ٹانک ہے۔ تم یوں کیا کرو کہ گھر سے نکل کر لارنس باغ میں گھوما کرو، پھولوں کو دیکھو، کتنے خوب صورت معلوم ہوتے ہیں تم۔ خوب صورت اور حسین چیزوں کو دیکھو گے تو مادی اور دنیاوی الجھنوں کو بھول جاؤ گے اور پھر تمہیں کوئی ایسی شے نظر آ ہی جائے گی۔ جسے دیکھ کر تم بے ساختہ قہقہہ بلند کرنے

پر مجبور ہو جاؤ گے۔میرا مشورہ یہی ہے کہ تم فلسفی نہ بنو انسان بنو
کیونکہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے"۔(41)

یوں تو خضر تمیمی کی شخصیت کے کئی گوشے ہیں مگر زندہ دلی اور مزاحیہ شاعری نے انہیں شعروادب کی دنیا میں پہچان بخشی۔ان اوصاف کے بارے میں سید جعفر طاہر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:۔

"حضرت خضر تمیمی زندہ دل،شگفتہ مزاج،خوش اخلاق اور مزاح نگار شاعر تھے۔انہوں نے اردو کی بعض نہایت مشہور نظموں کی کامیاب اور خوب صورت پیروڈیاں لکھیں"(42)

خضر تمیمی کی گفتگو میں شیرینی اور اپنائیت کا احساس زبان زد خاص و عام رہا۔ ہر آدمی کے ذوق اور مزاج کے مطابق بات کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔انہوں نے بے تکلف دوستوں کا حلقہ وسیع کر لیا تھا۔اس طرح مجلسی زندگی کو ترجیح دی۔ مقامی بولیوں پر عبور رکھنے کی وجہ سے بے تکلفانہ گفتگو کیا کرتے۔الغرض خضر تمیمی کے بارے میں یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ایک بھرپور زندگی بسر کی۔وہ ادبی محفلوں کی جان بن کر رہے۔سماجی وطبقاتی تقسیم سے ہٹ کر ہر محفل میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔خضر تمیمی نے زندگی کی بازی ہارنے سے چند گھنٹے قبل اپنے دفتر میں ایک موکل سے ملاقات کی۔اسے اگلے دن لاہور ہائی کورٹ بار روم میں ملاقات کا وقت دیا۔وہ شخص تو ہائی کورٹ پہنچ گیا مگر خضر تمیمی اس سے پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔خضر تمیمی کے انتقال کے بارے میں راقم نے ان کے بڑے بیٹے منظور نسیم تمیمی سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا:۔

"27 جنوری 1974ء کو رات کے وقت تقریباً 9 بجے والد صاحب دفتر سے گھر آئے،کپڑے تبدیل کئے اور ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگ گئے۔تھوڑی دیر بعد انہیں شدید کھانسی ہوئی جس کی شدت کا کرب محسوس کرتے ہوئے میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ تکلیف زیادہ ہو رہی ہے تو ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔اس وقت گھر میں چھوٹے بھائی نوشاد بخت تمیمی کے علاوہ چھوٹی بہنیں شمیم فاخرہ اور درّ نجف موجود تھیں۔والد صاحب نے کہا کہ ہاں ڈاکٹر کو لے آؤ۔میں گھر سے باہر نکلا تو تمام کلینک

بند ملے۔ واپس گھر آتے ہوئے اپنے قریبی دوست شیخ محمد سلیم کو ساتھ
لیا اور والد صاحب کو ایک رکشہ میں بٹھا کر میو ہسپتال ایمرجنسی لے آئے
۔ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ انہیں دل
کا دورہ پڑا ہے جو جان لیوا ثابت ہوا ہے اور یہ راستے ہی میں فوت ہو
گئے ہیں۔ اس طرح 27 جنوری 1974ء بمطابق 2 محرم الحرام
1394ھ بوقت دس بجے شب اتوار کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔
(اناللہ وانا الیہ راجعون)۔ہم وہیں سے ایمبولینس میں جسد خاکی
واپس گھر لے آئے۔ تمام افراد خانہ شدید غم کی کیفیت میں مبتلا
ہو گئے۔ بالآخر مرحوم کو آبائی قبرستان چنیوٹ میں دفن کرنے کا فیصلہ ہوا۔
اسی رات ایمبولینس کے ذریعے تقریباً 3:30 بجے رات آبائی گھر
چنیوٹ پہنچے۔ یہاں پہنچ کر عزیز و اقارب اور جسٹس ہائیکورٹ عطاالله سجاد
کو بذریعہ فون اطلاع دی۔28 جنوری 1974ء سوموار کو ان کی
نماز جنازہ گیارہ بجے دن پڑھی گئی اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں
آبائی قبرستان باقر والی چنیوٹ میں دفن کر دیا گیا۔ان کی رسم چہلم 3 مارچ
1974ء کو سہ پہر تین بجے لاہور والی رہائش گاہ پر ادا کی گئی'' (43)

خضر تمیمی کے انتقال کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ ان کی وفات کی خبریں 29 جنوری 1974ء کے اخبارات روز نامہ وفاق لاہور، روز نامہ مشرق لاہور، روز نامہ جمہور لاہور، روز نامہ مساوات لائل پور، روز نامہ عوام لائل پور، روز نامہ نوائے وقت لاہور اور روز نامہ پاکستان ٹائمز لاہور میں شائع ہوئیں۔

''میاں خضر تمیمی انتقال کر گئے

لاہور کے ممتاز قانون دان میاں مولا بخش خضر تمیمی انتقال کر گئے۔ میاں خضر تمیمی ایم۔اے، ایل۔ایل بی ایڈووکیٹ چنیوٹ ضلع جھنگ کے رہنے والے تھے۔آپ وکالت پاس کرنے کے بعد لاہور میں پریکٹس کرتے رہے۔ مرحوم گورنمنٹ لاء کالج میں جزوی لیکچرار رہے اور آج کل انجمن حمایت اسلام لاء کالج کے بھی جزوی لیکچرار تھے۔ مرحوم عرصہ پہلے کئی مقامی اردو روز ناموں کے اداروں سے بھی منسلک رہے۔ یہاں خضر تمیمی مرحوم کے سوگ میں چیف جسٹس

پنجاب کے زیر ہدایت دوپہر کے وقفے کے بعد عدالت عالیہ اور تمام دوسری عدالتیں اور ان سے ملحقہ دفاتر بند کر دیئے گئے"۔

روزنامہ پاکستان ٹائمز لاہور نے ان کی وفات کی خبر کو یوں شائع کیا:۔

Khizar Tamimi Dead

"Mr. M.B. Khizar Tamimi a senior advocate and a former professor of Anjuman Hamayat Islam Law College, died in Lahore on Sunday. He was also a humourist and a literature of Urdu. As a mark of respect, the lawyers suspended work after 11:00 a.m. and the High Court was closed. The High Court and District Bar Association and H.I. Law College, passed resolutions condoling the death of Mr. M.B. Khizar Tamimi. The resolutions described Mr. Tamimi as an able and devoted teacher and a man of letters. His body was taken to Chiniot"

ان کی وفات پر نذیر مجیدی نے "یادرفتگاں" کے عنوان سے اپنے کالم "حسرت آیات" روزنامہ عوام لائل پور میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا:۔

"ان کی موت کا بے حد صدمہ اور سخت ملال ہے۔ ایسی قابل شخصیت بار بار پیدا نہیں ہوا کرتی۔ ہم سوگواروں کے نالہ وشیون اور گریہ زاری سے جراحت دل کے اندمال کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

فروغ شمع جو اب ہے، رہے گا تا حشر یونہی
مگر دنیا تو پروانوں سے خالی ہوتی جارہی ہے

معروف صحافی منو بھائی نے اپنے کالم 'گریباں' میں جذبات و محسوسات کا اس طرح اظہار کیا:۔

"میاں صاحب 'زندہ دلان لاہور' کی آخری شمع تھے۔ ان کے گُل ہونے سے زندہ دلان لاہور کی زندہ دلی کی دھڑکنیں مدھم ہوگئی ہیں۔

مسکرا نہیں سنجیدگی کی طرف مائل ہونے لگی ہیں اور اہل لاہور اب
زندہ دلی 'افورڈ' نہیں کر سکتے''۔(44)

خضر تمیمی کی وفات پر چرخ چنیوٹی نے ان کے بارے میں یوں کلمات ادا کئے:۔

''قبلہ خضر تمیمی صاحب مشرقی تہذیب کے علمبردار اور ایک بااخلاق
ودرویش صفت انسان تھے۔ چونکہ غزل گوئی کو وہ مخرب الاخلاق
سمجھتے تھے اس لئے غزلیات سے متعلق ان کے دیوان کا کوئی سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ انہیں مناظرہ نویسی اور پیروڈی میں ید طولےٰ
حاصل تھا۔ جس کے لئے ڈاکٹر سر عبدالقادر، ڈاکٹر سر محمد اقبال، حافظ
محمود شیرانی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ابوالاثر حفیظ جالندھری نے آپ کو
ہمیشہ عزیزانہ حیثیت دے رکھی تھی۔ صاحب موصوف نے اپنے
تمام مناظروں میں مشرق کو ہمیشہ مغرب پر مدلل فوقیت کا اظہار
کیا، جو قابل داد ہے''۔(45)

حفیظ جالندھری نے جب انکے بچھڑنے کی خبر سنی تو انہیں سخت صدمہ ہوا۔ اپنی دلی کیفیت کا اظہار اشعار کی صورت میں یوں کیا۔(46)

بعد از خلیق خضر تمیمی بھی چل دیئے ـــ جام حیات زندہ دلی کا لئے ہوئے
سوئے بہشت اٹھ گئے اس بزم زشت سے ـــ ہم سے وبال حال کا تحفہ لئے ہوئے
اللہ! کوئی صورت معنٰی رہی بھی ہے ـــ میں تا بہ کے جیوں یہ تمنا لئے ہوئے
احباب ہی نہیں ہیں تو کیا زندگی حفیظ ـــ دنیا چلی گئی مری دنیا لئے ہوئے

الغرض خضر تمیمی چونسٹھ سال دس ماہ اور سترہ دن اس عالم فانی میں بسر کرنے کے بعد 27 جنوری 1974ء کو عالم بقا کی طرف چل دیئے۔ یوں علم وادب کا ایک اور باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ لیکن آنے والوں کے لیے نئے راستوں کا تعین اور فکر کے کئی گوشے عیاں کر گئے۔

حمد (1)

الٰہی دو جہاں میں بیکسوں کا آسرا تو ہے
حقیقت میں دل بے مدعا کا مدعا تو ہے
تری رحمت سے پایا فیض کیا فصل بہاری نے
گلوں کا رنگ و بو تو ہے، عنادل کی نوا تو ہے
ادھر ہے دشمن و حاکم سے ظاہر تیری جباری
ادھر احباب کا سرمایہء مہر و وفا تو ہے
تیرے ادنیٰ کرم سے عقل نے بالیدگی پائی
بظاہر فہم انساں سے اگرچہ ماورا تو ہے
ہیں تیرے دم قدم سے رونقیں گلزار ہستی کی
یہاں کا باغباں تو، آب تو، باد صبا تو ہے
کبھی مظلوم و بیکس کو ہے تسکیں رحم سے تیرے
کبھی اک ظالم و سرکش کے سر پر قہر سا تو ہے
یہاں حیوان و جن و انس سب محتاج ہیں تیرے
وہاں مخلوق نامعلوم کا بھی آسرا تو ہے
تری تعریف ہے بیروں حدود سعیء امکاں سے
ہماری سرحد ادراک کی بس انتہا تو ہے
بصارت لطف سے تیرے ہے قائم اپنی آنکھوں میں
مرے ٹوٹے ہوئے دل میں بصیرت کی ضیا تو ہے
خضر آزاد ہے پھندوں سے دولت اور حکومت کے
ہے اس کے واسطے کافی کہ اس کا اک خدا تو ہے

☆☆☆

نعت پاکؐ (2)

حق نے عطا کی آپؐ کو، کل انبیا کی سروری
کون ومکاں میں آپؐ کے حصے میں آئی برتری
نورخدا کی آپؐ کے رخ سے ہوئی جلوہ گری

"اے چہرہ زیبائی تو ، رشک بتان آذری
ہر چند وصفت می کنم تو ازہمہ بالاتری" (3)

ذات گرامی آپؐ کی اکسیر بہر رنج و غم
برکت سے نام پاک کی مٹ جائیں سب قحط والم
احساں ہے کیانام خدا، ان کے ہی کہلاتے ہیں ہم

"آفا قہا گردیدہ ام ، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام،لیکن تو چیزے دیگری" (4)

لطف نگاہ پاک سے ہیں کھیتیاں سب کی ہری
زیر نگیں ہیں آپؐ کے مخلوق خشکی و تری
جن و ملائک اور بشر ، ہردم کریں فرمانبری

"تو،ازتری چابک تری و ز برگ گل نازک تری
از ہرچہ گویم بہتری ، حقا عجائب دلبری" (5)

اک عمر سے ہے التجا ، منظور کرلیجے شہا
اس بندہ ء ناچیز کی ، جوہجر میں تڑپے سدا
ازراہ بندہ پروری ، لیجے اسے در پر بلا

"خسروغریب است و گدا، افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہرخدا ، سوئے غریباں بنگری" (6)

☆☆☆

یارسولؐ اللہ از بہر خدا امداد کن(7)

عمر بھر کرتے رہے امراض ملت کا علاج
اک مرض نے انتقاماً دھرلیا ہے ان کو آج
دل کے ہاتھوں گو ہمیشہ یہ رہے ہیں بیقرار
لیکن، اب دل ہوگیا ہے اور ہی صورت سوار
محفل احباب میں مثل بریشم نرم ہیں
کار زار ملک و ملت میں ہمیشہ گرم ہیں
ان کے اوصاف مسیحائی کی ہی تصویر ہے
ان کی جو تحریر ہے یا انکی جو تقریر ہے
دل ہمیشہ سے رہا ان کے قلم کا ہم زباں
واردات قلب یکسر، ان کا انداز بیاں
ہم کو ارزانی رہے یہ سر دبیر ارجمند
یہ سراپا علم و حکمت ، صاحب عزم بلند
ہیں خضر کی یہ، تہ دل سے دعا ہائے صمیم
ہوں خلیق خوش بیاں پر حق کے الطاف عمیم (8)
''یا خدا ! بہر جناب مصطفٰےؐ امداد کن
یا رسولؐ اللہ ! از بہر خدا امداد کن'' (9)

☆☆☆

مسلماں

باطن مسلماں، ظاہر مسلماں
اول مسلماں، آخر مسلماں

فخر رسلؐ کے سینیں قدم سے — برسیں گھٹائیں رحمت کی چھم سے
آئیں صلواتیں عرب و عجم سے — سلمانؓ سے ہم، سلمانؓ ہم سے

اندر مسلماں ، باہر مسلماں
اول مسلماں ، آخر مسلماں

فخر دو عالمؐ ،آقائے نامی — شاہنشہی ہے جن کی غلامی
ان کے کرم سے بھائی تمامی — حبشی کہ ہندی ، رومی کہ شامی

ہیں ایک ملت، سب کی یہ پہچاں
اول مسلماں، آخر مسلماں

یہ راجپوتی [اور] یہ ترکمانی — یہ عجمیت اور یہ پٹھانی
پہچان کو ہیں باہم نشانی — ملت کے آگے ورنہ یہ فانی

نسلی تمیزیں ، کافر کا ساماں
اول مسلماں ، آخر مسلماں

صحرا کے ذرے صحرا سے مل جا — دریا کے قطرے دریا سے مل جا
ہٹ سامری سے، موسیٰؑ سے مل جا — مولا کے بندے، مولا سے مل جا

باطن مسلماں ، ظاہر مسلماں
اول مسلماں، آخر مسلماں

☆☆☆

خوش آمدید(11)

آج چنیوٹ میں جم مرتبہ مہماں آیا(12)
افق عدل کا خورشید درخشاں آیا

جس کے انصاف کے ہیں دہر میں گھر گھر چرچے
جان و اموال رعایا کا نگہباں آیا

بخت بیدار پہ چنیوٹ نہ کیوں اترائے
خانہ ء مُور میں جب آپؑ سلیمانؑ آیا

ضامن عدل ہوئی ذات گرامی جس کی
بن کے سرمایہء آرام دل و جاں آیا

جلوہء دین محمد سے ہیں آنکھیں روشن (13)
للہ الحمد کہ وہ نازش دوراں آیا

ہیں دعائیں یہی ماؤں کی ہوں بیٹے ایسے
بن کے تمثیل تو اے سرو خراماں آیا

تیری آنکھوں میں ہیں قانون قدیم اور جدید
جن کی تفسیر کا تو ماہر ذی شاں آیا

عین تقدیر کا لکھا، تری تحریر قلم
خوبیء بخت سے تو صاحب فرماں آیا

مسند عالی انصاف پہ تیرا ہونا
بے نواؤں کے لئے زیست کا ساماں آیا

تیری ہمت کی بلندی، مری تسکین دلی
بازوئے راست ترا عدل کی میزاں آیا

شاد و خرم تجھے اللہ ہمیشہ رکھے
برگ و گل بخشی میں تو غیرت بستاں آیا

تیری آمد کے خدا اور مواقع لائے
خضر ہو کیف میں ہر بار غزل خواں آیا

☆☆☆

اچھے شہری(۱۴)

وہ مفروضہ خطروں سے ڈرتے نہیں
اور افواہوں پہ کان دھرتے نہیں
انہیں خدمت ملک سے پیار ہے
حفاظت انہیں اپنی درکار ہے
کبھی جنگ میں آپ جاتے ہیں وہ
شجاعت کے جوہر دکھاتے ہیں وہ
کہیں پیش کرتے ہیں وہ جان و مال
وہ خطروں کو لیتے ہیں یونہی سنبھال
تسلی سے کرتے ہیں وہ کاروبار
نہ ہو کام ان کو تو ہوں بے قرار
انہیں خود حفاظت کا احساس ہے
حکومت کی خدمات کا پاس ہے
حکومت کا ایوان و کاخ بلند
انہی کی ہے امداد سے مستمند
دل و جاں سے ان کو یہ معلوم ہے
حقیقت میں خادم ہی مخدوم ہے
بجائے غم دولت نا درست
نہیں لب پہ لاتے سخن سخت و سست
سمجھتے ہیں وہ ، ہم ہیں خود محوِ جنگ
نہیں ہوتے قربانی دینے سے تنگ

ہٹاتے ہیں وہ راہ سے سنگ کو
کہ دلواتے ہیں قرض وہ جنگ کو
انہیں کہنے سننے کی حاجت نہیں
بتانے کی ان کو ضرورت نہیں
سمجھتے ہیں وہ خوب احوال کو
بچا کر نہیں رکھتے اموال کو
انہیں یاد ہے ظلم کی انتہا !
نہیں فتح میں ان کو کچھ شک ذرا
انہیں بزدلی سے تعلق نہیں
اور ان کے سخن میں تملق نہیں
جو کہتے ہیں خود کر دکھاتے ہیں وہ
کبھی جاں پہ بھی کھیل جاتے ہیں وہ

☆☆☆

یوم انقلاب(15)

قاہرے کا سانحہ ، حامل ہے اس عنوان کا　　خون اب مل کر بہے گا ، چین و پاکستان کا(16)
دو بہادر ، دوستی میں ، دشمنی کرتے نہیں　　جن کا ہو طرزِ عمل دو قالب و یک و جان کا(17)

آج ہے ایوب خاں تنظیم ملت کا نشان　　ہو گیا ہے ایک ،مسلم چین کا ایران کا
اس کے دم سے روس کے مسلم میں ،شوق اتحاد　　ترکی ،عالی گہر بھی نور ، قلب و جان کا

گو ملائی ایشیا ہے آنکھ کا تارا اسے　　لیکن انڈونیشیا بھی ہے دوست ،عالی شان کا
ہے رسولؐ اللہ کے ہم قوم سے الفت اسے　　ق رحمۃ اللعالمینؐ ، سرچشمہ ہیں فیضان کا

سرورِ کل ، ھادی، جملہ سبل ہیں مصطفیٰؐ　　ہے فقط ان کا کرم ، پشت و پناہ انسان کا
آپ کو ٹھنڈی ہوا ،آتی ہے پاکستان سے　　امن کی خاطر جو حامل ، تیغ اور قرآن کا

یارسولؐ اللہ، غلاموں کی حفاظت کیجئے　　کفر ہے آمادۂ پیکار ، ہندوستان کا
پھر عطا ہو ، زورِ بازوئے علی المرتضیٰؓ　　پاسباں ہو عزم ، شبیرؓ و شہ جیلان کا

فتح و نصرت ،کیوں نہ چومے گی قدم ایوب کے
بلکہ اسکے سر[پہ] سایہ صاحب قرآن کا(18)

☆☆☆

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند (19)

بابر کی طرح صاحب سیف و قلم بھی ہے ۔ یہ پاسبان ملک ، چراغ حرم بھی ہے (20)

ہر دم ہے اس کو فکر ، سلامت رہے وطن ۔ ملت کو اک لڑی میں پرونے کا غم بھی ہے

ایوب خاں ہے ملت بیضا کی آبرو ۔ آج اس کے دم سے دہر میں اپنا بھرم بھی ہے

ہے اس کی ذات ہم کو اتا ترک کی مثال ۔ گو جانچنے میں بیش بھی ہے اور کم بھی ہے

ملت کے دشمنوں کے لئے برقِ قہر ہے ۔ اور دوستوں کے حق میں سحاب کرم بھی ہے

پامال ہوں کہیں بھی، مسلماں جہان میں ۔ سب کی نگاہ میں یہ علاج ستم بھی ہے

کلمے کا جس نے ورد کیا وقت کار زار ۔ ہر سو نشاں ظفر کا اسی کا قدم بھی ہے

اس نے دکھایا جنگ میں اعجاز موسوی ۔ عکس نشان حیدریؓ اس کا علم بھی ہے

تسکین دل ہے اس کے لئے عشق مصطفےٰؐ ۔ ان کا کرم یہ ہے کہ تری آنکھ نم بھی ہے

ٹھنڈی ہوا حضورؐ کو آئی ادھر سے ہے ۔ یہ خاک پاک اس لئے والا حشم بھی ہے

تجکو سدا نصیب غلامی حضورؐ کی
جو برتر از سکندری و رشکِ جم بھی ہے

☆☆☆

الوداعی تقریب (21)

چمن اپنا رہے آباد ، یا رب مکیں اسکے رہیں ،دل شاد یا رب
یہاں ہیڈ مسٹرس ، جومس امیں ہیں سراپا علم و شفقت ، خوش جبیں ہیں
ہے مس جیمہ کو اسپیلنگ کا احساس یہ فرماتی ہیں ، رکھو ڈکشنری پاس
ہے انگریزی سے ان کو،اس قدر کام اسے رکھیں اسیر پنجہ و دام
ہے مضموں ہوم اکنامکس ، اچھا ہے مس رفعت کو اس پر ناز سچا
پہ مس رفعت کا غصہ ہے نیارا جسے ، جس پر بھی ، جب چاہا اتارا
ہے مس قیوم کی ، انگریزی باندی کوئی کیوں کر کہے "مینوں نہیں آندی"
جومس قیوم کی سن پائیں باتیں توہوں گی طنز کی معلوم گھاتیں
زبان فارسی ، شیریں سخن ہے کہ اس سے شکر میں کام و دہن ہے
تبسم مس قمر مرزا کے لب پر ہے حاوی وقت اور بے وقت سب پر
عجب مس خالدہ خندہ جبیں ہیں کبھی ناراض کرنے پر نہیں ہیں
فزکس اور کیمیا کا علم ان کا خدا کے فضل سے ہے خوب بانکا
ہیں اردو اور پنجابی کا سنگم ہے مس بھٹی کی شخصیت میں مدغم
ہے مس بھٹی کا بھی اخلاق اعلیٰ ادھر مس چودھری ہیں سر و بالا
سدا آباد ہو ، اپنا چمن زار ہمیں محبوب ہیں ، اسکے گل و خار
یہ ہیں تسنیم اختر کی دعائیں
یہاں سب علم اورسکھ چین پائیں

☆☆☆

امداد باہمی (22)

ہر درد کا علاج ہے ، امداد باہمی خوشحالیوں کا راج ہے ، امداد باہمی

اہلِ وطن نے پائی ہے جس سے حیاتِ نو وہ جاں فزا رواج ہے ، امداد باہمی

جنگل بھی اُس کے فیض سے آخر ہرے ہوئے عزم و عمل کا تاج ہے ، امداد باہمی

ستر ملیں گے حشر میں بدلے میں ایک کے یاں سوگنا اناج ہے ، امداد باہمی

کل بھی ہمارے واسطے ثابت ہوئی نجات ویسی مفید آج ہے ، امداد باہمی

کھیت اور کارخانے میں محنت کی آبرو بیکار گھر کی لاج ہے ، امداد باہمی

مصروف زندگی کے لئے مقصد حیات فرصت کا کام کاج ہے ، امداد باہمی

محنت کا پھل سدا سے ہے، میٹھا جہان میں حسن عمل کا باج ہے ، امداد باہمی

اے خضر اس وطن کو لگیں کیوں نہ چار چاند
جب اپنے سر کا تاج ہے ،امداد باہمی

☆☆☆

سکاؤٹ کا ترانہ(23)

[مرا] وعدہ ، یہ اپنی آن پر ہے ہمیشہ نقش دل اور جان پر ہے
خدا نے جو فرائض طے کئے ہیں ق ہمارے ملک کے حق میں کئے ہیں
دل و جاں سے انہیں پورا کروں گا مدد ہر ایک کی ، ہردم کروں گا
سکاؤٹ کے لئے قانون ، جاں ہے ق اور اُسکی پیروی سب پر عیاں ہے
جہاں میں اعتماد اس کا مثالی وفا کے وصف سے ہر گز نہ خالی
بڑے اس کے ہوں یا ہوملک اس کا ہو آقا ، ماتحت یا لیڈر اس کا
سبھی اس کی وفاداری کے قائل اور اس سے فائدہ پانے پہ مائل
تمیز مذہب و ملت سے بالا سکاؤٹ کا سدا ، اخلاق اعلیٰ
کسی بھی ملک کے ہوں،یار ہیں سب مدد پر باہمی تیار ہیں سب
بھروسا اپنے لیڈر پر ہے ہر دم کریں تعمیل اس کی مل کے باہم
کوئی مشکل پڑے ، تو حل کرینگے بہم مل کر سبھی ، راضی خوشی سے
روپے پیسے کو جائز خرچ کرنا سدا اسراف سے بچنا سنبھلنا
ہمارا قول ہو ، یا فعل ، کچھ ہو پس پردہ ، خیال اپنے میں سچ ہو
ہے ہر اسکاؤٹ کا دین اور ایماں نچھاور ملک اور ملت پہ ہو جاں
سکاؤٹ ہوں ، مرا ایماں وفا ہے مرا ہر بات میں ضامن ، خدا ہے
یہ بیڈن پاول اچھا رہنما تھا فدائے خدمت خلق خدا تھا
خدا ساجد کو نیکی پر چلائے مفید ملک اور ملت بنائے
ملے خدمت کا جذبہ تیز اس کو دلازاری سے ہو پرہیز اُس کو
یہ پاکستان ، وحدت کانشاں ہے سکاؤٹ اس کا ہر پیر و جواں ہے
خدا اس کو سدا آباد رکھے یہاں ہر فرد کو دل شاد رکھے

یہاں اسلام کا سکہ رواں ہے
جو دنیا کے ہر اک عاقل کی جاں ہے

☆☆☆

سہرا (24) (مدن لعل کپور)

چاند کی طرح جو چمکا ہے ، مدن کا سہرا
ہے ، سر فرش زمیں، چرخ کہن کا سہرا
ماہ و انجم نے بنایا یہ کرن کا سہرا
سو دعاؤں سے ہے 'یہ لاکھ شگن کا سہرا
نہیں گلدستہء نسرین و سمن کا سہرا
ترے رخسار پہ ہے ' سارے چمن کا سہرا
رنگ و خوبی سے رخ لال کو شرماتا ہے
اور خوشبو سے ہے یکسر یہ ختن کا سہرا
آب دینے کو اسے موج چناب آئی ہے
خلد چنیوٹ سے آیا ہے بجن کا سہرا
عندلیبان گلستاں کی نوا خوب سہی
اور ہی رنگ کا ہے ، اہل وطن کا سہرا
اک عنایت سے مرے چرخ نے نو سال کے بعد
لا ہی ڈالا ہے زباں پر میرے من کا سہرا
آج جگدیش جو قرباں ہے تو بلونت فدا (25)
ماتا بہنوں کی دعائیں ہیں مدن کا سہرا
میرے ایشر کو خداوند سلامت رکھے
میری آنکھوں کا ہے تارا تو مدن کا سہرا
حضرت چرخ پہ ہیں ناز ہزاراں ہم کو
زیب دیتا ہے انہیں کیسے وطن کا سہرا
جو خوشی چرخ کی وہ خضر خوشی اپنی ہے
کیوں نہ ہم جھوم کے پھر گائیں مدن کا سہرا

☆☆☆

سہرا (26)

(امتیاز رفیع)

رفیع صاحب کو ہو مبارک ، یہ بزم رفعت نشان شادی
بندھا ہے اب امتیاز کے سر، کلاہِ عزت نشان شادی
یہ مظہر و امتیاز و پرویز ، اہل قانون و باخبر ہیں(27)
خدا کے فضل وکرم سے اپنے بڑوں کی مانند باہنر ہیں
ہے زیور علم سب کا گہنا، لباس قانون سب نے پہنا
کمال سب کا درست سننا ، درست لکھنا، درست کہنا
ہے علم وحکمت کی شمع روشن ، کہ نورہی نور انجمن ہے
کہ دین و دنیا کی نعمتوں سے [جو آج] بھرپور انجمن ہے
خدا نے چاہا تو لیں گے پورا حساب شوکت ہر ایک فن میں
عزیز امجد کے دم سے رونق بڑھے گی، یاروں کی اس چمن میں
سہیلیوں میں ہماری بیٹی مفتخر اور نامور ہے
وہ علم وحکمت سے بہرہ ور ہے، تو عقل ودانش میں سوبر ہے(28)
ہے خانہ آفتاب روشن نگاہِ بد سے خدا بچائے
ہمارے بھائی کو اورخوشیاں کرم سے اپنے خدا دکھائے
اگرچہ مدت ہوئی ہمارے سخن کی منقار زیر پر ہے
مگر یہ تقریب ہی کچھ ایسی تھی جس سے نغمہ سرا خضر ہے

☆☆☆

سہرا (29)

(ستیش کمار)

آج احباب کی ہیں ، بزم میں آنکھیں روشن
شانتی اور ستیش ہوگئے دولھا ، دلھن

ایک ہی برج سعادت میں نزول سعدین
اس خوشی میں ہیں ستاروں کی بھی آنکھیں روشن

حضرت چرخ کے گلشن میں بہار آئی ہے
وہ چمن جو کہ حقیقت میں ہے میرا گلشن

چرخ دہلی میں ہیں فرحاں تو میں چنیوٹ میں شاد (30)
ایک ہی مئے سے ہیں سرشار چناب اور جمن

تیرا سہرا ہے نیا اور میرا سہرا قدیم
چرخ کا سہرا ہے تو چرخ ہے محبوب وطن

چار چاند اس نے لگائے ہیں ادب میں ایسے
دلّی والوں نے بھی اپنایا یہ انداز سخن

پندرہ سال ہوئے جب میں ہوا زمزمہ سنج
جا کے دہلی میں سر محفل شادیء مدن

آج بھی کاش اسی طرح میں ہوتا آزاد
جس طرح مُشک ہوا ، چھوڑکے آہوئے ختن

پر لگا کر تیری محفل میں ، میں اڑ کر پہنچوں
اور آنکھوں میں بسا لوں میں تیرے سرو و سمن

سیّد انشا کا میں رہوار کہاں سے لاؤں
حاضری کھائے جو کلکتہ ، تو لندن میں ٹفن (31)

لیکن اے چشم تصور، ترے صدقے جاؤں
کر رہا ہوں میں تیرے زور پہ سب کے درشن
اک طرف سر پہ سپیدی لئے ہیں حضرت چرخ
اور ادھر فخر جوانی کے ستیش اور مدن
بے تکلف سبھی احباب ہیں آئے بیٹھے
جیسے چنیوٹ میں یاروں کا نرالا تھا چلن
جو پرانے ہیں انہیں یاد ہے، شاعر کا پتا
جو نئے ہیں، انہیں معلوم ہوگیا خضر کا فن
تیرے اس سہرے کو اللہ سلامت رکھے
تا قیامت رہے ان پھولوں کی ماتھے پہ پھبن
والدہ کو بھی مبارک ہو خضر کے ہاں سے
شاد و آباد رہے، چرخ کا پُر نور چمن

☆☆☆

دعوت نامہ (32)

(شادی)

یاوری بخت نے فرمائی ہے اک عمر کے بعد شکر ہے، آگئیں پھر ساعتیں، بابرکت وسعد (33)

حق نے دکھلائی ہے فرزند کی مجکو شادی لطفِ قادر سے ہے باران مبارکبادی (34)

آیئے رونقِ محفل کو دوبالا کیجئے فخر سے، سر کو مرے، عرش سے بالا کیجئے

خانہ منور میں جس طرح، سلیماں آئے اس طرح لوگ کہیں خضر کے مہماں آئے

باندھا فرزندِ جگر بند کے سر پر سہرا یہ معطر، یہ معنبر، یہ منور سہرا

ہے میرے دل کی تمناؤں کا پیکر سہرا باطنی میری دعاؤں کا ہے مظہر سہرا

☆☆☆

فرخ عزیز اثری کی دوسری سالگرہ (35)

وہ برکتوں بھرا دن ، پھر آج آگیا ہے   فرخ عزیز اثری دو سال کا ہوا ہے

ہے اس کے دم سے ٹھنڈا، ماں باپ کا کلیجہ   آنکھوں کا نور بن کر دل میں سما رہا ہے

حیراں ہوں، اس سے پہلے، آباد گھر تھا کیسے؟   اس کا وجود گھر کی رونق بڑھا رہا ہے

چپکے سے مسکرانا ، ننھا سا منہ بنانا   رو کر کبھی جگانا ، دل کو لبھا رہا ہے

علم و ادب کی اس کو آغوش مل گئی ہے   سائے میں روشنی کے ، بڑھتا ہی جا رہا ہے

ہو کر بڑا بنے گا ، یہ اور مرد نامی   آثار کہہ رہے ہیں ، وہ وقت آ رہا ہے

باغ عزیز اثری پھولے پھلے ہمیشہ   یہ نونہال جس کی ، زینت بڑھا رہا ہے

ہے آج یہ اکیلا، کل اس کے ساتھ ہوں گے   بھائی بہن جنہیں یہ آکر بلا رہا ہے

ساجد نعیم کا ہے ، ہدیہ یہی ترانہ
جو بزم تہنیت میں، پڑھ کر سنا رہا ہے

☆☆☆

حاجی میاں سلطان محمود (36)

کبھی اے قوم تیرا باغ وقف بہمن و دَے تھا
تیرے دل میں خمارِ نخوتِ اسکندر و کے تھا
پسند آئی تھی تجھ کو نیند، تو غفلت میں سوتی تھی
ستیزہ کار دنیا میں یونہی وقت اپنا کھوتی تھی

ترے آبا کی چمکیں مشرق و مغرب میں شمشیریں
حکومت اور سیادت تھی اُسی سفنے کی تعبیریں
نظر آتا تھا ناممکن تیرا اس خواب سے اُٹھنا
تجھے منظورِ خاطر تھا ہمیشہ نیند میں رہنا

کہ ناگہہ ایک رندِ لم یزل کی ہاؤ ہُو اٹھی
تجھے کچھ ہوش آیا، خواب سے غفلت کے تو اُٹھی
پلایا بھر کے اس نے بادہء وحدت کا پیمانہ
نیا تعمیر کر ڈالا اُسی سے ایک میخانہ

بہت سے تشنگان علم آئے، پی گئے اس کو
ہمیشہ کے لئے دنیا میں لے کر جی گئے اس کو
اسی اثنا میں اور اک خیر خواہِ ملت بیٹھا
ہماری قوم کی بگڑی بنانے کے لئے اُٹھا

اُسی کی ہمتِ عالی سے اپنی ڈوبتی کشتی
خدا کے فضل سے بدعات کے گرداب سے نکلی
اُسی نے پیشرو اپنے کی یہ کھیتی پیاری کی
نہالان چمن کی تا دم مرگ آبیاری کی

اس نے خلق سے اپنے جہاں تعمیر کر ڈالا
محبت سے ہمیں وابستہ ء زنجیر کر ڈالا
اسے اسلاف سے شاید ملا کچھ بہرہ وافر تھا
کہ بندوبست میں اسکول کے وہ خوب ماہر تھا
نہ ہوگی خضر ہمت کام ایسا کرنے والے میں
"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"(37)

☆☆☆

آہ! میاں سر فضل حسین (38)

اے دیدہء سیاستِ ہند اشکبار ہو
زیبا ہے ، لاکھ بار جو دل بیقرار ہو
رو ، اے قلم کہ تیرا وہ سردار چل بسا
اے عز و ناز تیرا وہ مرجع کدھر گیا
عقل و جنوں کے فرق کا اب کس کو ہوش ہے
فضل حسین آج لحد میں خموش ہے
یکتائے روزگار ، ہزاروں میں فرد تھا
ہندوستان بھر کی سیاست کا مرد تھا
تدبیر اس کی گرچہ جہاں میں تھی بے مثل
افسوس ہے ، نوشتہء تقدیر بھی اٹل
لوگوں کو اس سے گرچہ ہو سو بار اختلاف
ہے ، اس کی اہلیت کا زمانے کو اعتراف
اس بدنصیب قوم کا کیا پوچھتے ہو حال
ہو جس کے مہر و ماہ کو اس طور سے زوال
اس لہر سے رہا افقِ ہند تابناک
ہے ، آج وہ امانتِ ملت سپردِ خاک
حسن سلوک اس کا زمانے میں عام تھا
اور اس کے علم و شان میں کس کو کلام تھا
افسوس کوئی اس کا نہیں آج جانشیں
گو مدعی ہزار [ہوں] پر ایک بھی نہیں

اللہ اس کی روح کو دے جنت النعیم
اس کی مشامِ جاں میں ہے خلد کی شمیم
انصاری و شفیع کا تازہ ابھی تھا غم (39)
فضل حسین! آہ تیری موت ہے ستم
"ہر دم زمانہ داغ دگر بر جگر نہد
یک زخم نیک ناشدہ ، داغ دگر نہد"(40)

☆☆☆

فرخ محمود شہید (41)

شہیدوں کے مقدر میں ، حیات جاودانی ہے
وگرنہ زندگانی یوں تو آنی اور جانی ہے

اجر اچھا ہزاروں سال ، زاہد کی عبادت کا
نرالی شان رکھتا ہے ، مگر رتبہ شہادت کا

ہزاروں غازیان دیں ، گئے یہ آرزو لے کر
کہ جاتے سرخرو ہم بھی شہادت کا لہو لے کر

یہ ہے انعام ، جو سب کے نصیبوں میں نہیں ہوتا
کہیں آتا ہے حصے میں ، کہیں اکثر نہیں ہوتا

بزرگ قوم ہو ، یا نوجواں ہو ، سب کی عزت ہے
یہ جس خوش بخت کے حصے میں آجائے سعادت ہے

وہ ذات فرخ و محمود اسم بامسمّٰی تھی
کہ میدان وفا میں سرفروشی کی تمنا تھی

رفیق احمد کے کاشانے میں ، وہ نجم سحر چمکا
غروب ہوتے ہی جس کے آفتاب آبرو ابھرا

جبین ملک و ملت کا وہ رخشندہ ستارا ہے
کہ جس نے جان دے کر گیسوئے ملت سنوارا ہے

روایت سرفروشی کی ، وہ تابندہ جوانی ہے
نچھاور جس کی حرمت پر ، بزرگی کی کہانی ہے

وہ عزت خانداں کی دوستوں کی ، ملک و ملت کی
روایت کھینچی اپنی کی ، روداد شجاعت کی

دسمبر آٹھ پیدائش کا دن ، یوم شہادت بھی
اسی پر ابتدا اس کی یہی یوم شہادت بھی
دعا ساجد کی ہے تجھ پر رہے حسنینؑ کا سایہ
علی المرتضیٰؓ کا ، صاحب قوسینؐ کا سایہ

☆☆☆

موٹر اور بیل گاڑی کا مناظرہ (42)

مصلٰے اور رکنا باد فارس کے جگر پارے
نہیں ٹھنڈی سڑک لاہور کے رکھتے وہ نظارے (43)

ہوائے دشت واں سرگوشی لاحول لاتی ہے
صبا لیکن دماغوں میں یہاں پٹرول لاتی ہے

فلک سے برق گرتی ہے وہاں دہقاں کے خرمن پر
یہاں لیکن چمکتی ہے رہِ عشاق گلشن پر

یہاں ہر شام گو ہوتا ہے جاں افروز نظارہ
مگر کل ، مال تھی بستان جنت کا جگر پارہ

روش پر جا رہا تھا کوئی ڈالے باہوں میں باہیں
کوئی بھرتا تھا ان کو دور ہی سے دیکھ کر آہیں (44)

کوئی رک رک کے جب پسماندہ پلّے کو بلاتا تھا
تو کوئی اپنے ساتھی کو یہ نظارہ دکھاتا تھا (45)

کوئی نزدیک اپنے کہہ رہا تھا یوں خدا لگتی
وہ دیکھو حُور کے پہلو میں ہے لنگور کی پھبتی

کوئی نا آشنا دنیا و مافیہا سے جاتا تھا
ہوا کے دوش پر بائیسکل کوئی اڑاتا تھا (46)

گلستاں سے کئی با چہرہ ہائے زرد آتے تھے
بکف کاپی و آہ سرد و سر میں درد آتے تھے (47)

کہیں راندے ہوئے سوسائٹی اونچی کے کھوتا می
پرانے سائیکلوں پر دے رہے تھے داد خوشگامی

کہیں حوا کی دو اک بیٹیاں دل کو لبھاتی تھیں
ہوا کی بیٹیوں کے دوش پر اڑتی سی جاتی تھیں

غرض ہر شخص کہتا تھا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوگا؟
غریبوں بیکسوں کا بھی خدا ہوتا تو کیا ہوتا؟

فراٹے بھرتی بھرتی آرہی تھی مست اک موٹر
کہ یکدم موڑ پر اک بیل گاڑی سے ہوئی ٹکر(48)

غضب تھا آکے ٹکرانا ہماری بیل گاڑی کا
مسلماں ہو گئیا جیسے بھوجن مار واڑی کا (49)

بگل دیکر لگی کہنے یہ موٹر باؤلی گاڑی
خداوند یسوع نے عقل تیری کس طرح ماری(50)

ترا سر پھر گیا ہے ، یا جنوں تجھکو ہوا کیا ہے
بتا تو ہی کہ گستاخی تری کی اب سزا کیا ہے؟

اری تو مال پر جائے اور ایسی سخت سردی میں
بتا تیرا نہ ہو چالان کیوں آوارہ گردی میں (51)

نہ ٹھہری ، اور نہ کچھ جھجکی ،رکی کچھ اور کچھ ڈولی
دہان زخم پنچر سے مگر کی آہ ، اور بولی! (52)

مرا وہ رنگ و روغن سینکڑوں کا جس پہ دل آئے
خرام ناز سے میرے پری کا دل دہل جائے (53)

عطا مجھ کو ہوئی تیزی و چستی باز رفتاری
تو میری چال پر صدقے تو میرے حسن پرواری (54)

میرے بیٹے بھی ، اللہ رکھے ،آفت کے ہیں پرکالے
''ہمیں چوگاں ہمیں گوئے''تو ان کی گرد کو پالے (55)

حقیقت میں یہ بیٹا سائیکل گو کل کا بچہ ہے
مگر تیزی میں پرواز تخیل کا بھی چچا ہے (56)

یہ موٹر سائیکل لیکن جہاں میں چیز ہے گویا
ترا تانگا تو اس کے سامنے اک ہیز ہے گویا(57)

مرے قدموں میں ٹمبکٹو ہے، لندن ہے جاپان ہے
"خود افروزم چراغ راہ خویشم" اپنا ماٹو ہے(58)

کیا تیزی کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گذاری عمر سستی میں مثال نقش پا تو نے (59)

تری بے مائگی کا ایک ہی لمحے میں دم نکلے
اگر اک پرزہ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے (60)

یہ طعنے بیل گاڑی نے سنے تو خوب کنکھارا
"ثنائے خود بخود گفتن نزیبد مرد دانا را"(61)

کہا، کرتا نہ تھا افسوس کالج میں تجھے داخل
ہمیں معلوم کیا تعلیم کا الحاد ہے حاصل (62)

مجھے معلوم ہے اب کے ہوئی تو پاس ایف۔اے میں
ابھی یہ طور ہیں تیرے تو کیا ہوگی بڑھاپے میں(63)

میں تیری نانی اماں ہوں مجھے پہچانتی بھی ہو
میں تیرا منبع و ماخذ ہوں مجھ کو جانتی بھی ہو

وجود اپنا اگر ہوتا نہ اس دنیائے فانی میں
تو یکدم آپ کیسے آگئی ہوتیں روانی میں

اری ہاں ناز ہے اس برق رفتاری پہ گر تجھ کو
دکھا کچی سڑک پر دشت میں کرکے سفر مجھ کو(64)

تری تیزی نہیں ہے جلد بازی بیوقوفوں کی
خصوصیت ہے دنیا میں تمہیں سے فیلسوفوں کی(65)

سرِ رہ سینکڑوں کی پگڑیاں تو نے اچھالی ہیں
بظاہر آپ اگرچہ سیدھی سادھی بھولی بھالی ہیں (66)

تصادم میں کئے برباد لاکھوں تیز گامی سے
خدا محفوظ رکھے آپ کی اس بدلگامی سے (67)

خراب اک بار ہو جائے تو بنتی ہے مہینوں میں
"تو وہ مئے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں" (68)

مگر ہے ایک میرا ظاہر و باطن زمانے میں
ہوں یکسر سادگی ہی سادگی اس کارخانے میں (69)

ملی شب کو سیاہی اور ضیا مہ کو ستاروں کو
ملا عزم مصمم اک مجھے اور کوہساروں کو

بڑی بی مجھکو دیمی دیمی اپنی چال اچھی ہے
بالفاظِ دگر یہ شانِ استقلال اچھی ہے (70)

اسی رفتار پرجاتی ہوں مال و کوہ و صحرا میں
مزاحم ہو نہیں سکتے کبھی کانٹے مری راہ کا

نہ غم پٹرول کے تھڑنے کا، نئے کانٹے کا کھٹکا ہے
بڑی بی یاں تو وہ جیتا جو پکا اپنی ہٹ کا ہے

کہ گاڑی بان کے قدموں پہ یکایک آگرا کوئی
ڈرائیور تھا کہ چاہتا تھا ملے یاں آسرا کوئی (71)

کہا اس نے کہ بندے پر ذرا اتنا کرم کیجئے
مری موٹر کو پیچھے باندھ کر گاڑی کے رم کیجئے

کہ پاؤں اس تلنگے کی کشاکش سے تو چھٹکارا
نہیں میرے لئے بے آپ کی ہمت کوئی چارا (72)

اٹھا وہ محسنِ عالم اٹھا وہ سب کا ان داتا
وہ پیکر ہمتِ عالی کا مرجع پیر و برنا کا

وہ بھولا بھالا دیہاتی وہ زینت دشت و صحرا کی
بھٹکتی بھی نہیں بھولے سے جس کے پاس غمنا کی

لیا موٹا سا رسّا اور موڑ سے اسے باندھا
کیا گاڑی سے پھر پیوست اور بیلوں کو دے ہانکا (73)

پھر اس ماں کی طرح لے آئی گاڑی کھینچ موڑ کو
پکڑ کر چوٹی سے لائے جو نافرمان دختر کو (74)

یہی آواز پھر گونجی اندھیرے اور اجالے میں
"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

☆☆☆

حقے اور سگرٹ کا مناظرہ (75)

ابھی کل شب میں فکر خواب میں تھا
کہ آنکھوں نے عجب دیکھا تماشا
پڑے تھے انس و جاں مدہوشیوں میں
عجب اک خوف تھا خاموشیوں میں (76)
میں سونے کے لئے بس تل رہا تھا
ابھی حقے کو پی پی کر ہٹا تھا (77)
نہ اوڑھی تھی ابھی میں نے رضائی
کہ ڈبیا سگرٹوں کی کسمسائی
لگی کہنے کہ سن حقہ برادر !
مرے ماں باپ ہوں قربان تم پر(78)
میرے بیٹے یہاں سگرٹ کو تم سے
سنا میں نے کہ ہیں چند ایک شکوے
نہیں میں چاہتی تم میں لڑائی
کہ وہ بیٹا مرا اور تو ہے بھائی
یہ کہہ کر اس نے سگرٹ کو بلایا
ز راہِ امتثال امر آیا !(79)
لگا کہنے وہ حقے سے کہ ماموں
مجھے بخشا ہے اللہ نے وہ افسوں
کہ ہوں اس دور میں تہذیب کے میں
نشتہ ہرکس و ناکس کے منہ میں(80)

کوئی ہندی کہ ایرانی فرنگی
نیا تثلیث کا فرزند ، بھنگی
سبھی نے رشتہء الفت مجھی سے
ہے جوڑا دیکھنا کتنی خوشی سے(81)

" سرو بیٹیت باہم ناموافق
بقربان سر گورِ منافق "(82)

تناسب دیکھنا اعضا کا میرے
دھواں میرا ہے جوں نازک پھریرے (83)

ہوا میں صورت گیسو پریشاں
مرے عشاق کو ہے راحت جاں
تماکو کا کوئی عادی اگر ہو
مگر دل میں کہیں خوف پدر ہو (84)

تو اس کی آرزو چپکے سے پوری
کیا کرتا ہوں وقت نا صبوری
نہیں چغلی تری مانند کھاتا
نہیں ہنگام دم میں گڑگڑاتا

نہ پانی پیٹ بھر پینے کی حاجت
نہ سر پر آگ رکھنے کی ضرورت
مجھے تم دور سے آتش دکھاؤ
مزے سے بیٹھ کر پھر کش اُڑاؤ

میسر ہے مجھے صاحب کی صحبت
عیاں ہے مجھ پہ قدر و قیمتِ وقت
جو دیتا کام ہے مکتب میں ڈنڈا
وہی دیتا ہے گاڑی میں یہ بندہ (85)

ہوں یونیورسٹی کے نور دیدہ
نشے کے ٹوٹنے سے گر کبیدہ
ادا کرتا ہوں میں حق رفاقت
کیا کرتا ہوں ٹھیک ان کی طبیعت
اجی اب بوریا بدھنا سمیٹو
یہاں سے بستر اقدس لپیٹو
تمہاری ہو چکی بگلے سی ڈاڑھی
ہوس رہنے کی ہے یاں پھر بھی باقی
گزشت آں دور جدوجہد مجنوں
"بروکہ ایں بہ مایاں است اکنوں" (86)
نہ جانے سگرٹوں نے بے محابا
وفورِ بے خودی میں کہہ دیا کیا
جو دیکھی حضرت حقہ نے یہ بات
کہ بردے نے دکھائے اور ہی پات(87)
بزرگانہ ادا سے مسکرایا
عجب دلکش صدا سے گڑگڑایا(88)
لگا سگرٹ سے یوں کہنے کہ منے
ذرا دیکھو تو منہ میں دانت ہیں کتنے (89)
تجھے ہے بھونکنا جس نے سکھایا
اُسی کو تو نے وائے کاٹ کھایا
ترا مجھ سے تقابل بھی ہے یونہی
کہ جیسے ہوسٹل اور گھر کی روٹی
بھلا تجھ کو ہے مجھ سے واسطہ کیا
غبارِ رہ کو منزل کا پتا کیا(90)

خجالت کش ہوئی مینا کی قلقل
مری حق حق کے آگے صورت گل (91)
ملی ادراک کو پرواز مجھ سے
ملا محفل کو سوز و ساز مجھ سے

تجھے ہے کرمک شب تاب رہنا
مجھے مہتاب بن کر ہے چمکنا (92)
بھرا میں سرخ انگاروں کا چولہا
تو میرے سامنے تنہا شرارہ (93)

ستارا صبح کا تو ، مہر ہوں میں
تو اک ناچیز قطرہ ، بحر ہوں میں
تمہیں کو ہو مبارک یہ خموشی
کسی کے ہاتھ میں حیرت فروشی (94)

نہیں یہ زندگی مستور رہنا
بھلا اس سے تو ہے مخمور رہنا
بلا شور و شغب کے زندگی کیا
نجوم آسا تری تابندگی کیا

نہیں تو محفل آرائی کے قابل
نہیں بلکہ خود آرائی کے قابل
وہ گردش ، گردش ایام کے ساتھ
وہ کاوش ، کاوش انجام کے ساتھ

میری قسمت میں ہے جلنا جلانا
الگ دنیا سے تجھ کو سر کھپانا
نرالی چیز ہے میرا سر و پا
تجھے ان نعمتوں سے واسطہ کیا

مری ٹوپی بسان تاجِ زریں
فروزاں ہے مثالِ ماہ و پرویں(95)

گلے میں ہار یہ میرے نہیں ہیں
ہجوم خلق کے تارِ [نگیں] ہیں(96)

"چوں سرو نازِ من افراخت قامت
جہاں پُر شد زِ غوغائے قیامت"

مرے سیمیں بدن پر ہیں لپیٹے
کسی کی زلف کی مانند دھاگے

کسی نے دیکھ کر جن کو کہا تھا
وفورِ بے خودی میں کہہ اٹھا تھا

یہ چوری بدست ایں نگارے
بشاخِ صندلیں پیچیدہ مارے(97)

مجھے بھی حق نے بخشا ہے وہ افسوں
کبھی میں گڑگڑی گہ پیچواں ہوں(98)

کبھی سب مجھ کو ہتے ہیں چھوڑا
پیو جتنا بھی حقہ سو ہے تھوڑا(99)

کہا کیا؟ جو نہیں خوفِ پدر سے
کبھی تمباکو پیتے ان کو تم سے(100)

مراسم ہیں پرانے ، جان پہچان
قدیمی ہے اگر تو اے مری جان(101)

بھلا تم اور یوں مجرم سے بچ پر
مری مانند ہوتے کاش بچ پر

مجھے ان بزدلوں سے واسطہ کیا
تم ان کے ہو تمہارا پوچھنا کیا

اگر تم کو میسر ہیں وہ صاحب
تو کافی ہیں مجھے بھی شیخ صاحب(102)
ہوئے کالج کے لونڈے بیت کس کے
تجھے پی کر دیا پھینک اور کھسکے
بزرگوں سے یہاں اب دل لگاؤ
مراسم ظاہری پر تم نہ جاؤ(103)
کہا مجھ کو کہ اب بستر لپیٹو
یہاں سے بوریا بدھنا سمیٹو(104)
بڑی بات اور چھوٹا منہ کیا خوب
تمہیں کس قدر خود رائی ہے مرغوب(105)
تمہیں کہنا تھا یہ فقرہ تو میں نے
مگر دہرا دیا ہے مجھ پہ تم نے(106)
سنو گر جانِ بابا کچھ روایات
تمہیں معلوم ہو میری بھی اوقات(107)
چلا آتا ہوں نسلاً بعد نسلاً!
تمہاری زندگی ہے بلکہ اک دن
جو دیکھا میں نے سگرٹ بجھ گیا تھا
زمیں پر راکھ سا نیچے پڑا تھا
مگر ویسے ہی حقہ گڑگڑاتا
دعائے فاتحہ واں پڑھ رہا تھا

☆☆☆

چائے اور لسّی کا مناظرہ (108)

تشریف لائے حضرتِ راشد جو ایک شام
دعوت کا جان و دل سے کیا میں نے اہتمام(109)
گزرا تھا ایک سال. کہ باہم ملے نہ تھے
اتنا زمانہ ، شانِ خدا ہم ملے نہ تھے
قدرت خدا کی تھی کہ وہ آئے تھے میرے گھر
جاتی تھی گھر پر اور کبھی اپنے پر نظر
گرما کے باوجود ، وہ تھی شام خوشگوار
آمد سے ان کی میرا بڑھا لاکھ افتخار
ہے گرچہ ناگزیر اگر بدنصیب ہو
یارب مگر کلرک نہ کوئی ادیب ہو
رہتا تھا جو تخیّل و مضموں کے زور میں
ہے آج خشک مسلوں سے وہ زندہ گور میں
چوسا ہوا جو خوں ہے تو پچکے ہوئے ہیں گال
اے صحت و شباب کلرکی کا یہ مآل
آئی یہ میرے جی میں کہ ہے گو قریب شام
ہو کچھ تو چائے پانی کا اس وقت انتظام
لسّی سے آئی کوری سی ڈولی بھری ہوئی
اور گھر سے آئی چائے "ٹرے" میں دھری ہوئی
اک دوسرے سے ہم تھے یونہی محوِ گفتگو
اتنے میں آئی کان میں آوازِ ہاؤ ہُو

چائے ابل کے لسی سے کہتی تھی دور ہو
جا اور جاہلوں کے دلوں کا سُرور ہو
پینے کی چیز ہے کوئی تو بھی جہان میں
پڑتی نہیں ہے کھانڈ بھی جس کی اٹھان میں
پلتا ہے میری گود میں حکام کا دماغ
طبع علیل ہو میرے پینے سے باغ باغ
انڈے ہوں گرچہ اور مٹھائی کا ڈھیر ہو
لیکن میرے بغیر طبیعت نہ سیر ہو
روٹھے جو کوئی یار ، چائے پہ اس کو بلائیے
اس کو بٹھا کے پاس عدو کو جلائیے
یارانِ کاشمر کو اگر میرا شوق ہے
حورانِ نجد کو میرے قہوے کا ذوق ہے
پیرس کے دلبروں کو بھی مجھ ہی سے پیار ہے
لندن کے گلرخوں کی مجھی سے بہار ہے
کر دوں میں سرخ، ہو کے لب لعل کے نصیب
کالی گھٹا بنوں ، جو ہوں مونچھیں میرے قریب
مٹی کے برتنوں میں تیری عمر کٹ گئی
اس سے رہی سہی تیری توقیر گھٹ گئی
چاندی کے سیٹ میں اپنا نشیمن ہے آج کل
چمچے سے عام جلوہء ایمن ہے آج کل
میرا جو لطفِ خاص زمانے میں عام ہے
ہر شخص میری چاہ کا دل سے غلام ہے

اکسیر ہوں عجیب میں درد اور زکام کو
کرڈوں ہوا ابھی میں تھکاوٹ کے نام کو

منہ بھی نہیں لگاتے مجھے جو نجیب ہیں
پیتے ہیں بس وہی جو کہ یکسر غریب ہیں

ٹھنڈک سے میں ہٹاتی ہوں گرمی کے راج کو
اور سردیوں میں گرم میں کردوں مزاج کو

مکی یا باجرے کی ہے روٹی سے تیرا میل
ہے میرے ساتھ کیک مٹھائی کی ریل پیل(110)

ہم قافیہ زبسکہ ہے، یہ لفظ ہائے کا
عشاق کے ہے، ورد زباں نام چائے کا

میں شاعر وہ ادیب کے دل کا سُرور ہوں
ارباب سلطنت کے دماغوں کا نور ہوں

اُن کے قلم کی ساری جوانی مجھی سے ہے
اُن کی زباں کی ساری روانی مجھی سے ہے

ٹی پارٹی کسو میں جو میہماں جایئے
''صد جلوہ رو برو ہو، جو مژگاں اٹھایئے''(111)

قرباں ہزار جان سے مجھ پر ہوئی شراب
جس کا ہوں رنگ وبو سے زمانے میں مَیں جواب

بیٹی ہے بالضرور تو دریائے نیل کی
صورت خدا دکھائے نہ تجھ سی رذیل کی

کرنے لگی جو بھاپ کے گولوں سے چائے فیر
لسی زبان حال سے بولی الٰہی خیر(112)

برہم ہے آج زلف کی صورت مزاج یار
شریں لبوں پہ ہے، سخن تلخ بار بار

آپ اور مجھ سے، روئے سخن یوں ہے بے نصیب
بن جاؤں رشک سے نہ میں اپنی ہی خود رقیب

گو از رو عتاب ہے، وہ بولتے تو ہیں
تلوار میرے قتل پہ وہ تولتے تو ہیں

ہو آپ سے مقابلہ کیا مجھ غریب کا
جس کو نہیں ہے شہر سے رشتہ قریب کا

میں یوں شکر سے پیار رکھوں کس لئے روا
"آمیز شے کجا گہر پاک او کجا"(113)

حکام مست آپ پہ ایسے تمام ہیں
جو خود غریب اور کسی کے غلام ہیں

مردانِ حر جو دہر میں ہیں آسماں وقار
رکھتے ہیں بالعموم وہ سارے مجھی سے پیار

قبچاق و یزد و خطۂ پنجاب ایک ہیں
اس جا پہ ایک وادی و صحرا و ڈیک ہے

پنوں ہو شاد جس طرح سسی کے نام سے
یونہی جگر میں ٹھنڈ ہو لسی کے نام سے

برتن کوئی ہو، کام سے یاں اپنے کام ہے
لپٹی ہو جس میں تیغ وہی شے نیام ہے

چاندی کے سیٹ میں آپ کو جا کر بٹھایئے
گویا عروسِ زشت کو زیور پہنایئے

ہیں دلبرانِ دہر کی آنکھیں حضور پر
جو بارہا پڑی ہیں دل ناصبور پر

پر مجھ کو گھر سے کھیت کو لاتے وہ چاند ہیں
جن کے شباب و حسن کے آگے یہ ماند ہیں

ارکانِ سلطنت ہوں کہ ہوں شاعر و ادیب
اس میں نہیں کلام، ہیں سب آپ کے حبیب
پر مہوشوں کی طرح، یہ سب اہل قال ہیں
اور آپ ان کی نامِ خدا ہم خیال ہیں
ہے آپ کا بحیرہء احمر ہی بس پدر
ڈوبا جو کوئی آپ میں اُبھرا نہ عمر بھر
مشکل ہے دید آپ کی جب تک جلے نہ آگ
اور کیتلی میں جوش سے بڑھ کر اٹھے نہ جھاگ
یاں پانی اور دودھ کو لے کر بلوئیے
پھر اپنے داغ ہائے جگر، مل کے دھوئیے
دیکھے مجھے جو طالب سیلابِ نور ہو
چاندی کی نہر پائے جو میرا ظہور ہو
اتراؤں کیوں نہ رنگِ رخ یاسمیں پہ میں
اتری ہوں بن کے چاند سی گویا زمیں پہ میں
کالی گھٹا کی طرح کوئی ہو کہ مثلِ برق
آئے نہ ان کے قرب سے رنگت میں مری فرق
گر آپ سے طبیعت کاہل کو میل ہے
قند و نبات و شیر و نمک کا یہ کھیل ہے
کام آپ کا چلے نہ کبھی دودھ کے بغیر
اے عشوہ گر، منا، میرے بابا کے سر کی خیر
ہوتے ہیں سیر پینے سے میرے وہ سب دماغ
جلتا ہے تیل جن سے [جونہی] آپ کا چراغ(114)
روٹھے خدانخواستہ مکھن اگر کہیں
ہو جائے تنگ آپ پہ یہ وسعتِ زمیں

رہتی ہے کوسوں دور میرے نام سے بھی پیاس
ہو جیسے خشک کھیت کو ہر موجہ بیاس
تیرے پڑھے لکھے میرے جُہال پر فدا
جن کو نہیں خبر کہ ہے محنت میں لطف کیا

چائے یہ بات سنتے ہی بس سرد پڑ گئی
گویا زمیں میں شرم و خجالت سے گڑ گئی
لسّی میں تھی وہی ٹھنڈک وہی سکوں
جو کوئی دیکھ پائے وہ چاہے ابھی پیئوں

فرما رہے تھے حضرت راشد کہ لیجئے
باتوں میں چائے ہو گئی ٹھنڈی نہ پیجئے
لسّی بیاد تشنہ لب کربلا پیو
اور چائے پینے والوں سے بڑھ کر سَوا جیو

چائے ابھی تھی گرم ابھی ہوگئی ہے سرد
رکھتے نہیں ہیں رنگ کبھی وہ جواں مرد
آخر وہی پہنچتے ہیں اوج کمال پر
جو مستقل مزاج رہیں، ایک حال پر

☆☆☆

میم اور بیگم کا مناظرہ (115)

یہ زمیں اور یہ سورج یہ فلک اور یہ ماہ
حق کے کیا جلوے بیاں کیجئے، سبحان اللہ
یوں تو ہر چیز میں صنعت ہے مدلل اس کی
پر یہ صناعی ہے آنکھوں پہ مکمل اس کی
آنکھ ہی دیکھتی ہے قدرت حق کا جلوہ
ہے یہ دنیا سے تعلق کا اکیلا رشتہ
آج تک دیکھ چکی گر یہ ہزاروں نقشے
پر جو نظارہ یہ اب لوٹ چکی ہے بل بے
بزم تعلیم خواتین کا چھڑا سلسلہ کل
خلد، دوزخ کدہء دہر میں! اے جل وجل
کہیں شرمائی سی بیٹھی ہوئی لیلے سارہ
کہیں بلبل سی چہکتی ہوئی ڈورا، لارا (116)
اک طرف حاجب رخسار دل افروز نقاب
مضطرب ایک طرف پائیں کسی کے سیماب
تھی یہاں غنچہ صفت بارش الطاف و کرم
اور وہاں صورت گل صاف صدائے ویلکم
بحث کے دور میں چہرہ جو کسی کا نکھرا
میں یہ سمجھا ابھی شیرازہء عالم بکھرا
سر بزم ایک نے یوں شیشہء تقویٰ توڑا
راہ تعلیم میں ہے پردہء مشرق روڑا

ایک بیگم سے مخاطب ہوئی یوں جوش سے میم
اس زمانے میں بھی وہ پہلے خیالات ہیں شیم

اُف نئی روشنی میں اس قدر اندھیر غضب!
کولھو کے بیل کی صورت ترا یہ پھیر غضب

میں ہوں اس گلشن آفاق میں اک گل کی طرح
اور تو قید میں دیوار کی بلبل کی طرح

میں نے تقریر سے شوہر کو کیا تابع حکم
اپنی تہذیب کے ہاتھوں رہی تو "صم" بکم

وہ تو خیر اپنا وطن ہی ہے دیار لندن ق
پھر بھی میں دیکھ چکی پیرس و روم و لزبن

ماسکو میں رہی میں شمع کلیسا برسوں
ٹوکیو میں بھی رہی ہمرہ پاپا برسوں

اور پھر اب کے برس دیکھ لی میں نے دلّی!
میں تھی اور تھے مرے ہمراہ دُلارے بلّی!

"دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے میں نے"
نیلگوں چرخ پہ دوڑا دیئے گھوڑے میں نے (117)

بہر گلگشت نکل جاتی ہوں ہر شام و سحر
کبھی پیدل، کبھی تانگے میں، کبھی موٹر پر

اس سے صحت پہ اثر پڑتا ہے اچھا بیگم!
لطف کا لطف، تماشے کا تماشا بیگم!

تجکو سرمایہ عشرت ہے یہ چرخے کا وبال
اور مجھے ٹینس وٹی و ڈنر و میوزک و بال

اس پہ طرہ ہے کہ اخبار سے الفت ہے مجھے
خاص کر پنچ سے حد درجہ محبت ہے مجھے (118)

چائے کے بعد پیانو پہ بھی گا لیتی ہوں
وائلن بھی کبھی تھوڑا سا بجا لیتی ہوں

یہ صلہ پیروی حکم مسیحا کا ملا
کہ مجھے حصہ بہت سا دم عیسے کا ملا

ایک محفل میں جو ہو شہر خموشاں کی طرح
میں اگر جاؤں تو جی اٹھے گلستاں کی طرح

گھر میں بھی مانی نہیں جاتی تری آہ غریب
پارلیمنٹ میں ہے رائے دہی مجکو نصیب

بٹلر اور بیرے بھی گو کہتے ہیں سرکار مجھے
پر دل و جاں سے کیا کرتے ہیں سب پیار مجھے

تیری قسمت میں ہے گلقند و عرق و شکر
میرا حصہ کوئی ٹانک یا برانڈی و بیئر

مس مینو ہی کی زبانی ، ہے کی میں نے یہ نقل
مشورہ تجھ سے نہیں خوب تو ہے ناقص العقل(119)

تو ہے اک گوشے میں دلدادہء تمجید و درود
میں ہوں اور چرچ میں ہنگامہء آہنگ و سرود

میز سے اتنے میں آپہنچی صدائے ٹن ٹن
''عہد گل ختم ہوا ، ٹوٹ گیا ساز چمن''(120)

کہا بیگم نے کہ ہے آپ کا فرمان بجا
آپ نے دیکھ لیا اٹلی و جاپان بجا!

آپ کی جو بھی عبادت ہے وہ ہے ساز کے ساتھ
چرچ میں آپ کا سر جھکتا ہے پُرناز کے ساتھ

آپ کے دوست تو کہتے ہیں اسے ناز و ادا
یہ وہ گستاخی ہے حق سے کہ جو ہے حد سے سوا

چرخ پر جا کے اڑیں ، ناپ چکیں ساری زمیں
کہیں تسکین دل و جاں نظر آئی کہ نہیں

او سر گلشن و جم خانہ چمکنے والی
تودۂ سیم پہ بھوکوں سی لپکنے والی

تربیت رکھتی ہوں میں گرچہ جہاں گرد نہیں
آپ کی طرح سے آنکھوں میں مری گرد نہیں

آپ کوری ہی رہی ہیں سفر چلی میں
بھاڑ ہی بارہ برس جھونکی ہے کیا دلی میں

آپ کے دم سے ہی یہ گرمئ بازار سہی
آپ سیاح سہی عرش کی سیار سہی

پر ذرا اڑتی ہوئی اور پرے بھی جائیں
چرخ سے حضرت عیسےٰؑ کی خبر بھی لائیں

ہے مگر عیسےٰؑ و مریمؑ کا فقط نام ہی نام
چرچ میں آپ کو سازوں کے بم وزیر سے کام

میرے ورثے سے کسی شخص کو انکار نہیں
آپ کی طرح میں رسوا سر بازار نہیں

خانہ داری کا سلیقہ ہے نہ بازار کا علم
آپ بس چاہتی ہیں دیکھیں کوئی خوب سی فلم

یہ بھی پڑھتی ہیں کبھی صفحۂ اخبار میں کیا
بھاؤ ہے چاپ کا اور انڈوں کا بازار میں کیا

پارلیمنٹ کی ممبر بھی اگر آپ بنیں
غیر ممکن ہے کہ آپ اور سر میدان لڑیں

آپ کیا چیز ہیں واں سینکڑوں رہ جاتے ہیں
اعتراضات کے طوفان میں بہ جاتے ہیں

اور اکثر رہی میں زینت اورنگ جہاں
تاب کیا میرے خلاف ایک بھی ہل جائے زباں

سر تسلیم اشاروں پہ مرے ہوتے تھے خم
میرے دربان تھے فغفور و سلاطین عجم

فخر شوہر پہ مجھے اس کو مری ذات پہ فخر
مجکو اللہ کی صد گونہ عنایات پہ فخر

اورصاحب ترا ، شاکی ، تو ہے صاحب سے نفور
آہ بیگانوں کے نزدیک ، یگانوں سے ہے دور

دے کے ڈبے کا جسے دودھ ، کھلائیں نرسیں
اس کی آنکھیں مگر امی کے لیے کیوں ترسیں

جب ستم ڈھانے پہ یہ دور زماں آتا ہے
لب مظلوم پہ بے ساختہ ماں آتا ہے

آپ کو خیر سے پروا نہیں کچھ شوہر کی
مری اک بات پہ کٹ جاتی ہے سارے گھر کی

میں جو ناموس ہوں شوہر کی ، وہ سرتاج مرا
قائم اک شخص کے بل بوتے پہ ہے راج مرا

ہے مری ذات حقیقت میں چراغ خانہ
پھول بلبل مرا اور شمع مری پروانہ

غیر محرم جسے بالکل ہی نہ گھوریں میں ہوں
جس کی عفت کی قسم کھاتی ہیں حوریں میں ہوں

مالکہ گھر کی ہوں ، بھوکی سہی ، محتاج سہی
ایک ہی کٹیا میں محدود مرا راج سہی

مفلسی میں بھی مری رہتی ہے ہمت عالی
آپ کا اب بھی ہے تسکین سے دامن خالی

آپ کی مادہ پرستی سے جب اٹھے گا نقاب
ہو گا بے ساختہ پھر وردِ زباں کنت تراب
طرزِ گفتار پہ بیگم کی میں ڈر سے کانپا
صدرِ جلسہ نے بھی اس موقع پہ خطرہ بھانپا
ابھی آدھی نہ بجی تھی ہوا جلسہ برخاست
شور کشتی و زدی از تہ دل ہا برخاست(121)
ان کو برقعے نے بچایا جو چلی سرد ہوا
ایسی سردی میں بدن میم کا لیکن ٹھٹھرا
جھوٹ سچ جانے ازل سے ہے جو علام خبیر
ہم کو ہر بات میں بیگم کی ملی خیر کثیر
"حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد"(122)

☆☆☆
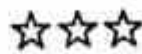
ہیٹ اور پگڑی کا مناظرہ (123)

یارو میری، آنکھوں نے جو دیکھا ہے تماشا
کرتا ہوں بیاں تم سے نہیں جھوٹ یہ حاشا (124)
اک دعوت احباب میں یکجا ہوئے کل رات
زہاد مناجاتی و رندان خرابات
کچھ مست مئے بادہ مغرب بھی وہاں تھے
تہذیب گزشتہ کے پرستار جہاں تھے
صاحب نے اوور کوٹ مع ہیٹ اتارا
زاہد نے بھی دے میز پہ دستار کو مارا
احباب جو مل بیٹھے تو چائے کا چلا دور
پھر باتیں نکل آئیں انہی باتوں میں کچھ اور
بدری سے کہا شیخ نے کیا بات ہے بھائی
ڈپٹی ہوا تو اور مٹھائی نہ کھلائی
لیتا تھا کوئی وعدہ و پیمان کسی سے
بس بولیو مت اب کے مری جان کسی سے
کرتا تھا کوئی رومی و اقبال کا چرچا
اور کوئی دل و جاں سے ملٹن پہ فدا تھا
اک گوشے میں بیٹھا تھا الگ سب سے گھسیٹا
خود بزم میں، دل در قفس گاما و تھیٹا
کرتا تھا کوئی تبصرے کالج کی فضا پر
القصہ تھا ہر کوئی رواں دوش ہوا پر

تھا پاس ہی واں میز پہ میں کہنیاں ٹیکے
یوں میں نے سنا ہیٹ کو دستار سے کہتے

میں وہ کہ میرے آگے بھرا کرتے ہیں پانی
تاج سر دارا و کلاہ ہمہ دانی

میں نوع بشر کے لئے بس ظل الہٰ ہوں
گر قدر مری جانو، بہ از بال ہما ہوں

اکثر ہوں چھڑاتی دفعہ چونتیس کی زد سے
لاتی ہوں بچا سب کو میں پولیس کی کد سے(125)

گر سر پہ میں نظارگیء انجم و مہ ہوں
بے لیمپ ہے سائیکل تو تری پشت پنہ ہوں

گر پاس نہیں کوڑی سفر ہے تجھے درپیش
لے نام خدا ٹانگا منگا، کر نہ پس و پیش(126)

ٹانگے سے کسی گاؤں میں جا پاؤں نکالو
فوراً ہی سبھی کاٹھ کے پتلوں کو بلالو

بیواؤں کی کچھ مردم بیکار کی باتیں
ان باتوں میں پھر چھیڑیئے کچھ پیار کی باتیں

گر بحث میں لے آئے کہیں قوم کی بہبود
سمجھو کہ کوئی دم میں بھرا دامن مقصود

اک رات وہیں کوفتہ و زردہ اڑاؤ
ہنگام سحر بدھو میاں گھر چلے آؤ

کچھ عرصہ گزر جائیگا آرام سے تیرا
صاحب کا کہیں بعد میں بن جائیو بیرا

اور یوں بھی ہوں ہر بات میں اعجاز دکھاتی
آنکھوں کو بچاتی ہوں بصارت کو بڑھاتی

دو گونہ فرائض کو سر انجام ہوں دیتی
گر ٹوپی کی ٹوپی ہوں تو چھتری کی ہوں چھتری

ڈی سینسی میری چال سے ، رفتار سے ظاہر
بد شکلی و بے قاعدگی تیرے عناصر

ہوں رنگ میں اور ڈھنگ میں دنیا سے نرالی
یورپ کا میں پودا میرا امریکہ ہے مالی

توقیر فراواں مری ، رتبہ مرا عالی
اک رشتے سے ہوں چتر شہنشاہ کی سالی

بیٹی ہوں فلالین کی ، قاقم کی بھتیجی
جاگیر میں مجکو ملے یوگنڈا و فیجی

پہلے تو انہیں سنتے ہی شرما گئی پگڑی
پھر غصے سے بھری ، کئی بل کھا گئی پگڑی

اُس غیظ کی حالت میں جو تھرّا گیا طرّہ
پنکھے کی طرح مور کے ، لہرا گیا طرّہ

کھنکھار کے گویا ہوئی ، کیا شان خدا ہے
آمادہء پیکار یہاں شہ سے گدا ہے

تو! اور مرے سامنے یوں ہرزہ سرائی
قسمت نے مجھے ساعت بد یہ بھی دکھائی

تجھ کو نہیں معلوم ، کہ میں کون ہوں کیا ہوں
تہذیب گزشتہ کی محافل کا دیا ہوں

دنیا میں ہوا علم کا چرچا تو مجھی سے
شعلہ تری تہذیب کا بھڑکا تو مجھی سے

دنیا میں مرے نام سے بٹتی ہے وراثت
ظاہر ہے مری ذات سے چہرے پہ شرافت

کس شان سے سر آنکھوں پہ ہیں مجھ کو بٹھاتے
جب قلعہ کشا جنگ سے ہیں لوٹ کے آتے
بالائے فلک پہنچی میں اک چشم زدن میں
ٹو پیچھے رہی تولتی پر ایزوپلین میں(127)
فی الحال ابھی بڑھ کے یہیں پہنچی تھی یہ بات
دستار کو دی ہیٹ نے زناٹے سے اک لات
دستار فضیلت نے بھی طرّے کو سنبھالا
دو پیچ میں بی ہیٹ کو لا فرش پہ ڈالا
یوں بولا کلاہ ہیٹ سے ، ہے ماہ جبیں تو!
سر میں ہے تیرے نخوت فرعون کی کچھ بُو
گو آئی تو نیلام میں گیلے سے لویں سے
بندہ بھی مگر آیا پشاور کی زمیں سے
اتراتی ہے کیا تجھ کو ابھی پیس کے رکھ دوں
اور چیر کے تیرے چچا ابلیس کو رکھ دوں
مشرق کو تو دیکھو ، یہ اچکا ہے کہیں کا
عاشق ہے یہ پیرس کی ہر اک ماہ جبیں کا
اس جنگ میں بی ہیٹ تو یکسر گئی رگڑی
اور فتح کے سہرے سے سرافراز تھی پگڑی

☆☆☆

سارنگی اور طبلہ (128)

دنیا بھر کے بے فکروں نے کل بزم سرود سجائی تھی
کیا دل کو مسلتا تھا طبلہ ، کیا سارنگی گھبرائی تھی(129)
بسمل کی رگ جاں بنتی تھیں، طاؤس کی تاریں لرزش سے
چائے کا پیالہ دور میں تھا حقے نے دھوم مچائی تھی
رندوں نے جھنڈے گاڑے تھے زاہد نے ڈیرے ڈالے تھے
اس دیر و حرم کی محفل میں ، موسیقی گانے آئی تھی
یاں اشکوں سے پُر سارنگی ، واں پیچ و تاب میں تھا طبلہ
گز بھر کی زباں یاں چلتی تھی واں ہاتھوں کی بن آئی تھی(130)
واں تھاپ کے ابر گرجتے تھے نغموں کی پھواریں پڑتی تھیں
یاں ہر دل پر موسیقی کے ، کہرے نے قنات لگائی تھی(131)
اڑتی تھیں فضا بھر میں تانیں تھی چال صبا کی مستانہ(132)
تقدیر سے بیچ میں دونوں کے جا بیٹھا شاعر دیوانہ
سارنگی بولی طبلے سے تم یونہی شور مچاتے ہو
اے منہ پھٹ طبلے دیوانے کیوں کان ہمارے کھاتے ہو(133)
آواز تمہاری کوے سی اور شکل چھلاوے سی تیری
ان میٹھی میٹھی تانوں کے، تم رنگ میں بھنگ ملاتے ہو(134)
لعنت ہے تمہارے جینے پر آرام نہیں عزت بھی نہیں
میں گودوں میں جا پلتی ہوں تم سر اپنا پٹواتے ہو(135)
ہے خام ابھی تک عشق ترا کچھ صبر نہیں کچھ تاب نہیں
یاں تان اڑی اک میٹھی سی واں تھام کے دل رہ جاتے ہو(136)

میں راج دلاری البیلی ناری ہوں پریم کنھیا ہوں
تم مونڈی کاٹے مردک ہو ہر جا پر دھکے کھاتے ہو(137)

تہذیب تمہیں منظور نہیں اور عقل کہیں دستور نہیں
تم بھیم کی تانوں میں کیوں آپے سے باہر ہو جاتے ہو(138)

نازوں سے پلی شہزادی ہوں میں ناری محلوں والی ہوں
تم حبس دوام کے قیدی ہو صندوقوں میں ڈٹ جاتے ہو(139)

جب سارنگی نے طبلے سے یوں دل شکنی کا کلام کیا
کچھ دیر تو وہ خاموش رہا پھر بھابھی جاں کس کو سلام کیا(140)

یوں کہنے لگا سارنگی سے جلتی پر تیل گراتی ہو
ہم رنج و الم کے مارے ہیں تم آکر اور ستاتی ہو(141)

عشاق سے منہ پھیرا کیوں پھر تم نے ہمیں آگھیرا کیوں
رہنے دو مجھے چپ مجبوراً کیوں میری زباں کھلواتی ہو(142)

میں زنجبار کا شہزادہ میدان میں آ کر ضیغم سا
جب ایک دہاڑ لگاتا ہوں تم پردوں میں ڈر جاتی ہو(143)

پیمان وفا جس سے باندھوں میں پاس اسی کے رہتا ہوں
تم ہرجائی ہو ہر اک کے پہلو میں دل بہلاتی ہو

کچھ لطف ہے سینہ کوبی میں سر پھوڑنے میں ہم مستوں کو
بی! یہ تو عشق کے زیور ہیں تم یونہی ہم کو بناتی ہو

عزت پہ ہماری حرف زنی! اللہ غنی اللہ غنی!
وہ وقت بڑی بی بھول گئیں جب کان اپنے کھچواتی ہو

تم پریم کنہیا محفل میں کس بے باکی سے گاتی ہو
گویا تم بھولی بھالی ہو، کچھ کہتے بھی شرماتی ہو(144)

میں تیری شمیم نغمہ کو مانند نسیم اڑاتا ہوں
یہ میری تھاپ کی برکت ہے دل بزم میں مسلے جاتی ہو

جب لڑکے مل کر گاتے ہیں عرفان کی تانیں اڑاتے ہیں
ہاتھوں سے میز بجاتے ہیں تم یاد کب ان کو آتی ہو

ہے ملکہ موسیقی سے مجھے نزدیک تریں تجھ سے رشتہ
ہم راہ پہ تجھ کو لاتے ہیں جب لے میں بھٹک سی جاتی ہو(145)

میں آذر عشق کی تابش سے، دل محفل کے گرماتا ہوں
طاؤس طنبورے کو تجھ کو دن میں تارے دکھلاتا ہوں(146)

یہ سن کر شمس الدین ڈرے تلوار مبادا چل جائے
یاں طبلہ تڑپتا رہ جائے سارنگی روتی رہ جائے(147)

چمکار کے سارنگی سے کہا تم سیدھی سادھی بھولی ہو
زیبا نہیں گر یوں منہ میں تیرے انجانوں کی سی بولی ہو(148)

طبلے کے وکیل مطلق نے واں ہاتھ سے اس کو سمجھایا
اچھا نہیں خوں کی لہروں سے گر محفل بھر میں ہولی ہو(149)

تم زنجبار کے شہزادے سارنگی سارنگی ٹھہری
پھبتی ہی نہیں شہزادوں کے گر ایسی بولی ٹھولی ہو(150)

خاموش ہوئیں بی سارنگی اور طبلہ "صم" "بکم" تھا
یوں جیسے کسی نے زباں اپنی کوثر کے آب سے دھولی ہو(151)

القصہ بچھڑے دوست ملے لے جھگڑا تھا نے شکوہ تھا
لے تن تنا تن تن، تن تھی لے تا کڑ تا کڑ دھنیا تھا(152)

☆☆☆

وکیلوں کی فریاد(153)

دنیا کی کوئی چیز بھی بہتر نہیں زر سے
افسوس ، ہے مفقود وہی اپنی نظر سے
دس سال ہوئے کھاتے ہیں ماں باپ کے گھر سے
بے فیس کے آنسو ہیں رواں دیدۂ تر سے
دل صاحب دینار سے انصاف طلب ہے
نائی کا بڑا آج وکیلوں سے ادب ہے

اترا کے بڑی شان سے کہتے ہیں زمیندار
از بسکہ وکیلوں کو ہے ہم سے ہی سروکار
ہم ان کے ہیں نعمت کے ولی اور ہیں سردار
باہر نہ کہے اپنے سے ہو "انجمن بار"
گر مشورہ دیں کوئی خلاف ان کی رضا کے
کہتے ہیں یہ قانون کو بیٹھے ہیں بھلا کے

حکام عدالت کی ہے یہ رائے گرامی
محتاج ہمارے ہیں پلیڈر جو تمامی
اس قوم کے افراد ہوں جس درجہ بھی نامی
ان سے اسی نسبت سے کرو سخت کلامی
اس طور سے بل ان کا نکل جائے تو اچھا
جی ان کا وکالت سے بھی چل جائے تو اچھا

ارشاد موکل کا ہے ' یہ میرے کرم سے'
محفوظ ہوئے آپ سبھی پیٹ کے غم سے
ریڈر کو یہ دعویٰ ہے ' مرے فیض قلم سے'
کشتی جو وکالت کی لگی پار ہے یم سے

محسن ہیں ہزار اور ہے اک جان ہماری
ہو جائے گی مشکل کبھی آسان ہماری

مانگیں جو روپے ایک موکل سے پچھتر
وہ کہتا ہے گر پانچ ہی لے لو تو ہے بہتر
منشی کا اشارہ ہے یہ جائے نہ نکل کر
غیرت کے تقاضے میں ہے یہ خاک برابر
سوچا کہ مگر گھر میں ہے فاقوں ہی کا سایا
پانچوں ہی کے لینے کو ادہر ہاتھ بڑہایا

پتلون بھی ہے اور اوور کوٹ بھی بر میں
برکت ہے مگر لطف خداوند سے گھر میں
اور اس پہ ہے انٹر کا ٹکٹ اپنی نظر میں
ہوتے ہیں بہت رنج وکیلوں کو سفر میں
دیکھے نہ ہمیں تھرڈ میں کوئی یہ ہے وسواس
افلاس کے احساس میں رتبے کا بھی ہے پاس

بی بی جو ہے اس پاس نہ گہنا ہے نہ پاتا
خود ہاتھ میں کالج کے زمانے کا ہے چھاتا
درپیش اسی سال ہے بیٹی کا بھی ناتا
اے صبر توقف کوئی مل جائے گا داتا
بن جائیگی بگڑی بھی کوئی بات نہیں ہے
آخر یہ وکالت ہے حوالات نہیں ہے

آ تو نے بڑی دیر میں ہے شکل دکھائی
اے زر تری آمد نے خوشی اپنی بڑہائی
رہتی ہے اسی طور سے گو اپنی کمائی
لیکن شہ ایڈورڈ کی دیتا ہوں دہائی

ہے رنج سے تکلیف سے معمور یہ قصہ
محنت میں ہماری کوئی لے جائے گا حصہ

دنیا کو۔ الہٰی کہیں دوبارہ بنا دے
منظور ہے گر ہم کو لکڑ ہارا بنا دے
مزدور بنا دے تو پنہارا بنا دے
یا ورنہ کہیں ڈاک کا ہرکارہ بنا دے

پر باز ہم آئے ہیں وکالت سے الہٰی
دشمن کے بھی در پیش نہ آئے یہ تباہی

☆☆☆

مجھ کو تینوں یکساں ہیں (154)

جب میں پڑھنے پر آ جاؤں
بانگ درا ----- سعدی کی کریما ----- یا پیسہ اخبار
مجکو تینوں یکساں ہیں

بھوک سے جب بے بس ہو جاؤں
گوشت کی بوٹی --- سوکھی روٹی -------- شلغم کا آچار
مجکو تینوں یکساں ہیں

عشق میں جب بے تاب ہو جاؤں
گرم دوشالا --- پھولوں کی مالا ------- یا جوتوں کا ہار
مجکو تینوں یکساں ہیں

جب وہ دلبر پاس ہو میرے
رنگیں لیلےٰ ----- نمکیں عذرا -------- یا فتو لوہار
مجکو تینوں یکساں ہیں

جب میں اس دنیا سے جاؤں
ٹیکسی لاری --- اونٹ سواری ------- یا کوئی موٹر کار
مجکو تینوں یکساں ہیں

☆☆☆

کال کا سماں(155)

اے خضر عجب رنگ پہ نیرنگ جہاں ہے
آنکھوں تلے ہر وقت قیامت کا سماں ہے
از بسکہ گرانی کا یہاں سکہ رواں ہے
سر اپنا بھی اب دوش پہ اک بار گراں ہے
جینے کے تصور سے بھی ہوتی ہے گرانی
تف عشق پہ اور جائے جہنم میں جوانی

مزدور جو ہیں ان کے لئے کام ملے ہیں
اور مال تجارت کے بہت دام ملے ہیں
صنعت کو بھی کچھ اوج کے ایام ملے ہیں
دولت کے تو دیدار ہمیں عام ملے ہیں
پردے میں فراغت کے مگر قحط نہاں ہے
یا دھوپ کے ہوتے ہوئے بارش کا سماں ہے(156)

اب آئے کہاں اطلس و کمخواب کی چادر
اک چادر عصمت ہے یا ہے آب کی چادر
جی میں ہے پہن لیجئے، بس خواب کی چادر
یا شب کو چرا لیجئے مہتاب کی چادر
جیتے ہوں تو ملبوس ہوں عریانیٔ تن سے
مر جائیں تو آزاد رہیں فکر کفن سے

چینی گئی ایسی کہ وہ باہر ہے نہ گھر میں
افسوس کہ اب ہجر ہوا شیر و شکر میں
اس لب پہ شکر خند نہیں آج نظر میں
شیرینی بھی باقی نہیں اشعار خضر میں
کہتا ہے کہ یہ فن سخن کھیل نہیں ہے
تر کیسے زباں ہو کہ یہاں تیل نہیں ہے(157)

☆☆☆

چلم کا مرثیہ (158)

شور بر پا ہے سبھاؤں کا وہ پردھان نہیں
بات پہلی سی وہ محفل کی نہیں ،شان نہیں
بے پے،آج کچہری میں ہیں گرتے پھرتے
لوگ کہتے ہیں کہ تاج سرقلیان نہیں(159)

صبح دم ہاتھ سے خادم کے،چلم چھوٹ گئی
بن بنا کر مری تقدیر یونہی پھوٹ گئی

خود ، دھواں لے گیا، بیرون چلم راز چلم
کیا قیامت ہے 'محقق' ہوئے غماز چلم(160)
گڑگڑاہٹ گئی ، جب ٹوٹ گیا ساز چلم
اُٹھ گئے کرسیوں سے زمزمہ پرداز چلم

کچھ محقق ہیں ، کہ ہیں محو فغان وزاری
بے چلم ، حقہ پیے جاتے ہیں باری باری

اس کا گرنا تھا، کہ بس ارض وسما کانپ گئے
کھانستے کھانستے عشاق چلم ہانپ گئے(161)
جس کو ، اک آنکھ نہ بھایا، تراہم میں رہنا
کھا گئی جس کی نظر تجکو وہ،ہم بھانپ گئے

دشمن دیں،تیرے ہنسال سے دیدے پھوڑوں
تیر مژگاں کے ترے،دست پناہ سے توڑوں

غم سے منہ نال جھکی ، مثل کمان ابرو
پانی حقے کا بہا جاتا ہے بن کر آنسو

آج محفل میں خموشی ہے برستی ہر سو
راکھ کے ڈھیر ہیں ، کچھ بکھرا ہوا تمباکو
ٹوٹنے والی کی ہیں ، گویا نشانی باقی
شب کے ہنگاموں کی اک رام کہانی باقی
کل ہی لایا تھا ابھی تجکو تو بازار سے میں
دے کے چار آنے بچالایا تھا، اغیار سے میں(163)
آہ، کس شوق سے حقے پہ سجایا تجکو
یاد ہے حقے کو کل پیتا تھا کس پیار سے میں
''حیف در چشم زدن ، صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد''
اتنا لکھا تھا ، کہ یوں غیب سے آواز آئی
باش اے عاشق شوریدہ سرو سودائی .
غالب دہلی کا انداز مقال اچھا ہے
''کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے''(164)
''اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے''
دل لگی ہم کو ہے منظور کوئی اور سہی
''تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی''

☆☆☆

جہاں رمضان رہتا تھا (165)

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا
وہ اس کوچے کا لمبردار تھا آزاد رہتا تھا (166)
بہت مسرور رہتا تھا بہت دلشاد رہتا تھا
بسان قیس عامر صورت فرہاد رہتا تھا
جو اس کو یاد رکھتا تھا وہ اس کو یاد رہتا تھا
اور اس دالان میں اسی کا چچا رحمان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

اسی چھپر تلے دن رات اس کی چارپائی تھی
یہی دو چار کپڑے تھے اور اک میلی رضائی تھی
وہ اس دنیا کا مالک تھا یہی اس کی خدائی تھی
اور اس کوچہ کہ پنواڑی سے اس کی آشنائی تھی (167)
کبھی وہ اور کبھی یہ اس کے گھر مہمان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

اسی کوچے میں آوارہ دھواں ہے اس کے حقے کا
فضا کا ذرہ ذرہ نوحہ خواں ہے اس کے حقے کا
مگر دھندلا سا خاکہ کہکشاں ہے اس کے حقے کا
ابھی ٹوٹا ہوا نیچہ نشاں ہے اس کے حقے کا
وہ حقہ جس کے دم سے اس کو اطمینان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

ہے سرمہ بیدلوں کی آنکھ کا اس کا غبار اب تک
اٹھائے پھر رہے ہیں بیٹھے کچھ خاکسار اب تک
یہاں چلتا ہے لنگڑا کر ہوا کا رہوار اب تک (168)
جھکا دیتے ہیں سر تیمور سے عالی وقار اب تک
یہیں کہتے ہیں پہلے اس سے ایم۔اے خان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

☆☆☆

ہاتھ کی روانی (169)

یہ ہے آج ہی رات کی داستاں — کہ تھے میہماں میرے اک مہرباں(170)

غریبانہ کھانے کو وہ دیکھ کر! — ہوئے صورت باز کچھ تیز پر(171)

مجھے ٹالنا اس کا دشوار ہے — کہ ''ذرّنظر'' کا یہ اصرار ہے(172)

دکھاؤں میں حضرت کے کھانے کا رنگ — لکھوں ان کے لقمے اڑانے کا ڈھنگ(173)

مگر کس طرح ماجرا یہ لکھوں — کہوں بھی تو یہ بات کیوں کر کہوں(174)

قلم کانپتا ہے وہ آہی نہ جائیں — سمجھ کر وہ ہڈی چباہی نہ جائیں(175)

زباں بند بتیس دانتوں میں ہے — کہ پھر شور کچھ ان کی آنتوں میں ہے(176)

جو تھیں قسمیں کہہ چکا بر ملا — غرض دیکھیے ہاتھ ان کا چلا(177)

پلیٹوں میں ہلچل مچاتا ہوا — وہ چمچے پہ چمچا بجاتا ہوا(178)

پلاؤ میں سالن ملاتا ہوا — وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا(179)

وہ بوٹی سے بڑھ کر چمٹتا ہوا — وہ روٹی پہ چڑھ کر لپٹتا ہوا(180)

فقط شوربے سے کھسکتا ہوا — مربے سے جا کر چپکتا ہوا(181)

ادھر جھومتا اور مٹکتا ہوا — ادھر گھومتا اور اٹکتا ہوا(182)

کہیں شوربے میں نہاتا ہوا — نوالے سے کشتی بناتا ہوا(183)

گیا دال پر دندناتا ہوا — وہ مرچوں سے دامن بچاتا ہوا

کھٹائی سے یاں سٹ پٹاتا ہوا — کٹورے وہاں کھنکھناتا ہوا(184)

وہ چمچے سے چُلّو بناتا ہوا — وہ آلو کو اُلّو بناتا ہوا(185)

سویوں پہ سوجاں سے مرتا ہوا — ادھر لاڈ لڈو سے کرتا ہوا(186)

سموسے میں خود کو سموتا ہوا — یہاں کھوئے کے ہوش کھوتا ہوا(187)

جلیبی پہ واں پیچ کھاتا ہوا — ہتھیلی دہی پر کھجاتا ہوا(188)

یہ برنی K دل سرد کرتا ہوا | وہ زردے کا منہ زرد کرتا ہوا(189)
یہ کھچڑی کے چھکے چھڑاتا ہوا | وہ پھرنی پہ پھر پھر کے آتا ہوا(190)
پلاؤ کی ہستی مٹاتا ہوا | ق یہ حلوے کے گولے بناتا ہوا(191)
اور اس منہ میں ان کو گراتا ہوا | جو ہے غار پر زہر کھاتا ہوا(192)
وہ چکی کی مانند چلتا ہوا | وہ لقموں کو دانوں سا دلتا ہوا(193)
وہ جبڑوں میں بوٹی مسلتا ہوا | اُسے بن چبائے نگلتا ہوا(194)
یہ گلّوں کے ٹیلے بناتا ہوا | اور آنکھوں کو ان میں چھپاتا ہوا(195)
پسند اس پسندے کو کرتا ہوا | تو چٹنی پہ چٹخارے بھرتا ہوا(196)
وہ مڑتا ہوا اور وہ تنتا ہوا | وہ کھلتا ہوا اور وہ بنتا ہوا(197)
سسکتا ، سمٹتا ، سرکتا اِدھر | لپکتا ، ٹھکتا ، لپٹتا اُدھر(198)
بپھرتا ہوا ، جوش کھاتا ہوا | ق بگڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہوا (199)
لبوں پر زباں کو پھراتا ہوا | وہ غازی ہے یوں کھاتا کھاتا ہوا (200)
سمجھ کر مرے گھر کو جائے وفا | نہ ہلّد، نہ ٹلّد ، نہ جنبد زجا(201)

وہ سُودے و اکبر کا آب لوڈور(202)
یہاں خضر کی بے زبانی کا زور

☆☆☆

گھوڑے کی آرزو(203)

تانگے کے بندھنوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف زندگی کا یونہی جو چل رہی ہو(204)
بندش سے ہوں گریزاں ، جی ڈھونڈتا ہے میرا
اپنی رضا کے تابع ، اپنی روا روی ہو
سائیس کا خطر ہو اور زین کا نہ ڈر ہو
اور باگ ڈور کوسوں ٹوٹی ہوئی پڑی ہو
کیا فرض ہے کہ یونہی عسرت میں دن گزاروں؟
ہر وقت توبری میں کھانے کو باجری ہو؟(205)
"صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں"
لو سن کہیں اُگا ہو ، پیدا کہیں چری ہو(206)
صحرا کی وسعتوں میں فرصت کے رات دن ہوں
اور میرے ساتھ مری ٹکی بھی چر رہی ہو
"آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ"
جس پر وہ لوٹتی ہو ، جس پردہ کھیلتی ہو
مانوس اس قدر ہو ، صورت مری سے ٹکی
دو کوس سے بھی مجکو مڑ مڑ کے دیکھتی ہو(207)
"مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو"
میں ہنہنا رہا ہوں وہ ہنہنا رہی ہو(208)
دن بھر تو اپنی خاطر صحرا کی وسعتیں ہوں
اور شب گزارنے کو چھوٹی سی جھونپڑی ہو

اس مہ جبیں کے دم سے جلوؤں کا ہو یہ عالم
کٹیا میری کے اندر بجلی چمک رہی ہو

بالو کی ریت کا ہو اس میں گداز بستر
تھوڑی گزک کی خاطر اک سمت گھاس کی ہو(209)

گردن پہ اس کی جب میں یہ تھوتھنی بڑھاؤں
وہ اپنی دُم کو میرے پہلو پہ پھیرتی ہو

شب بھر رہیں ہمارے راز و نیاز قائم
پردے میں عاشقی کے آزاد شاعری ہو

ہر اسپ بادِ پا کو گانا مرا سنا دے
اس کے اثر سے شاید رستا کوئی تڑا دے

☆☆☆

قصابوں کا قومی ترانہ(210)

"چین و عرب ہمارا ، ہندوستاں ہمارا"
قصاب ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
چیلیں ہوا میں نگراں، کتے ہیں گھر کے درباں
"آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
ہو گوجرے کی منڈی یا آگرے کا چڑا
چمڑے کا چوکھٹا ہے قومی نشاں ہمارا'
چھریوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
"خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا"
کڑیوں سے دبنے والے اے آساں نہیں ہم
"سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا"
جب گوشت بندھ چکا ہو اور ہینکتا گدھا ہو
'ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا'

☆☆☆

نعرہء جہاد، نذر مجاہدین پاکستان(211)

تم پہ ہے سایہء خدا، تم پہ ہے رحمت نبیؐ — تم سے ہوئے ہیں آشکار، عزم و شجاعت علیؓ

مثل صحابہء نبی تم ہو نبیؐ کے جاں نثار — تم سے ہیں ــــــ سے ہے فقرِ بوذرؓ

تم پہ نگاہِ پنجتنؓ، لطف و عطائے طاہرین — دیکھو ـــــــــــــ غوث معظم و جلی

کے پیشوا ۔ -- -- -- -- --

-- -- -- -- -- --

☆☆☆

ازار بند (212)

چھوٹا بڑا ، نہ کم ، نہ مجھولا ازار بند ہے اس پری کا سب۔ ۔ ۔ ازار بند

شوخی تو دیکھو ،شوخ کے زانو کے درمیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھ کو لا ازار بند

۔۔۔ میں مرا ہاتھ کہیں کل، جو لگ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈھولا ازار بند

اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دے ، ناپاک ہوگیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سو پرولا ازار بند

متفرقات(213)

لے نہ ڈوبے کہیں دریائے غضب اردو کا سب کو لازم ہے دل و جاں سے ادب اردو کا(214)

دو نہ کہیے ، کہ یہی ایک سخن کافی ہے شاعری چرخ کی سرمایہ ادب اردو کا

لطفِ غوث پاکؓ سے بالا نصیب حافظ برکت علی پیر از حبیب (215)

دیکھنی ہے چال سلو کی جو اٹھلاتی ہوئی تو عروج اخبار کے منشی کے لنگڑانے میں آ(216)

صبح بہار آگئی نور و ضیا لئے ہوئے [لو] آگیا قصاب بھی اپنا گدھا لئے ہوئے(217)

گھوڑے کو کداتا ہوا وہ شوخ اگر آوے "اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے"

نہ سرکس کا نہ منڈی کا نہ یہ بازار کا گھوڑا لڑے گا آج دو دو ٹکریں گلزار کا گھوڑا

اے گلزار اگرچہ ہم کو آپ سے کوئی بیر نہیں لیکن کچھ آثار برے ہیں عشق میں اب کے خیر نہیں (218)

الٰہی بخش شہادت پا گیا بیٹا اوہندی تھاں تے آ گیا

واگوں اوہ شیراں للکار دا نعرے تکبیراں دے مار دا (219)

☆☆☆

نثری تحریریں

آپ دولت کے لیے نہیں بلکہ دولت آپ کیلئے ہے (1)

(آپ اپنی حفاظت کس طرح کر سکتے ہیں)

جب سے مملکت برطانیہ ظالم اور غاصب نازیوں کا قلع قمع اور کمزوروں کو ان کی دست برد سے بچانے کے لئے میدان میں سینہ سپر ہوگئی ہے ہم میں سے اکثر اشخاص کسی وہم میں مبتلا ہو کر اپنا روپیہ سرکاری بنکوں اور ڈاکخانوں سے نکلوا رہے ہیں۔ اور اسی پر ہی بس نہیں کی بلکہ ہم نے کیش سرٹیفکیٹوں اور دیگر سرکاری امانتوں کی کفالت والا روپیہ بھی نکلوانا شروع کر دیا ہے۔ مقام مسرت ہے کہ اس بارے میں ہمارے کارکن ڈپٹی کمشنر سردار صاحب بلونت سنگھ نلوا صاحب نے فوری تدارک کر کے اشتہاروں اور پمفلٹوں کے ذریعہ تمام وہموں اور وسوسوں کے پردے چاک کر کے رکھ دیئے ہیں جس کے لیے ہم سب انکے ممنون ہیں۔ جو لوگ ابھی تک اس وہم میں گرفتار ہیں کہ یہ روپیہ اس لئے نکلوانا چاہیے کہ مبادا، خدانخواستہ انقلاب آجائے تو کسی آڑے وقت میں کام آجائے گا۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ شخص جو درخت کی اس ٹہنی پر بیٹھا ہو جو کٹنے کو ہے اگر اپنے ہاتھوں سے اس امید سے علیحدہ رکھ دے کہ وہ ٹہنی کے کٹنے کے بعد اس کے کام آئے گا تو یہ ایک فعل عبث ہے کیونکہ ٹہنی کے کٹتے ہی وہ بھی سر کے بل اس طرح آرہے گا کہ اسے اس دنیا میں بھی سامان کو برتنے کی فرصت ہی نہ ملے گی۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ ہماری مثال ان اشخاص سی ہے جو ایک کشتی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ پانی عروج پر ہے۔ کشتی منجدھار کے اردگرد ہے اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے چپو چلانے اور ملاحوں کی امداد کرنے کی بجائے صرف اپنی اپنی گٹھڑیاں سنبھال کر رکھ رہے ہوں بلکہ ملاحوں کے ہاتھوں سے چپو چھین رہے ہیں۔ یہ ایک ظاہر اور کھلی کھلی حقیقت ہے کہ ہم سب کی حفاظت، ہمارے مال و جان کی سلامتی اور عزتوں کی برقراری و بحالی اگر ہے تو اس وقت سلطنت برطانیہ کے حسن انتظام کی وجہ سے ہمیں اپنا لوکل سیلف گورنمنٹ (کمیٹیوں وغیرہ میں دیسی حکومت) کا تجربہ بھی معلوم ہے اور اچھی طرح جانتے ہیں۔ امن و قیام کی سلامتی بحالی اور برقراری میں جو کوششیں سلطنت برطانیہ نے صرف کیں یا کر رہی ہے۔ ان کی مثال ایسی ہے جو رہتی دنیا تک برقرار رہے گی۔

بہت کم لوگوں کو یہ حقیقت معلوم ہے۔ کہ سیونگ بنکوں یا مختلف قرضہ جات کے ذریعے جو روپیہ سرکار لیتی ہے اسے ہمیشہ مفید اور کارآمد کاموں پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ ایک

سلطنت کا مجموعی طور پر سالانہ خرچ چند کروڑ روپے سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ گورنمنٹ مجموعی خرچ جتنا روپیہ ہر سال اپنے ایک ایک محکمے میں سڑکوں اور نہروں پر نئے کارخانے چلانے، صنعت کوترقی دینے اور اسی قسم کے مفید امور پر خرچ کردیتی ہے۔ یہ سب کچھ صرف اس روپے کے بل بوتے پر عمل پذیر ہوتا رہتا ہے جو ہم اور آپ وقتاً فوقتاً اپنے خرچ سے بچا کر سیونگ بنک میں یا کسی امانت کی کفالت پر رکھا آتے ہیں۔

قطرہ قطرہ بہم شود دریا(2): اس مقولے کا زیادہ اطلاق ان حالات سے اور کہیں نہیں ہوتا جبکہ مختلف بچت کو پسند کرنے والے لوگوں کا روپیہ بنکوں اور ڈاک خانوں میں جا کر سرکار کو اس قدر حوصلہ دلا دیتا ہے کہ وہ اس کی طاقت پر بڑے بڑے رفاہی کام شروع کردیتی ہے۔ اگر ہم اس طرح سے اپنی بچت کا روپیہ بنکوں سے نکلوانا شروع کردیں تو اس کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہوگا کہ ہم نے سرکار کے لئے مفید کام کرنے کے آئندہ مواقع بند کردیئے ہیں۔ اگر سرکار ایسے کاموں کی تکمیل کو ملتوی کردے گی تو اس میں اس کا تو کچھ بگڑ نہیں جائے گا بلکہ ہم اچھے پلوں، نفیس سڑکوں، باغات اپنے ہمراہ آبادی اور رونق لانے والی نہروں، مفید اور کارآمد کارخانوں (جو لاکھوں بیکاروں کے لئے کام بھی مہیا کریں گے) سے محروم ہو جائیں گے۔ گویا اس روپے کا بنکوں میں سے نکلوانا ایسا ہے جس طرح ایک اچھے اور تندرست جسم میں سے صالح خون کا نکل جانا یا ان ملاحوں کے ہاتھوں سے چپو چھین لینا جو ہمارے بچاؤ کی خاطر اس کشتی کو کنارے پر سلامتی کے ساتھ لے جانے کو اپنی قابلیتیں اور طاقتیں پیش کررہے ہیں جس میں ہم خود سوار ہیں۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ ہم خود وقت کی نزاکت کو نہیں دیکھتے اور جی میں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر سیونگ بنک میں ہمارے چند روپے نہ ہوں گے تو اس سے کون سا فرق پڑ جائے گا۔ حالانکہ اگر ہر شخص اس بات پر کاربند ہو جائے تو ظاہر ہے کہ گورنمنٹ محولہ بالا مفید کام کبھی بھی نہ کرسکے۔

ایک غلط خیال: اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ اپنے تھوڑے روپے کو تھوڑا سمجھ کر سیونگ بنکوں سے نہیں نکلوانا چاہیے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ موجودہ کرنسی نوٹوں یا سکوں کی مالیت ہماری سرکار کی پیدا کردہ ہے۔ اگرچہ چین کے سکے کی ایران میں کوئی وقعت ہے تو شوق سے اس روپے کو مرشد بنا کر رکھئے۔ لیکن دانائی کا تو یہی تقاضا ہے کہ اس وقت اس روپے کو اپنے حفاظت کے لئے، اپنے بیوی بچوں اور مال و دولت کے بچاؤ کے لئے سرکار کو قرضے پر دیجئے۔ ہماری دعا ہے کہ آپ اپنی جائیداد

اور دولت سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور آپ کے وارث بھی اس سے متمتع ہوں۔ لیکن کیا آپ ایک لمحہ کے لئے بھی اس امر کی ضمانت دے سکتے ہیں کہ اگر آپ ہی کے خطرے کو صحیح فرض کرلیا جائے اور ایک منٹ کے لئے دلیل کے طور پر مان لیا جائے کہ سرکار برطانیہ ایک انقلاب کے ریلے میں آجائے گی تو اس وقت آپ اور آپ کا مال و دولت اور دیگر ساز و سامان کہاں ہوں گے؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ دنیا میں انقلاب سلطنت سے بڑھ کر زیروزبر کرنے والی اور کوئی چیز نہیں؟ کیا آپ نے بابر اور تیمور کی اولاد کو انقلاب کے بعد خود ان کے پایہء تخت دہلی میں بھیک مانگتے نہیں دیکھا؟ کیا آپ اس باب میں تیمور اور بابر سے تو طاقتور نہیں ہیں۔

بہتری کی بات: اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ ہم مل کر ایسی کوشش کریں کہ وہ بھیانک انقلاب نہ آئے جس کو مدنظر رکھتے ہوئے اکثر لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر سیونگ بنک سے اپنا روپیہ نکلوا رہے ہیں۔ اگر وہ انقلاب نہ آئے تو اس میں ہماری سلامتی ہے اور مال و جان کی حفاظت ہے۔ اس باب میں سرکار نے ایک اور ترکیب نکالی ہے۔ سرکار نے اچھی طرح محسوس کیا ہے کہ بعض اشخاص پر اپنی حفاظت کے لئے اور مقررہ عرصہ کے لئے اپنا روپیہ دینے کو تیار ہیں۔ سرکار نے کچھ سکیمیں قرضہ جنگ کی جاری کی ہیں۔ جن میں سے ایک تو وار سیونگ سرٹیفکیٹ (دوران جنگ کے سرٹیفکیٹ) ہے۔ ہر شخص یہ سرٹیفکیٹ کسی نزدیک کے ڈاک خانے سے خرید سکتا ہے۔ انہیں جون 1940ء سے جاری کیا گیا ہے اور ایک شخص دس روپے سے لے کر پانچ ہزار روپے تک کی مالیت کے سرٹیفکیٹ خرید سکتا ہے۔ ان کی میعاد دس سال ہے۔ جس پر سوا تین فیصد حصہ سالانہ کے حساب سے سود علیحدہ ملے گا۔

شش سالہ حفاظتی تمسکات: سرکار نے 10 جون سے یہ تمسکات جاری کئے ہیں ان میں سے جو روپیہ جمع ہوگا۔ اسے ہندوستان کی حفاظت پر صرف کیا جائے گا۔ ان کی مدت چھ سال ہے۔ اس دوران میں اس پر 3 فیصدی کے حساب سے سالانہ سود بھی ملے گا۔ ایک شخص کو واپسی کے وقت -/100 روپیہ کے بدلے -/101 واپس دیا جائے گا۔ اس میں پندرہ ہزار روپے تک ایک وقت میں جمع کرایا جاسکتا ہے۔

سرکار کا شکریہ: اگر کوئی صاحب اپنی اور اپنے ملک کی حفاظت کے لئے اپنا روپیہ بلا سود قرض پر سرکار کے حوالے کرے تو ایسی پیشکش کو سرکار شکریے کے ساتھ قبول کرے گی۔

یاد رکھنے کے قابل بات: یہ بات آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ سرکار کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ آپ کا

روپیہ واپس نہ ہو۔ یہ روپیہ ایک خاص مدت کے لئے قرضہ کے طور پر لیا جائے گا۔ اگر آپ چاہیں تو ہر وقت اپنی اصل رقم واپس لے سکتے ہیں۔

ایک فرق: آپ میں سے اکثر احباب زیور کو بچا کر رکھتے ہیں جس سے آپ کا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ وہ وقت بے وقت کام آتا ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ یہ سرٹیفکیٹ بالکل اس زیور کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کیونکہ

(1) زیورات کے بھاؤ میں تغیر و تبدل ہو، لیکن ویسے وہ گھٹ بڑھ نہیں سکتے۔ اس کے مقابلے میں اپنے روپے کے مقابلہ میں جو محولہ بالا سرٹیفکیٹ آپ کے لئے ہیں ان کی قیمت میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا رہے گا۔

(2) آپ اپنے زیورات کی حفاظت کرتے ہیں لیکن سرٹیفکیٹ آپ کی، آپ کے بال بچوں کی اور آپ کے ملک کی حفاظت کریں گے۔

(3) آپ کے زیورات چوری ہو سکتے ہیں۔ وہ گھر میں پڑے پڑے محض بیکار ہیں۔ لیکن آپ کی وہ رقم جوان سرٹیفکیٹوں کی کفالت پر ہے۔ کبھی بھی بیکار نہیں جا سکتی۔ اس لئے آپ آج ہی مندرجہ بالا سرٹیفکیٹ ہائے خریدیں اور اس طرح اس خطرے سے خود بخود بچ جائیے جس کے پیش نظر آپ اپنے روپے کو بنکوں سے نکلوانے کے وہم میں گرفتار ہیں۔

آپ نے آج تک اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے مال حلال پیدا کیا ہے جو آج تک ہمیشہ نیک امور پر خرچ ہوا ہے۔ آپ نے اس کی حفاظت کے لئے فلک بوس محل بنوائے۔ اسے محفوظ رکھنے لے لئے آہنی تہ خانے بنوائے۔ آیئے! اور اس مال کو بھی موقع دیجئے کہ وہ آپ کی حفاظت کرے۔ اس کی حفاظت کرنے والے محلات کی حفاظت کرے اور سر زمین کی حفاظت کرے جس پر وہ محلات اپنا سر فخر سے اونچا کئے ہوئے ہیں۔

گلگونہ عارض ہے، نہ ہے رنگ حنا تو
اے خون شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا (3)

خطرہ اور اس کا انسداد (4)

ہم پچھلے دنوں سے مسلسل سن رہے ہیں کہ آج کل بڑا خطرہ ہے۔ اگر اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے کہ اس خطرے کی رٹ لگانے کا کیا باعث ہے تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ جب سے موجودہ جنگ چھڑی ہے چند خود غرض اشخاص کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ خدانخواستہ برطانیہ پر ایک دور انقلاب آنے والا ہے اس لئے ہندوستان میں بھی افراتفری پھیل جائیگی اس صورت میں دیہات کی آبادی شہروں پر پل پڑے گی اور انہیں اپنی لوٹ کھسوٹ کا تختہ مشق بنائے گی اور اس انقلاب کے نتائج بہت ہولناک ہوں گے۔ اس لئے اس وقت کے بچاؤ کی خاطر چند امور کا انسداد آج ضروری ہے۔ اس بہانے سے پرامن شہریوں کے خلاف حکومت اور اس کے ذمہ دار حکام کو بھڑکائے جانے کی کوشش کی جاتی ہے حالانکہ ہماری نظر میں وہ لوگ ملک کے بہت دشمن ہیں جو پیش از مرگ واویلا کر کے حکومت برطانیہ کی مفروضہ کمزوریوں اور اس کے ہندوستان سے چلے جانے کے فرضی امکانات کے قصوں کو لوگوں کے دلوں میں بٹھاتے ہیں۔

کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ حکومت برطانیہ کو کسی دوسری تقدیر الٰہی کے آگے سر جھکانا پڑے تو اس صورت میں انقلاب کے بعد ہمارا ملک، ہمارے دیہات، ہمارے شہر اور ان کی دولت سب آج کی طرح ہی مامون و مصئون اور حفاظت کے محتاج ہوں گے۔ کیا اس صورت میں کوئی چیز ایسی رہ چکی ہوگی جس کی حفاظت درکار ہو۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ دنیا میں انسانی جانوں سے بڑھ کر قیمتی کوئی چیز نہیں جب اس صورت میں ان کا بچ جانا ہی یقینی نہیں تو مال و منال جو صدقہ ء جاں ہوتے ہیں ان کی حفاظت کے خیال کو مقدم رکھنا ایسا ہے جس طرح ایک پنجابی ضرب المثل کے مطابق آم کاٹ کر آک کی باڑ بنانا۔ اس لئے ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ اس انقلاب خونیں کے بعد کی حفاظت کا سامان پیدا کرنے کی بجائے اس سے زیادہ کہیں بہتر ہوگا۔ اگر ہم سب مل کر اس انقلاب کو آنے سے روکیں اور ایک دوسرے کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر ظالم کا مقابلہ کر کے اپنی حفاظت آپ کریں۔ ہماری خوش قسمتی ہے وہ کام جو ہمیں خود کرنا چاہیے تھا اس کا سرکار برطانیہ خود بخود بڑھ چڑھ کر سامان کر رہی ہے۔ اس میں اس کی امداد کر کے اپنی حفاظت کا پورا سامان کرنا چاہیے۔ ہم نے جان بوجھ کر ہی خطرے خطرے کے الارم سے انقلاب کے بعد کے معنی لیے ہیں کیونکہ اگر ایسا انقلاب نہ آئے جس کا ہمیں روز روشن کی طرح یقین ہے کہ وہ نہ

آئے گا اور سلطنت برطانیہ مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مخالفت میں انشاء اللہ حسب سابق کامیاب ہو جائے گی تو کوئی وجہ نہیں کہ حکومت اور اس کے کارکن حکام کی متفقہ کوششوں کی وجہ سے ملکی انتظام میں کسی قسم کا سقم آئے۔

اگر خطرے کا الارم دینے والوں کا یہ خیال ہو کہ ہندوستان میں برطانوی اثر و حکومت کے ہوتے ہوئے ان کی کوئی چیز خطرے میں ہے تو یہ ان کا گمان محض ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ برطانیہ جو غیر ممالک کے مفاد کو بوجہ دوستی مقدم رکھتی ہے وہ کبھی بھی اپنے اندرونی انتظام میں کوئی خلل نہیں آنے دے سکتی۔ اگر ہمارے ملک میں انتظام کی امداد کے لئے کسی قسم کی کوئی کوشش جاری کی گئی تو اس کا حکومت کی امداد اور مرضی کے بغیر بھی ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے خودغرض لوگوں کا یہ کہنا کہ حکومت برطانیہ اور اس کے انتظام کرنے والے حکام انتظام ملکی کو سنبھال نہ سکیں گے۔ ایک افسوسناک کوشش ہے جو بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر حکومت کے خلاف کی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو ہر وقت خطرے میں گھرا ہوا ظاہر کرنا دوسرے الفاظ میں خطرے کو دعوت دینا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ رعایا میں شریف شہری بھی ہوتے ہیں اور جرائم پیشہ بھی۔ اگر ہر وقت یہی کہا جائے کہ فلاں جگہ خطرہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس جگہ قسمت آزمائی کرنے کے لئے جرم پسند طریق کو دعوت دے رہے ہیں۔

سچی بات: ہم بانگ دہل کہتے ہیں کہ جب تک ہندوستان برطانیہ کے ماتحت ہے اور اس میں قانون وقت کے ماتحت حکومت کا بندوبست چلانے والے محنتی، دیانتدار اور کارکن افسر موجود ہیں ہندوستانی رعایا کو کسی شخص سے کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ ہندوستان کو چھوڑ کر تمام دنیا میں برطانیہ امن و سلامتی کا بہترین ضمانت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اگر ہم فی الواقع کسی خطرے سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں دنیا کے سب سے بڑے خطرے یعنی نازی ازم اور فاشزم کا مقابلہ کرنا چاہیے جو آج تمام خطروں کی جڑ ہیں۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں کے مصداق اگر ہم نے اس ایک خطرے کا اچھی طرح سدباب کر لیا تو دنیا میں بدستور امن رہے گا اور اگر خدانخواستہ بفرض محال یہ خطرہ درست ثابت ہو بھی جائے تو پھر ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خطرے کے سر پر آ جانے کے بعد جان و مال کی حفاظت کرنے کی اپیلیں سننے کا حق کس کو حاصل ہوگا۔ اور کس کی مجال ہوگی کہ حکومت وقت کا سایہ اٹھ جانے کے بعد انتظام ملکی کو سنبھال کر امن قائم رکھ سکے۔ اس لئے ہم نہایت ادب کے ساتھ گزارش کریں گے کہ اگر اس حکومت برطانیہ کے ہوتے ہوئے بھی کسی قسم کا

خطرہ ہو تو اس وہم کو اپنے دل سے نکال دیں۔ کیونکہ حکومت برطانیہ کی طرف سے جس کی تمام کوششوں کی بنیاد عدل و انصاف اور نیک نیتی پر ہے کبھی بھی ظالم کے مقابلہ میں ایک مظلوم کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے ہندوستان بھر کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں اور اگر ان کا خیال ہو کہ حکومت برطانیہ کے پہلے چلے جانے کے بعد جو افراتفری ہوگی اس میں ہمارے لئے کوئی خطرہ ہے تو اس کا سہل علاج ہے کہ آپ ایسا موقع ہی نہ آنے دیں جس سے وہ روز بد ہمیں دیکھنا نصیب ہو۔ یعنی آپ خود میدان جنگ میں بنفس نفیس جا کر حصہ لیں۔ اگر خود نہیں جا سکتے تو اپنی مالی خدمات سے دوسرے لوگوں کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ اپنی شجاعت کے جوہر وہاں دکھا سکیں۔

آیئے! آج ہی بڑھ چڑھ کر حکومت کو اس کی سخت کوششوں کے لئے چندہ دیجئے۔ احسان کا بدلہ احسان ہونا چاہیے۔ اس لئے اگر آپ اپنی حفاظت کی بدولت اپنا روپیہ عطیے کے طور پر دیں تو کیا کہنا۔ لیکن حکومت آپ سے کوئی روپیہ مفت نہیں لینا چاہتی اگر آپ اپنی دولت کا حصہ مستقل طور پر نہ دے سکتے ہوں تو سرکار کو "قرضہ جنگ" ہی دیجئے۔ آپ کا روپیہ آپ کی حفاظت کے کام آئے گا۔ آپ کے ملک و ملت کو مضبوط بنائے گا اور خود آپ کے پاس بڑھ چڑھ کر واپس آئے گا۔

آیئے! اور سرکار کا اپنی حفاظت میں ہاتھ بٹایئے اور یاد رکھئے کہ آج کل کسی قسم کی افواہوں پر کان دھرنا یا کسی مفروضہ خطرہ کو دل میں جگہ دینا نہ صرف ایک احمقانہ فعل ہے بلکہ اپنے ملک و ملت سے بہت بڑی غداری ہے۔

☆☆☆
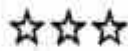
پنجاب کی تاریخی بستیاں (5)

''چنیوٹ''

پنجاب کی تاریخی بستیوں میں چنیوٹ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کی وجہ زیادہ تر اس کا محلہ وقوع بھی ہے۔ ہم آج کل ان ضرورتوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے جن کو سامنے رکھ کر پرانے شہر آباد کئے جاتے ہیں۔ اس موٹر، ریل، ہوائی جہاز کے زمانے میں کسی شہر کا ایک خاص مقام پر واقع ہونا چنداں ضروری نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سڑکوں اور ریلوں کے جال سے زمین کی طنابیں کھینچ دی گئی ہیں۔ پرانے زمانے میں یہ بات نہ تھی۔ ان دنوں نہ تو سڑکیں ہی عام تھیں اور نہ ہی آمدورفت کے وسائل نے کوئی ترقی پائی تھی۔ عام طور پر دریائی راستے ہی تجارت اور سلطنت کے اہتمام و انتظام کے لئے شاہراہ کا کام دیتے تھے۔ اس لئے عام طور پر پرانے شہروں کو دریاؤں کے کنارے ہی آباد کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ جس جس علاقے سے دریا گزرتے تھے، وہاں سیلاب اور چاہی کاشت زیادہ یقین اور آسانی سے کی جاسکتی تھی۔ اور دریاؤں سے نسبتاً دور علاقوں میں کنوئیں کھودے ہی نہیں جاسکتے تھے۔ کیونکہ کھدائی پر اتنی دور نیچے جا کر پانی برآمد ہوتا تھا کہ اسے رہٹ کے ذریعے زمین پر لانا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر پرانے شہر ایسے دریاؤں کے کنارے آباد ہوئے ہیں۔ جن میں کشتیاں چلائی جاسکتی تھیں ۔ لاہور راوی کے کنارے پر بھیرہ، خوشاب، میانی، جہلم کے کنارے پر دہلی اور آگرہ، جمنا کے کنارے اور چنیوٹ چناب پر انہی وجوہات کے باعث آباد ہوئے۔

چنیوٹ کے محل وقوع میں پہاڑیوں کا قریب ہونا بھی ایک خاص اثر رکھتا ہے۔ کوہستان نمک کے بعد پہاڑیوں کا یہ سلسلہ جو چنیوٹ کے پرانے علاقے شاہ کوٹ سے شروع ہو کر سانگلہ سے ہوتا ہوا چنیوٹ پہنچتا ہے۔ اپنی بناوٹ کے لحاظ سے کوہستان نمک سے مختلف ہے۔ اس سلسلے کی تین پہاڑیاں چنیوٹ کے نزدیک کچھ اس طرح واقع ہوئی ہیں کہ ایک پہاڑی دریائے چناب کے مشرق میں بائیں کنارے، دوسری عین دریا کے اندر جو ایک جزیرے کی صورت اختیار کر کے مقامی چکی کے نام سے مشہور ہے اور تیسری دریا کے مغرب میں دائیں کنارے پر واقع ہے۔ اگرچہ اب تینوں پہاڑیوں کو ملا کر دریائے چناب پر ایک ایسا پل تعمیر کیا گیا ہے جس کا نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن پرانے زمانے میں یہ بات نہ تھی۔ جنگی لحاظ سے اس مقام کی اہمیت کا پتہ

کرنے کے لئے یہی ایک امر کافی ہے کہ چکی کے مقام پر غالباً شاہ جہاں کے عہد میں ایک قلعہ تعمیر کرنے کی تجویز ہوئی تھی۔ جس کے آثار دریائی پل کے ساتھ ہی ایک دیوار کی صورت میں ملتے ہیں لیکن بعد میں نامعلوم اسباب کے باعث اس سکیم کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ نہروں کے زمانے سے پیشتر چکی کا جزیرہ ایک وسیع خلوت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت بوعلی شاہ شرف قلندر نے اس مقام کو بھی اپنی قیام گاہ کے طور پر منتخب کیا۔ جہاں اس وقت بھی شاہ شرف کے کوٹھے کے نام سے ایک عمارت عین دریا کے اندر موجود ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ 1956ء کے سیلاب کے دوران میں بھی اس کوٹھے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ قصہ کوتاہ چنیوٹ کی بنا موجودہ مقام پر ڈالنے کے لیے اس کے بانیوں نے یقیناً ان دو باتوں کو سامنے رکھا ہوگا۔ تاریخی طور پر چنیوٹ کا مقام ہی سکندر اعظم کی گزرگاہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بہت (دریائے جہلم کا مقامی نام) کے علاقے سے سانگلے کی طرف جانے کے لئے اس جگہ کے علاوہ اور کوئی ایسا موزوں مقام نہیں۔ جہاں سے سکندر کی فوجیں دریائے چناب کو عبور کر سکتی تھیں۔—

اس زمانے میں شری گوتم بدھ کے پیروؤں کی علمی درسگاہ ٹیکسلا کا مشہور عالم ''چانک'' جس نے بعد میں چندر گپت موریہ کو 'ارتھ شاستر' لکھ کر سلطنت کے گر بتلائے۔ چنیوٹ ہی کا باشندہ تھا۔ ہن خاندان کے عہد میں مہر گل اور اس کے پیروؤں کا دارالحکومت چنیوٹ ہی تھا۔ اس کے بعد ہم اس شہر کا ذکر کم سنتے ہیں۔ البتہ یہ امر باور کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ کریانہ بار کے لئے چنیوٹ ایک وسیع جنکشن کا کام دیتا تھا۔ اور جنگل کے اس وسیع خطے میں جو آج لائل پور اور منٹگمری کے ضلعوں پر مشتمل ہے۔ چنیوٹ ایک نخلستان کا حکم رکھتا تھا۔ تاریخ کی روشنی کے زمانے میں ہمیں چنیوٹ کا ذکر پہلے پہل شہنشاہ بابر کی توزک میں ملتا ہے۔ جبکہ 1504ء میں بابر درہ خیبر کے راستہ پاکستان اور اس کے بعد ہندوستان میں داخل ہوا شہنشاہ نے لکھا کہ اس وقت بھیرہ، خوشاب اور چناب کی حکومتیں سید علی خان کے قبضے میں ہیں۔ جو اسکندر بہلول بادشاہ دہلی کا باجگزار ہے اور اس کے نام پر خطبہ پڑھتا ہے۔ اس سلسلے میں بابر نے یہ بھی لکھا کہ جنوب کی حکومت اس وقت ترک گورنر کے ہاتھ میں ہے جو تیمور گورگان کے حملہ پاکستان یعنی 1398ء سے اسی خاندان میں چلی آتی ہے۔

قدامت کے لحاظ سے چنیوٹ، لاہور اور قصور سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس کی بنیاد ڈالنے کے سلسلے میں ایک شہزادی چندن کا نام بھی آتا ہے۔ جس کی نسبت مشہور ہے کہ ہمیشہ مردانہ لباس میں شکار کو نکلا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ شکار کھیلتے کھیلتے اس طرف آ پہنچی تو اسے

میدان، پہاڑ اور دریا کا ایک جگہ اکٹھا واقع ہونا اس قدر بھلا معلوم ہوا کہ اس نے فوراً موجودہ چنیوٹ کے مقام پر ایک شہر بسائے جانے کے احکام صادر کئے۔ پرانے زمانے میں بعض دستاویزات میں اس شہر کو اس وجہ سے چندن پوٹ کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ ثقافتی لحاظ سے تین قوموں کی آبادی نے چنیوٹ کو تمدنی اور سماجی طور پر بھی کافی اہمیت دے رکھی ہے۔ پرانے زمانے سے یہاں زمیندار قومیں خوجہ قوم اور دستکار لوگ آباد چلے آتے ہیں جن میں تھہیم، مگوں، خوجے اور لکڑی کے کام کے کاریگر اور معمار زمانے میں مشہور ہیں۔ چنیوٹ کی زمیندار قوموں میں تھہیموں نے شاہجہاں کے زمانے میں بہت زیادہ عروج پایا جبکہ اس قبیلے کے ایک ممتاز رکن امیر الامر جملتہ الملک علامی نواب سعد اللہ خان مرحوم نے ہندوستان کی وزارت عظمیٰ کی گدی سنبھالی۔ مغل عہد سلطنت میں علم اور فضل کے لحاظ سے علامی کا خطاب دو ہی شخصیتوں کے حصے میں آیا ہے، جن میں ایک تو ابوالفضل ہیں اور دوسرے نواب سعد اللہ خان مرحوم۔ چنیوٹ میں نواب سعد اللہ خان کی یادگاران کی مشہور عالم مسجد ہے جس کے مینار سنگ لرزاں کے ہیں اور حرکت دینے سے ہلتے ہیں۔ اور دوسرے فیل خانہ جس کو آج کل ریختی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں اورنگ زیب عالمگیر کے رقعات کا حوالہ دینا بے محل نہ ہوگا۔ جس میں نواب سعد اللہ خاں کے اقوال عالمگیر نے اس طرح نقل کیے ہیں۔ جس طرح نوشیرواں کے در پر بزرجمہر کے اقوال پرانی فارسی کتابوں میں ملتے ہیں۔ عہد مغلیہ میں چنیوٹ کی ایک دوسری یادگار حکیم علیم الدین الملقب بہ نواب وزیر خان ہیں جنہوں نے عالمگیر کے زمانے میں حکومت میں عمل دخل حاصل کیا اور مسجد وزیر خان اور شہر وزیرآباد کو تعمیر اور آباد کر کے دین و دنیا کی سرخروئی حاصل کی۔ مغلیہ حکومت کے خاتمے پر ہمیں مغل قوم کے ایک فرد غلام محی الدین کا نام درخشاں نظر آتا ہے، جن کے قبضے میں یہاں کی قضا کا عہدہ تھا۔ یہ صاحب مقامی طور پر شریعت پناہ سیادت دستگاہ تھے۔ آخر میں خوجہ مگوں قوم کے ممتاز فرد میاں سلطان کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا جو قلعہ ریختی کے مختار اور گورنر تھے اور سکھوں کے حملے کے وقت انہوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہوئے سکھوں کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر انہیں چنیوٹ کا نواب مظفر خان بانی مظفر گڑھ قرار نہ دیا جائے جنہوں نے ملتان کے قلعے کے شگاف پر ٹیپو سلطان کی طرح داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا تھا۔

دستکار طبقے میں سے لکڑی اور معماری کا کام کرنے والے لوگ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ تاج محل آگرہ کی تعمیر اور دربار صاحب امرتسر کی تعمیر میں چنیوٹ کے کاریگروں نے بڑھ چڑھ کر

حصہ لیا۔ جس کے عوض ان میں سے بعض کو سرکاری مالیے میں معافی بھی ملتی ہے، صنعتی طور پر چنیوٹ میں لکڑی کا کام دو طرح کا ہے، ایک لکڑی میں کھدائی کا کام جسے ستھری کا کام کہا جاتا ہے، اور دوسرا جڑائی کا کام، جس کے ذریعے لکڑی میں پیتل کا کام کیا جاتا ہے۔ ستھری کے کام کا بہترین نمونہ یہاں کے تعزیئے ہیں جن کی تکمیل میں بعض اوقات دو دو سال بھی لگ جاتے ہیں۔ بناوٹ کے لحاظ سے یہ تعزیئے، افغان طرز تعمیر اور تاج محل طرز تعمیر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ افغان طرز تعمیر میں ظاہری شان و شوکت اور بھاری بھرکم پن زیادہ ہوتا ہے اور تاج محل طرز تعمیر اس کے برعکس ایک ہلکا پھلکا نگاہ کو بھلا لگنے والا نفیس کام ہوتا ہے، چنیوٹ کے آٹھ تعزیوں میں سے جن میں پانچ تعزیئے سنی نکالتے ہیں گاذروں، سیّدوں اور حضرت شادی ملنگ کے تعزیئے افغان طرز تعمیر اور کمانگروں، قصابوں اور غربی ٹھٹھی کے سیدوں کے تعزیئے تاج محل طرز تعمیر کے نمونے ہیں، پہلی طرز کو نافذ کرنے والے میاں الٰہی بخش ہیں اور دوسری طرز کے موجد میاں مولا بخش ہیں۔ جڑائی کے کام میں ایک دوسرے میاں مولا بخش پردہ ساز اور ان کے بھانجے میاں سلطان محمود مشہور تھے۔ چونکہ ہاتھ کے کام کو تجارتی سطح پر مہیا نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس کی قدر دانی اور خریداری محدود اہل ذوق حضرات پر منحصر ہے۔ تعزیوں کے علاوہ منقش ٹرے، میزیں، پردے، قلم دان یہاں کی خاص چیزیں ہیں۔ جو پیرس کی نمائشوں تک میں اول انعام حاصل کر چکی ہیں۔ پیتل کے کام کے علاوہ یہاں دیواروں پر بیل بوٹے بنانے میں کمانگر قوم کے افراد بھی مشہور ہیں۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے۔ مغل عہد میں یہ لوگ منقش کمانیں بناتے تھے اور اس قوم کے بعض افراد نے منقش تیر بنانے میں بھی کمال حاصل کر رکھا تھا۔ چنانچہ ایک ہی قوم کے لوگ کمان گر بھی تھے اور تیر گر بھی۔ جب سے توڑے دار بندوقوں نے میدان سنبھالا تیر کمان نے گوشۂ عافیت اختیار کر لیا۔ اب ان میں سے بعض لوگ لکڑی کا کام کرنے والے لوگوں کی طرح منقش ٹرے وغیرہ بھی تیار کرتے ہیں جو لکڑی کے سامان کی بہ نسبت سستے رہتے ہیں۔ لیکن محض رنگوں کی ملاوٹ سے وہ اثر پیدا کر لیا جاتا ہے، جو پیتل کے کام اور ستھری کے کام سے پیدا ہوتا ہے۔

دستکار قوموں میں ایک جماعت کپڑے کے کاریگروں کی بھی ہے جنہیں کھیس بنانے کی خصوصیت حاصل ہے۔ اس صنعت کے اس طرح رائج ہونے کی وجہ سمجھنے کے لئے ہمیں پنجاب کو دو حصوں میں پھر تقسیم کرنا ہوگا۔ ایک افغانی اثر والا علاقہ جس میں شلواریں رائج ہیں اور دوسرا محمد بن قاسم کے ذریعے عربی دائرہ اثر جہاں شلوار کی بجائے تہمد اور ڈھیلے ڈھالے کرتے اور چادریں

رائج ہیں۔ جہاں جہاں عربوں کا اثر پہنچا ہے وہاں کھیس یا خیش کی صنعت نے فروغ پایا ہے۔ کھیسوں کی بُنائی کے سلسلے میں چنیوٹ کے کاریگر اپنے دوسرے بھائیوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں، جو مظفر گڑھ ضلع کے اہم شہر لیہ اور چنیوٹ کے صدر مقام ضلع جھنگ میں اس صنعت کو فروغ دے رہے ہیں۔ اگر چہ اب ہجرت کے بعد پانی پت کے کمبل باف کاریگر بھی اس علاقے میں آباد ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک پرانے کاریگروں نے کمبل بافی کی طرف چنداں توجہ نہیں دی اور نہ ہی کمبل بُننے کے کاریگروں کو اپنی صنعت سے اتنی فرصت میسر ہے کہ وہ اسے کھیس بنانے پر صرف کر سکیں۔ اگر چہ خوجہ قوم میں مگوں قوم زیادہ تر زراعت پیشہ تھی لیکن اب انہوں نے تجارت کو زیادہ اپنا لیا ہے۔ تقسیم سے پہلے چنیوٹ کے خوجہ قوم کے افراد بنگال، آگرہ، مدراس، بمبئی غرضیکہ ہر منڈی پر چھائے ہوئے تھے۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد اب وہ مغربی پاکستان میں زیادہ اور مشرقی پاکستان میں نسبتاً کم آباد ہوئے ہیں۔

آخر میں مجھے ان روحانی شخصیتوں کا بھی ذکر کرنا ہے جن کے مزار چنیوٹ میں مرجع خاص و عام ہیں۔ جن کا روحانی فیض بہت حد تک چنیوٹ کے لوگوں کی ثقافتی اور مذہبی ترقی کا ذمہ دار ہے۔ ان میں مشہور حضرت شاہ برہان صاحب قادری ہیں جن کا مزار شاہجہانی عہد میں 1060ھ سے 1063ھ تک تیار ہوا اور دوسرے بزرگ حضرت شاہ جمال صاحب قادری اور حضرت شیخ حسین ہیں جن کے مزارات چنیوٹ کی پہاڑی پر واقع ہیں۔ بعینہ جس طرح حسن ابدال میں حضرت ولی قندھاری کا مزار ہے۔ آخری عہد کے بزرگوں میں حضرت پیر شیخ اسماعیل جن کے نام پر محلّہ شیخ اسماعیل مشہور ہے اور حضرت شاہ دولت جو سادات رجوعہ کے جد اعلیٰ اور حضرت مولوی نور احمد صاحب کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، جنہیں مقامی قوموں کے علاوہ نواحی علاقے کی قوم ہرل، کھرل اور دیگر زمیندار اقوام کے علاوہ سیدوں میں بھی کافی احترام حاصل تھا۔ غرضیکہ چنیوٹ مقامی اعتبار سے چھوٹے پیمانے پر خطہ یونان کا نمونہ رہا ہے اور سعد اللہ خان کے قول میں ذرا سے تصرف کے بعد کہا جا سکتا ہے۔

چنیوٹ را بجان برابر خریدہ ایم　　جان دادہ ایم جنت دیگر خریدہ ایم (6)

☆☆☆

قائداعظمؒ (7)

پچیس دسمبر کا دن سیدنا حضرت عیسیٰ کا یوم پیدائش بھی ہے اور مسلمانان ہندو پاکستان کے مسیحا، جناب قائداعظم محمد علی جناح کا یوم ولادت بھی۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ قائداعظم نے ایک امید وبیم کی حالت میں سے مسلمانوں کی قوم کو جس طرح نکالا، اسکی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

قدرت کا عجیب اتفاق ہے کہ 25 دسمبر 1876ء کو ایک متوسط گھرانے میں جنم لینے والا یہ نازک بدن خوش بخت بچہ آگے چل کر وہ کار ہائے نمایاں ظاہر کرنے والا تھا جو بڑے سے بڑے جری، دلاور اور رستم زماں کے بس کے روگ بھی نہ تھے یہ مرد مومن جس کی جرات رندانہ سے ایک طرف منو سمرتی کے سارے مکروفریب کے تارو پود بکھر گئے اور دوسری طرف برطانوی حکومت کی ساری عیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں، وہ نیک نیت، باخلوص اور باعزم نوجوان تھا۔ جس نے کبھی بھی اپنے بلند کردار اور اعلیٰ معیار کے منافی کوئی حرکت سرزد نہ کی اور جس کے حسن نیت اور کسی قیمت پر خریدے نہ جاسکنے کی داد اس کے جغادری حریف مسٹر گاندھی تک نے بھی دی۔ قدرت کی طرف سے اُسے ایسے حالات سے گزارا گیا جن سے اسکے کردار کی تعمیر پر دوررس اثرات ہوئے۔

بچپن میں والدہ ماجدہ کا انتقال، والد محترم کے کاروبار میں اچانک کمی اور چھوٹے بچوں کا داغ یتیمی ایسے اثرات تھے جنہوں نے قائداعظم کو اپنے پاؤں پر استقامت کے ساتھ کھڑے ہونے کی تربیت دی۔ چنانچہ سولہ برس کی عمر میں بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت کا سفر بھی انہیں اپنے آپ پر اعتماد کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ اور ولایت میں رہ کر انگریزی تہذیب کے ماحول میں قائداعظم نے اپنی ایمانی قوتوں اور آنے والی رہبرانہ صلاحیتوں کو اس قدر اجاگر کیا کہ ان کا وہاں تعلیم وتربیت پانا سیدنا حضرت موسیٰؑ کے فرعون کے گھر میں پرورش پانے کی مثال بن گیا، اور جب نوجوان محمد علی بیرسٹر ولایت سے ہندوستان پلٹا تو وہ انگریز سے بڑھ کر انگریز، ہندو بنیئے سے بدرجہا بلند محاسبہ کرنے والا شخص اور ایک نیک نیت، پُرخلوص اور دل دردمند سے بہرہ ور مسلمان تھا۔ ابتدائے کار ہی سے

بالائے سرش، ز ہوشمندی   می تافت، ستارہ بلندی (8)

ولایت میں بزرگ ہندو دادا بھائی نارو جی نے ابتدا ہی سے ان کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور انہیں اپنا سیکرٹری مقرر کیا۔ جبکہ قائداعظم ابھی نوعمر بچے ہی تھے۔ یہاں سے انکی سیاسی تربیت کا آغاز ہوا۔ ولایت سے پلٹنے کے فوراً ہی بعد ہندوستان کی امپیریل لاجیسلٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور ہندوستان میں اس وقت کے پائے کے چند لیڈروں کی صف میں شمار ہونے لگے۔ اس زمانے میں بعد میں آنے والے تنگ نظر ہندو لیڈروں کی طرح کے لوگ نہ تھے۔ بلکہ قائداعظم کے قدردانوں میں اگر پارسیوں میں سر دادا بھائی نارو جی اور سر دین شا پٹٹ جیسے بزرگ تھے تو ہندوؤں میں بھی لوکمانیہ تلک، سر تیج بہادر سپرو اور گوکھلے جیسے مہا پرش انکی جرات، دیانت، ذہانت اور اہلیت کے قائل تھے۔ اس 'صاحبی' کے زمانے میں بھی ہمارے قائداعظم نے ملک و ملت کے مفاد کو کبھی پس پشت نہ ڈالا اور جب اس وقت کی اعلیٰ عدالت پریوی کونسل نے پرائیویٹ وقف کو ناجائز قرار دیا تو مسلمانوں کے اس شرعی حق کو برقرار رکھنے کے لئے آخر 1913ء میں وقف ایکٹ بھی پاس کرایا۔ 1916ء تک قائداعظم کی کوششوں سے آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگرس میں مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں مفاہمت کی صورت پیدا ہوگئی۔ جس نے تاریخ میں 'لکھنو پیکٹ' کا نام پایا۔ اگر بعد میں آنے والے ہندو لیڈر اس میثاق لکھنو کو گلدستہ طاق نسیاں نہ بناتے تو آج ہند اور پاکستان کی حالت ہی اور ہوتی۔ غالباً ملک بھی تقسیم نہ ہوتا۔ اور جن سنگھ اور سیوک سنگھ جیسی کٹر فرقہ پرست جماعتیں بھی وجود میں نہ آتیں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ تحریک خلافت سے پہلے کانگرس کا وجود عدم وجود برابر تھا۔ ع۔ ہم کو دعائیں دو تمہیں دلبر بنا دیا! کے مصداق مولانا محمد علی، شوکت علی، مولانا حسرت موہانی اور ابوالکلام صاحب آزاد کے تحریک خلافت میں حصے لینے اور ہر دلعزیز ہو جانے سے گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے فائدہ اٹھایا۔ اور اس تحریک میں مسلمانوں کے ساتھ زبانی ہمدردی کا اظہار کر کے مسلمانوں میں بھی اپنی لیڈری کا سکہ چلایا۔ اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب

مسلمانوں کے چراغ سے انہوں نے اپنی لیڈری کا دیا روشن کرلیا ہے تو انہوں نے مسلمانوں کو انگریزی راج کے سائے میں اپنے غلام رکھنے کی سازش کی اور کہیں تو شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں چلائیں اور کئی مسلمانوں کو تجارت وصنعت، ملازمت وسیاست اور مناسب عزت وحرمت سے دور رکھنے کی چارہ جوئیاں جاری رکھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انگریز بھی ان کا ہم نوا تھا۔

یہ حالات تھے جب مسلمانوں کا کوئی مقام یا انتظام نہ تھا۔ بعض رہنما انہیں ہندو کانگریس کی گود میں پھینکنے کی کوششوں میں تھے۔ تو دوسرے انہیں انگریز صاحب ٹوڈی بنائے رکھنے پر مصر تھے۔ یہ حالات تھے جب حضرت علامہ اقبال نے الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے مسلمانان ہند کے لئے ایک آزاد اور خود مختار مملکت پاکستان کے حصول کا مطالبہ پیش کیا۔ منزل کے مقرر ہو جانے کے بعد اسکے حصول کے لئے جناب قائداعظم نے پریوی کونسل میں اپنی وکالت کو خیر باد کہا اور مسلمانان ہند کی سچائی کے لئے تشریف لے آئے۔ انگریز اور ہندو کا اتحاد ہو چکا تھا۔ صوبجاتی خودمختاری کے مل جانے پر بہار، اڑیسہ، یوپی۔ سی پی اور صوبہ سرحد میں کانگریس وزارتیں بن گئیں۔ جس سے جواہر لال نہرو کا دماغ چل نکلا اور طاقت کے نشے میں چور ہو کر اس نے ہانک لگائی کہ ہندوستان میں دو ہی طاقتیں تو ہیں۔ ایک انگریز اور دوسری ہندو کانگریس۔ اس وقت ہمارے قائداعظم کی ایک پرشکوہ آواز بھی بلند ہوئی کہ نہیں ایک تیسری طاقت بھی ہے اور وہ ہے اس وقت کے ہندوستانی مسلمان۔ قائداعظم نے اس دعوے کو کس طرح سچ کر دکھایا۔ یہ ہماری ملی تاریخ کا ایک درخشاں ترین باب ہے۔ قائداعظم کے ولایت سے تشریف لانے سے پہلے ہماری قوم ایک پراگندہ اور اور شیرازہ بکھری ہوئی قوم تھی۔ انہوں نے 1937ء سے لیکر 1947ء تک دن رات محنت کر کے اس کے جسد بے جان میں جان ڈال دی۔ وہ مسلمان قوم جو نا امیدی اور احساس کمتری کا شکار ہو چکی تھی، ایک سوئے ہوئے شیر کی طرح بیدار ہو کر اپنی بے پناہ قوت سے آشنا ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے افق عالم پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کو وجود میں لانے کا باعث ہوئی۔ ہم سیف وقلم کی قوتوں کے قائل تو ہمیشہ سے ہیں۔ لیکن ع مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی، کا نظارہ جو قائداعظم کے کردار میں نظر آتا ہے۔ وہ عدیم النظیر ہے۔ کسی نے سچ کہا تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح کا قلم سولشکروں پر بھاری ہے اور انہوں نے اس کو سچ کر دکھایا۔ انگریزوں کی حد درجہ کوشش

رہی کہ وہ ہندوستان کو متحد رکھے تا کہ وہ اسکی مشہور عالم فوج اور ہندوؤں کی اکثریت کے بل بوتے پر اس برعظیم کے جملہ وسائل سے بہرہ یاب ہو سکے۔ لیکن قائداعظم کی فراست نے ان دونوں بنیوں کے ناپاک اتحاد کا طلسم توڑ کر رکھ دیا اور اسلام کی روح کو از سرِ نو زندہ اور پائندہ رکھنے کی غرض سے مملکت آزاد پاکستان کے لئے انتھک کوشش کی۔ پاکستان کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے قائداعظم نے 30 اکتوبر 1947ء کو لاہور میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

''یاد رکھئے کہ قانون رائج الوقت کو سختی سے نافذ رکھنا ہر طرح کی ترقی کی ضمانت ہے۔ اسلام کے اصول ہمیں اس پر پابند رکھتے ہیں ہم اپنی ہمسائے کی حفاظت کریں۔ اور ذات پات کا لحاظ رکھے بغیر اپنے ملک میں بسنے والی اقلیتوں کی ہر طرح سے حفاظت کریں۔ اس امر کا لحاظ رکھے بغیر کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر کیا بیت رہی ہے۔ ہمیں اپنے ملک میں آباد اقلیتوں کی جان و مال کی حفاظت کرتے ہوئے انہیں یقین دلانا چاہیے کہ وہ ہر طرح محفوظ و مصئون ہیں۔ میں ہر مسلمان کے دل میں یہ امر راسخ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بدلہ لینے کا خیال دل سے نکال دے اور ضبط و نظم سے کام لے کیونکہ ادلے کے بدلے کے نام پر نظم و ضبط درہم برہم ہو جائے گا اور اس طرح سے وہ عمارت دھڑام سے گر پڑے گی۔ جس کی تعمیر پر ہماری قوم و ملت نے اتنا عرصہ لگایا اور محنت صرف کی ہے۔''

اس طرح آسٹریلیا کے لوگوں کے لئے ایک ریڈیو تقریر نشر فرماتے ہوئے انہوں نے 19 فروری 1948ء کو یوں کہا۔

''ہم محمد رسول اللہ کے احکام پر چلنے والے ہیں۔ ہم ملت اسلامیہ کی وسیع برادری کے افراد ہیں۔ جس میں حقوق و فرائض اور عزت و حرمت کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ نتیجتاً ہم میں گہری مساوات قائم ہے۔ لیکن یہ یقین رکھئے کہ پاکستان ایک مذہبی مملکت نہیں ہے۔ اسلام ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم دوسری اقوام سے بھی تعاون سے پیش آئیں اور جو قومیں ہمارے ساتھ اشتراک عمل پر آمادہ ہوں انہیں ہم تہ دل سے خوش آمدید کہیں اور اگر وہ پاکستان کو خوشحالی اور ترقی دینے میں برابر کے شریک ہونا چاہیں تو انکے راستے میں کوئی روڑے نہ اٹکائے جائیں''

یہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے دل کی آواز تھی۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ قائداعظم سے بڑھ کر ملت اسلامیہ کا کوئی فرد اس وقت موجود تھا۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا (9)

اقبالؒ کے ہاں (10)

حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کی ذات گرامی کے متعلق ایک ہیچ مدان کا کچھ کہنا' چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔لیکن ایک صحبت کی یاد میرے دل سے محو نہ ہوگی۔

1936ء قادیانیت کی شدید مخالفت کا زمانہ تھا۔ایک طرف تو مجلس احرار اور دوسرے علمائے اسلام اپنی تحریروں اور تقریروں سے ''قصر خلافت قادیان کی بنیادیں متزلزل'' کر رہے تھے اور دوسری طرف مرزائی صاحبان اپنی طویل اور قاطع دلیلیں سے ''سعید روحوں'' کو راہ راست پر لا رہے تھے۔ان ایام میں حضرت ممدوح علیل تھے۔لیکن طرفین کی وزنی دلیلیں، سیدھے سادھے نوجوانوں کو سوچنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہی تھیں۔اس لئے کئی ایک تشنگان ہدایت، رہنمائی حاصل کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔یہ محسوس کرتے ہوئے کہ نوجوان بڑی بیتابی کے ساتھ، آپ کے ارشادات عالیہ کے منتظر ہیں۔آپ نے اپنا شہرہ آفاق مضمون ''اسلام اور قادیانیت'' شائع فرمایا۔جس سے کئی ایک گتھیاں سلجھ گئیں اور وہ دلائل جو سیاق و سباق کا لحاظ رکھے بغیر، سادہ دل نوجوانوں کو گمراہ کر سکتی تھیں۔تارِ عنکبوت کی طرح کمزور نظر آنے لگیں اور نوجوانوں کی متوقع بے راہ روی کا مکمل سد باب ہوگیا۔

پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کو اس مضمون کے بعض حصے سمجھ میں نہ آئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اسلامی تعلیمات اور ماحول سے واقفیت نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے ''ماڈرن ریویو'' (11) (کلکتہ) میں مذکورہ مضمون پر تنقید لکھی جس کا جواب حضرت علامہ نے ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے تحریر فرمایا۔اس کی اشاعت سے دلوں کے رہے سہے شکوک بھی رفع ہو گئے۔

قصہ کوتاہ ہر طرف قادیانیت کے موافق یا مخالف تذکرے شروع تھے۔جن سے مساجد اور عام جلسہ گاہوں کے علاوہ مکلف کوٹھیوں کے خلوت کدے بھی خالی نہ تھے۔ان ایام میں یہی معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں صرف دو ہی فریق رہ گئے ہیں۔ایک وہ جو قادیانیت کا مخالف ہے اور دوسرا جو اس کے موافق۔ میں نے اس سال پنجاب یونیورسٹی کے تحت ایم۔اے (فارسی) کا امتحان دیا۔حضرت ممدوح ہمارے ایک پرچے کے ممتحن اعلیٰ تھے۔اور اس میں ممدوح نے اسلامی

تعلیمات کی روشنی میں خلافت الٰہیہ اور مہدد کے نظریے کے متعلق ایک سوال پوچھا تھا جس میں ضمنی طور پر قادیانیت بھی زیر بحث آ جاتی تھی۔

اپنے دوست، صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم کے ساتھ "جاوید منزل" میں مجھے حضرت ممدوح کی زیارت نصیب ہوئی۔ ہمارے جانے سے پیشتر قائداعظم مسٹر محمد علی جناح، کسب فیض کے بعد موٹر میں سوار کوٹھی سے نکل رہے تھے۔ آپ نے دروازہ تک ان کی مشائعت کی اور پھر ہماری طرف توجہ فرمائی۔ صوفی صاحب کو دیکھ کر تو آپ بس نہال ہی ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں ایک کھری چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ جس کے سرہانے چھوٹا سا تکیہ دھرا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے پائینتی کی طرف کوئی کپڑا نہ تھا۔ اس پر ایک کتاب کھلی ہوئی پڑی تھی۔ جس کے ایک خاص مقام پر پنسل دھری تھی۔ ایک کاپی شاید مختصر یادداشتوں کے لئے پاس تھی۔ حضرت ممدوح صرف سادہ سے کرتے اور شلوار میں ملبوس تھے۔ آخرالذکر پنجاب کی پانچ گزی شلوار اور پاجامے کے بین بین تھی۔ اللہ اللہ مشرق و مغرب کے جملہ علوم کا ماہر خرابیء صحت اور زیادتیء عمر کے باوجود اب بھی اس شان سے ہمہ تن مطالعہ تھا!

حضرت علامہ اور ہم "جاوید منزل" کے گول کمرے میں گئے۔ جس کی مشرقی فضا سے ہم بہت متاثر ہوئے۔ سب سے پہلے ایک قلفی دار، سادہ فرشی حقہ لایا گیا۔ جس میں نرم تمبا کو بھرا تھا۔ میں نے کڑوے تمباکو کا ذکر چھیڑا تو آپ نے جھنگ کے تمباکو کو سراہا۔ لیکن گلے کی تکلیف کے باعث اس سے لطف اندوز ہونے سے معذوری ظاہر فرمائی۔ ہم میں سے ممدوح کے ساتھ حقہ پینے کا شرف صوفی صاحب قبلہ کو حاصل ہوا۔

ادبیات پر گفتگو شروع ہونے پر مشرق و مغرب کے ادبیات زیر بحث آ گئے۔ جس میں حضرت علامہ سمندر کی سی وسعت کے مالک معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کے تبحر علمی کا یہ عالم تھا کہ جس موضوع پر گفتگو فرماتے تھے۔ یہی معلوم ہوتا تھا گویا ساری عمر آپ نے اسی کے مطالعہ میں صرف فرمائی ہے۔ ضمناً پنجاب کی ادبی روایات پر بھی بات چیت ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ آئندہ ان کے برقرار رکھے جانے کی امیدیں "نوجوانوں" سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ ایک (مخدومی پرنسپل) تاثیر (پی۔ ایچ ڈی کینٹب، ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر) اور دوسرے (محترمی) محمد اسد خان صاحب ملتانی بی۔ اے علی بخش چائے لایا اور آپ نے میٹھی چائے پر نمکین کو ترجیح دی۔ چائے کے ساتھ ساتھ مذہبیات کا دور شروع ہوا۔ میں نے "جاویدنامہ" کی ان تصریحات کے متعلق استصواب کیا۔

ع آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد (12)

آپ نے جواب میں قادیانیت اور اس کے بانی کی مختلف تحریروں اور دعاوی کے پیش نظر ظاہر فرمایا کہ ثانی الذکر کی شخصیت نفسیاتی مطالعہ کے لئے بہت موزوں ہے۔ صوفی صاحب بولے کہ آپ سے بڑھ کر موصوف کا تجزیہ نفسی کون کر سکے گا۔ ارشاد ہوا کہ موضوع واقعی بہت دلچسپ ہے لیکن صحت کی خرابی مانع ہے۔ کوئی نوجوان اس کام کے لئے اٹھے تو اس کی ہر ممکن امداد اور رہبری کروں گا۔ اس کے بعد آپ نے ان نقصانات کو گنایا جو قادیانیت کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں مذاہب عالم کو برداشت کرنے پڑے۔ پھر مختلف مذاہب سے اسلام کے امتیازات کو بشرح تمام واضح کر کے ارشاد فرمایا کہ اسلام نہ صرف دنیا کے مذاہب میں سے کامل ترین مذہب ہے بلکہ اس سلسلے میں جو ارتقائی بلندیاں انسان کو ودیعت کی گئی ہیں ان کی بھی آخری کڑی ہے۔ آپ اس نتیجے میں پر پہنچے کہ قادیانیت کی تعلیم، اسلام کی تیرہ سو سال کی علمی اور مذہبی ترقی کے کس طرح منافی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات پر آپ نے ظاہر فرمایا کہ قادیانیت کے ارکان اعلیٰ، اسلاف صالحین کی تحریروں کو محرف کر دیتے ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انہیں ایک خاص موضوع پر کسی مسلّمہ کتب کا علم تک بھی نہیں ہوتا۔ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے، ایل۔ ایل بی امیر جماعت احمدیہ لاہور کا ذکر بھی درمیان میں آیا۔ آخر کار میں نے عرض کیا کہ فریقین کی آراء کو ایک طرف رکھتے ہوئے۔ آپ مسئلہ ''ختم نبوت'' کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ الیوم اکملت لکم دینکم :لخ(13) کی صریح نص قرآنی کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ میں نے عرض کیا کہ آخر اسلام میں اور فرقے بھی تو ہیں۔ صرف قادیانی صاحبان کی مخالفت ہی کیوں کی جائے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ انکا اختلاف بنیادی نہیں بلکہ فروعی ہے اور حقیقت میں یہ اسلامی فرقے مختلف گروہ ہائے خیال (Schools of thoughts) ہیں جن کے اختلاف فقہ پر مبنی ہیں۔ ہر ایک فرقہ اسلام کے مسلّمات پر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ ایمان رکھتا ہے لیکن قانون اسلامی کے بعض حصوں کی تشریح میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہے۔ فقہیوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ تعجب ہوتا ہے کہ یہ اصحاب ''خشک'' ہونے کے باوجود حضور سرور کائنات ﷺ کے معاملے میں کس قدر حساس واقع ہوئے ہیں۔ ایک صاحب اٹھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فلاں کام اس طرح کیا اس دعوے کی تائید میں وہ ہر ممکن ثبوت (قرآن حدیث یا دیگر مآخذ سے) بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے صاحب اس کی تردید میں فرماتے ہیں کہ نہیں یہ کام حضور ﷺ نے یوں سرانجام دیا ہے۔ وہ اپنے دلائل الگ پیش کرتے ہیں۔ جس

سے مستفسر کو حضور ﷺ کی مبارک زندگی کے ایک خاص پہلو کے متعلق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ جہاں کہیں حضور ﷺ کا ذکر آیا ان جذبات سے عاری مفسرین کے دلوں میں محبت کے سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگ گئے۔ ان حضرات کی زندگی کا محبوب سرمایہ حضور ﷺ کا اسوہ حسنہ ہے۔ جس کے ہر پہلو کو اس قدر حزم و احتیاط سے ملحوظ رکھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہاں آپ نے Jealousy Guard کرتے ہیں، کا فقرہ ارشاد فرمایا تھا۔ اب تم خود اندازہ کر لو کہ ایسی محبوب و مفتخر ہستی کے جملہ اعزازات کے لئے کسی اور صاحب کو چن لینا، اسلامی علوم کی فلک رفعت عمارت کے انہدام سے مترادف نہ ہوگا؟ بانی مرزائیت کے کوائف زندگی اور انہی حالات میں حضور کے مبارک افعال کے تفاوت کی وضاحت کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے اور نبی کریم ﷺ کی محبت میں بہتے ہوئے آنسوؤں سے ہم شکوک کے داغوں کو دھوتے اور دلوں کو روشن کرتے، صوفی صاحب کے دولت کدے پر لوٹ آئے۔ سچ ہے

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا　　دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا (14)

☆☆☆

سفر بغداد شریف (15)

خدا تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس زمانے میں ہمیں حبیب اکرم، نور مجسم، شفیع المذنبین، رحمتہ اللعالمین، مفخر موجودات، صاحب لولاك لما خلقت الافلاك، علیه التحیه و اتسلیمات، احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ ﷺ کے نام لیواؤں میں داخل فرما کر حضور کے فرزند ارجمند، مفخر آلِ عبا، تو تیائی دودمانِ جناب محمد مصطفیٰ، فرزند دلبند سیدۃ النساء حضور فاطمتہ الزہرا جگر گوشۂ حضور مولا علیؓ مشکل کشا، شیر خدا یعنی جناب غوث الوریٰ، شہباز لا مکانی، حضرت میراں محی الدین سید عبد القادر الجیلانی، قدس سرہ النورانی ؓ کے خاص تربیت یافتہ فرزندان گرامی کے وابستگانِ دامن میں محض اپنی شفقت اور عنایت سے نہ کہ ہمارے کسی استحقاق یا بیان کردہ عمل کے صلے میں داخل فرمایا۔ فاالحمد لله علیٰ ذالك۔(16)

حضور غوث الثقلینؓ کا اپنا فرمان مبارک ہے کہ جنوں کے شیخ ہیں۔ انسانوں کے شیخ ہیں۔ لیکن ہم سب کے شیخ ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے جس شخص کا کوئی شیخ نہیں اس کا شیخ شیطان ہوتا ہے چنانچہ جتنے سلسلہ ہائے عالیہ ہیں۔ ان سب کو روحانی فیض سرکار غوث پاکؓ سے ہی پہنچا ہے لیکن سلسلہ عالیہ قادریہ پر حضور کا فیض خاص، عام فرمایا گیا ہے۔ بالخصوص سلسلہ عالیہ قادریہ جو حضور کے فرزندار جمند اکبر، الحافظ لجمال العراق، ارفع و اعلیٰ حضرت پیر سید عبد الرزاق صاحب سے چلا ہے اس پر باطنی طور پر اس قدر فیوض و برکات کی بارشیں فرمائی گئی ہیں۔ جن کا اندازہ راقم جیسے سگانِ دنیا کو تو کیا ہوگا۔ البتہ صاحب باطن اور اہل نظر پاک ہستیوں کو ان شفقتوں کا پورا پورا احساس ہے۔

حضرت پیر سید عبد الرزاق صاحب کے خانوادۂ گرامی میں قبلہء دل، کعبہء جاں، حضرت پیر مصطفیٰ صاحب وہ آفتاب ہیں جو ظاہری حیات میں بھی حضور غوث الوریٰؓ کے خاندان میں بہت سربلند اور حضور کے آستانہ عالیہ کے کلید بردار تھے۔ آپ کے فرزندان عالی تبار، سیدی و مرشدی و مولائی حضرت پیر احمد شرف الدین صاحب قادری اور حضرت پیر بہاؤ الدین ابراہیم صاحب ہیں جن کی نظر شفقت ہم غلامان سلسلہ عالیہ قادریہ کے لئے بالخصوص باعث صد رحمت و برکت ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان بابرکت ہستیوں کے وسیلے سے حضور غوث الوریٰ اور جناب محمد

مصطفیٰ ﷺ کا سایہ ازل تا ابد ہمارے سروں پر اور دنیا جہاں پر برقرار رکھے۔ آمین

یا خدا بہر جناب مصطفیٰ امداد کن　　یا رسول اللہ از بہر خدا امداد کن (17)

پاکستان میں حضور غوث پاکؓ کے ارادت کیشوں میں حضرت سلطان العارفین جناب سلطان باہو صاحب اور حضرت شیخ ولایت علی صاحب کے اسمائے گرامی ہمیشہ کے لئے درخشندہ و تابندہ ہیں۔ حضرت سلطان باہو صاحب تو حضور غوث پاک کے خاص مرتبہ شناس ہیں کیونکہ آپ ارفع و اعلیٰ حضرت پیر سید عبدالرزاق صاحب کے خاص منظور نظر اور تربیت یافتہ ہیں اور پاکستان و ہندوستان بھر میں ایسی کوئی اور پاک ہستی نہیں جو بارگاہ عالیہ غوثیہ میں آپ کی طرح مقبول اور محرم راز ہو۔ اس طرح حضرت شیخ ولایت علی صاحب جو میانی شریف لاہور میں آرام فرما ہیں۔ دربار عالیہ جناب غوث پاک میں منصب خاص پر فائز ہیں۔ سلسلہ عالیہ رزاقیہ کے دوسرے عالی قدر بزرگوں کی طرح جنھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو چھپائے رکھا اور اپنے رتبہ عالی کا اظہار نہ فرمایا۔ حضرت شیخ ولایت علی صاحب نے بھی ہمیشہ پردہ پوشی سے ہی کام لیا۔

حضرت شیخ ولایت علی صاحب کی والدہ ماجدہ کو حضور سرکار عالی جناب غوث الوریٰ سے سرکار کی خاص مہربانی اور شفقت کی وجہ سے خاص لگاؤ، ارادت اور محبت تھی اور انہوں نے اس زمانے میں بھی آستانہ عالیہ غوثیہ پر بغداد شریف میں حاضری دی جب کہ سفر کے موجودہ وسائل قریباً مفقود تھے۔ حضور غوث الوریٰ سے یہ محبت جناب شیخ ولایت علی صاحب کو گویا اپنی والدہ ماجدہ کی محبت کے طفیل عنایت فرمائی گئی تھی۔ چنانچہ آپ نے لاہور میں شاہ عالمی دروازے کے قریب، نیا بازار سے ملحق کوچہ غوثیہ میں جسے اس سے قبل کوچہ ڈوگراں کہا جاتا تھا۔ اپنے آبائی مکان میں عمر بھر ختم شریف کا سلسلہ برقرار رکھا اور ہر گیارہویں شریف کو حضور غوث پاکؓ کی خدمت عالی میں ہدیہ عقیدت و نیاز پیش فرماتے رہے اور اس میں کبھی بھی ناغہ نہیں کیا۔ کہتے ہیں کہ حضور غوث پاک کی نیاز، شیخ ولایت علی صاحب نے گیارہ کوڑیوں سے پیش کرنی شروع کی تھی۔ جس میں سرکار عالی کی مہربانی اور شفقت سے اضافہ ہوتا گیا۔ اب آپ کے فرزند گرامی قبلہ حافظ برکت علی صاحب مدظلہ عالی صاحب اس پاک باطنی سلسلے کو محض حضور کی عنایات اور شفقتوں سے برقرار رکھے ہوئے ہیں اور اگرچہ بظاہر آپ کے آرمی پریس سے جو ایک چھوٹا سے چھاپہ خانہ (پریس) ہے، کوئی اتنی آمدنی بھی نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی جس محبت، خلوص، شان و شوکت اور باقاعدگی سے حضور غوث پاک کا ختم شریف و لنگر شریف ایک مدت سے کوچہ غوثیہ والے پیر خانہ شریف میں دلوایا جاتا ہے۔

اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی ۔ یہ پیر خانہ شریف حضرت شیخ ولایت علی صاحب کے آبائی مکان میں واقع ہے جہاں ہر وقت سلسلہ ختم شریف حضور کے کرم سے جاری ہے۔ ختم شریف اور طرح کے ہیں ۔ روزانہ اور خاص خاص مواقع کے لئے ۔ روزانہ ختم شریف میں مریدین خاص سب سے پہلے باوضو اور دوزانو ہوکر صلی الله تعالیٰ حبیبه سید نا و مولانا محمد و آله واصحابه بقدر حسنه و جماله وسلم ۔(101) مرتبہ پڑھتے ہیں اس کے بعد ختم الانبیا(11) مرتبہ الحمد شریف سے شروع ہوتا ہے پھر درود شریف الهم صلی علیٰ سیدنا و مولانا محمد وآله واصحابه وسلم (360) مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔ درود شریف کے بعد (360) مرتبہ "یا هادی یا نور" اور "یا هادی یا منور" کا ورد ہوتا ہے۔ یا حضرت سید العرب والعجم شئیاً لله اور صلی الله علیك وسلم یا رسول الله ساری مجلس کی زبان پر ہوتا ہے۔ حضور آقا و مولا، شہنشاہ دو جہاں کی خدمت عالیہ میں ہدیہ نیاز کا سلسلہ یہیں پر ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد تمام حاضرین بارگاہ رسالت ﷺ میں اپنی معروضات کیساتھ ہدیہ درود و سلام ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ صلوات الله تعالیٰ سر مدا علی النبی محمد فریاد رس شئیاً حضرت المدد ! الصلوٰة والسلام علیك یا رسول الله ! الصلوٰة والسلام علیك یا حضرت سید العرب والعجم شئیاً لله ، مشکل کشا بالخیر یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیشہ حضور نبی اکرم ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں ۔ اے شہنشاہ دو جہاں! ہماری فریاد کو پہنچئے ۔ اے حضور ہماری مدد فرمایئے یا رسول الله صلی الله علیك وسلم آپ پر درود اور سلام! یا حضور شہنشاہ عرب وعجم! شیئاً لله ! ہماری مشکل کو اچھائی کے ساتھ آسان فرمایئے ۔ جس محبت اور خلوص سے یہ ہدیہ ارادت پیش کیا جاتا ہے اس کا لطف کچھ وہی قلوب جانتے ہیں جنہیں اس پاک فضا میں چند لمحات بسر کرنیکی سعادت نصیب ہے حضور کے عشاقِ گرامی کا حلقہ اس کے بعد ہدیہ درود پیش کرتا ہے۔ الهم صلی علی سید نا محمد وعلیٰ آل سیدنا محمد واصحاب سیدنا محمد و بارك وسلم علیهم اور الحمد شریف کے بعد ختم شریف کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس طرح ساری مجلس باوضو، باادب اور دوزانو ہوکر یہ ورد کرتی ہے۔ یا حضرت، یا سرور صلی الله علیك وسلم ! یا صدیقؓ ، یا عمرؓ یا عثمانؓ یا حیدرؓ، یا شبیرؓ یا شبرؓ ! شر کن دافع خیر آور! یعنی اے حضور انور نبی اکرم صلی الله علیك وسلم یا حضرت صدیق اکبرؓ حضرت عمرؓ یا جناب عثمانؓ و یا حیدرؓ،

یا جناب شبیرؓ یا جناب شبرؓ شر کو دفع فرمایئے۔ اور ہمارے لئے نیکی اور بہتری لایئے۔ الحمد شریف کے بعد اسم ذات اللہ اللہ کا ورد ہوتا ہے جو بعد میں اللہ ھو! میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اتنے میں لنگر شریف کے خوان جن میں انواع واقسام کے پکے کھانے، مٹھائیاں اور موسم کے لحاظ سے پھل ہوتے ہیں جو بزرگان عالی کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ ان کے پیش کرنے کا طریقہ اس طرح پر ہے کہ سب سے پہلے قرآن حکیم کی کوئی سورۃ مبارک پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد سورۃ الکافرون. قل شریف ، قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس پڑھ کر سورۃ الحمد پڑھی جاتی ہے اور الم پڑھ کر جب اولـئك علىٰ هد ی من ربهم و اولئك هـم الـمفلحون (18) پر پہنچتے ہیں تو اس کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی طرف ان آیات مبارکہ سے مضمون کو راجع کیا جاتا ہے۔ ان رحمت الله قريباً من المحسنين (بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت یعنی رحمت العالمین، شفیع المذنبین، حضور نبی اکرم ﷺ محسنین کے قریب ہیں) وما ارسلـنـاك الا رحمته اللعالمين (19) یعنی اے محبوب پاک ﷺ ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ ماکـان مـحـمـد ابـا احـد من رجالكم ولـكـن الـرسول الله و خاتم النبين (20) (حضور نبی اکرم ﷺ تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں مگر وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اور سلسلہ نبوت کو اپنی ذات برکات پر ختم فرمانے والے ہیں)۔ ان الـلـه و مـلـئـكـتـه يـصلون على النبى يا ايهاالذين امنو صلو اعليه وسـلـمـو اتسليـمـا (21)! بے شک خود ذات باری تعالیٰ اور ان کے فرشتے (بلکہ کل انبیا اور کائنات) حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات والا صفات پر درود وسلام بھیجتے ہیں (بلا قید زماں یعنی ہر وقت، ازل تا ابد) اس لئے اے ایمان والو (تم پر بھی لازم ہے کہ) آپ ہر وقت درود سلام کا تحفہ بھیجتے رہو۔ اس کے بعد کم از کم تین بار الهم صـلـى عـلـىٰ سيـدنـا محمد و علىٰ آل سيدنا مـحـمـد و اصـحـاب سيدنا محمد و بارك وسلم عليهم کا تحفہ خدمت والا میں بوسیلہ حضور غوث الوریٰؓ پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ نعرہ محبت آئندہ رات پر ملتوی ہو جاتا ہے خاص خاص موقع کے لئے نعت خوانی بھی ہوتی ہے اور بالخصوص وہ مقبول بارگاہ نعتیں جنکے مطالع الانوار ہیں:

دستگیر دو جہاں حضرت غوث الثقلین   مظہر ذات نہاں حضرت غوث الغلمین (22)

اور

خدا خود والہ وشیدا، جناب غوث اعظم کا   سر عالم میں ہے سودا، جناب غوث اعظم کا (23)

سب مریدان حضور غوث الوریٰ ہم آواز پڑھتے ہیں اور جو نقشہ فرمایا گیا ہے کہ

دل مضطر کی کیفیت بدل جاتی ہے دم بھر میں ہے کیا پرکیف نظارہ جناب غوث اعظم کا (24)

وہ ہو بہو وجود میں آجاتا ہے اور دلوں کی کیفیت کچھ اس طرح بدل جاتی ہے اور دل اس قدر موم اور حضور اکرم ﷺ اور جناب پنجتن پاک اور مفخر آل عبا، حضور میراں محی الدین سید عبدالقادر الجیلانیؒ کی محبت پاک آنکھوں سے برسات کا ساں پیدا کر دیتی ہے۔ ربنا و ارزقنا حبك و حب حبيبك و حب غوث الثقلين (25)۔ (آمین ثم آمین)

عقیدتمندان دربار عالیہ غوثیہ کے دلوں میں آستانہ اقدس حضور غوث الثقلینؓ کے آستانہ عالیہ پر حاضری دینے کی آرزو مدتوں سے مستور تھی اور بارگاہ عالیہ پر جبین ناز کو سنگ آستان پر دھر دینے کے لئے ایک عمر سے کئی ایک سجدے جبین میں تڑپ رہے تھے کہ ہمیں برادرم صاجبزادہ محمد اشفاق صاحب فرزند قبلہ حافظ برکت علی صاحب کی خدمت میں اس آرزو کے اظہار کی جسارت ہوئی۔ برادر عزیز محمد اشفاق صاحب کے ذریعے یہ درخواست قبلہ حافظ صاحب کی خدمت عالی میں پیش کی گئی تو ارشاد ہوا کہ اس بارے میں ایک اہم معاملہ ارفع و اعلیٰ حضرت پیر سید عبدالرزاق صاحبؒ کی خدمت عالی میں زیر غور ہے۔ کیا تعجب ہے کہ ہماری یہ عرضداشت قبول بارگاہ ہو جائے اور ہمیں بھی اپنی اس دعا کو بار آور دیکھنے کا موقعہ مل جائے کہ

دراقدس پہ سر رکھنا مجھے مل جائے گر حافظ دل غم دیدہ کیوں نہ پھر سدا مسرور ہو جائے (26)

بالآخر ایک مبارک دن شعبان المکرم گزشتہ میں ہمیں یہ خوش خبری ملی کہ عرضداشت قبول فرمائی گئی ہے اور اسم مبارک سرکار غوث الوریٰؓ کی نسبت سے سات خوش بخت صاحبوں کے لئے یہ سعادت مخصوص فرمائی گئی ہے۔ اب گروہ عشاق دن رات دعائیں مانگیں اور کعبہ دل قبلہ جاں حضرت اقدس حضرت پیر مصطفیٰ صاحبؒ کی خدمت میں بڑھ بڑھ کر عرضداشتیں پیش کیں۔ آخر کار طے فرمایا گیا کہ قبلہ حافظ برکت علی صاحب مدظلہ العالی اس مختصر گروہ عشاق کے سربراہ ہوں اور آپ کے ہم رکاب ہونے کا شرف برادرم صاجبزادہ محمد اشفاق صاحب، برادرم حاجی فیض محمد صاحب، برادرم مستری محمد تقی صاحب، برادرم پہلوان معراج دین صاحب اور برادرم محمد بشیر صاحب، راقم الحروف کے علاوہ حاصل ہو۔ مجھے سخت حیرت اور تعجب ہے کہ اگرچہ اس بندۂ عاصی نے بھی حضرت یوسفؑ کی خریداری کا دم بھرنے والی روایتی بڑھیا کی طرح حضور کے آستانہ عالیہ پر حاضری کے لئے درخواست ڈرتے ڈرتے پیش کی تھی لیکن مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ میں

اس سعادت عظمیٰ سے ہم کنار ہونے کا کوئی حق اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ حضرت یوسفؑ کی خریدار بڑھیامائی کے پاس کم از کم روئی کی انٹی تو تھی اور میرے دامن میں کسی متاع ہنر کا تو کیا وجود ہوتا البتہ ''بدنام کنندہ نکوخامے چند'' کا سرٹیفکیٹ ضرور موجود تھا۔ مجھے تعجب در تعجب ہے کہ میرے جیسے ننگ خلائق کو بھی اس مقدس قافلے میں شامل ہونے کی سعادت ارزانی فرمائی گئی۔ سچ ہے

دو جگ تے شہِ میراں دا سایہ   جو جئیں منگیا سوئس پایا (27)

رمضان المبارک میں ارشاد ہوا کہ سفر کا اندازہ سات سات سو روپے فی کس ہے۔ یہ رقم جلدی جمع کرادی جائے تاکہ پاسپورٹ ویزا اور سیٹوں کے بک کرنے کرانے وغیرہ میں آسانی رہے۔ جس روز یہ ارشاد گرامی ہوا راقم کے پاس دو تین سو روپے کے سوا کوئی رقم موجود نہ تھی لیکن چند دنوں میں ہی اتنی آسانی سے رقم مہیا فرمادی گئی جس کا کبھی کوئی امکان بھی نظر نہ آتا تھا۔ اور تو اور روانگی سے ایک ہی دن پہلے ایک دوست کے ذریعے حضور نے کافی رقم اور بھی عطا فرمادی جو میری غیر حاضری میں گھر والوں کے لئے کافی تھی۔ 16 اپریل کو راقم کے سوا باقی تمام برادران کے زیارتی پاسپورٹوں کا معاملہ لاہور کے مجسٹریٹ صاحب متعلقہ کے در پیش تھا جنہوں نے سب درخواست گزاروں کو اپنی تشفی کے لئے طلب کیا ہوا تھا۔ میں ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت میں اس گروہ عشاق کے ساتھ تھا اور میری درخواست پر قبلہ حافظ برکت علی صاحب پیر خانہ شریف ہی میں رہ گئے تھے کیونکہ میں نے عرض کیا تھا کہ باقی پیر بھائی اصالتاً تشریف لے چلیں اور قبلہ حافظ صاحب کی طرف سے وکالتاً حاضری ہو جائے گی۔ بزرگان سلسلہ عالیہ رزاقیہ قادری کی یہ ایک کھلی کرامت ہے کہ مجسٹریٹ صاحب متعلقہ نے قبلہ حافظ صاحب کے متعلق تو کچھ پوچھا تک بھی نہیں تھا البتہ دوسرے برادران کو ایک ایک نظر دیکھتے ہی بھانپ گئے کہ یہ احباب حقیقتاً کوئے محبت حضور غوث الثقلینؓ کے مشتاق ہیں۔ میں چونکہ لباس وکالت میں تھا اس لئے انہوں نے میرے بیان کو ہی بظاہر کافی سمجھا اور ان حالات میں جبکہ ایسے لوگوں کے روپے بھی واپس کئے جا رہے تھے جو زیارتی پاسپورٹ بنوا چکے تھے۔ صاحب موصوف نے ہمارے احباب کے پاسپورٹ فوراً جاری کرنے منظور فرمائے۔ میرے بین الاقوامی پاسپورٹ پر ایک پرانی تصویر چسپاں تھی جبکہ ریش و بُروت (28) کے زیور سے معرا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے نئے فوٹوگراف کے تبدیل کئے جانے کے متعلق 16 اپریل 1956ء کو ہی درخواست دی جو 18 اپریل کو منظور ہو گئی اور چند ہی دنوں میں حضور کی نوازش سے اس بارے میں آخری مرحلہ بھی طے ہو گیا۔

21 رمضان المبارک 1374 ہجری کی شام جبکہ برادران سلسلہ عالیہ حضور پرنور، مولا مشکل کشا، شیر خدا علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی خدمت عالی میں ہدیہ ختم شریف پیش کرنے میں موجود تھے۔ مقررہ ٹیکے لگانے والے صاحب بھی تشریف لائے جنہوں نے علاوہ رسمی دیکھ بھال کے ہر ایک مشتاق زیارت کو تین تین ٹیکے لگائے جو ہیضے کے انسداد کے لئے تھے۔ گویا 21 رمضان المبارک کو سات مریدان حضور غوث الوریٰ کو ٹیکے کی سوئی نے اکیس بار مس کیا اور لطف یہ ہے کہ اس سلسلے میں دوائیوں وغیرہ پر اکیس ہی روپے خرچ ہوئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حضور مولائی خیبر کشاؓ کے روز مبارک کے اعزاز میں اکیس ہی کا حکم چلا ہے۔ گویا اکیس رمضان المبارک سے اکیسویں دن ہمارے اس مقدس سفر کا آغاز پذیر ہونا قرار پایا ہے۔ یہ مبارک دن 21 مئی 1956ء بمطابق 12 شوال المکرم 1374ھ تھا اور قبلہ حافظ صاحب اور ان کے تمام نیاز مندوں نے حسب معمول گیارھویں شریف کا ختم شریف پڑھنے کے بعد دوسرے دن (منگل وار) کو دو بجنے میں گیارہ منٹ رہتے تھے جب کہ پیر خانہ شریف سے رخصت ہو کر باہر کوچہ غوثیہ میں تشریف فرما ہوئے۔ اور سب بھائیوں نے اس وقت سی حرفی مقبول ''درمان دل ملول'' جو کہ حضور سرکار غوثیت مآب کی منظور فرمائی ہوئی اور ہر بلا کی دافع اور ہر امر میں مستند طور پر نافع ہے کا ورد آغاز ہوا۔ رخصت کے وقت کا سماں قابل دید تھا۔ حضور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی میں سورۂ الم نشرح کی تفسیر فرماتے ہوئے حضور عالی سرکار دو جہاں، شفیع المذنبینؐ، رحمتہ اللعالمین مولائے کل، ہادی سبل حضور نبی مکرم و اکرمؐ کے واقعہ انشراح صدر کی تشریف میں فرمایا ہے کہ ولی کو ولی اور نبی کو نبی پہچانتا ہے لیکن چونکہ حضور نبی اکرمؐ کے مقام عالی کا سوائے حضور کے اور کسی کو علم نہیں اس لئے میری دانست میں حضور کے سینہ مقدس کو یوں فرض کر لیا جائے گویا ایک وسیع و عریض میدان میں ایک عالیشان عمارت جس میں بارہ منزلیں ہیں، استوار ہے اور ہر ایک منزل میں حضور ایک نرالی شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں کسی منزل میں حضور ایک شہنشاہ بے عدیل و مثال کی حیثیت میں تشریف فرما ہیں اور دنیا جہاں کے حکمران حضور کے اشارۂ چشم و ابرو سے جہانبانی اور جہاں بینی کے گُر حاصل کر رہے ہیں اور کسی منزل میں حضور ایک کمانڈر اعظم اور فاتح کی حیثیت میں تشریف فرما ہیں اور تمام فاتحین عالم کے لیے مشعل ہدایت ہیں۔ کہیں حضور صاف طور پر کونین کے مقتدا، ہر قسم کی مخلوق اور تمام جہانوں کے لئے ہادی برحق اور مرشد کامل کے روشن ترین لباس میں آرام فرما ہیں اور بارہویں منزل میں حضور پُرنور ایسے محبوب پاک نظر آتے ہیں جو

کعبے کی مانند ہیں اور دمبدم دل اقدس پر انوار الٰہی کی تجلیات کا نزول ہو رہا ہے۔ اس حیثیت میں حضور کے پاک اور محبوب ترین جلوہ عالی کے ایک پرتو، ایک عکس، ایک چھوٹی سی جھلک کی آرزو میں مشتاقان جمال اور عشاق کے شوق کا یہ عالم ہے کہ اطراف واکناف عالم سے کسی دنیاوی طمع کے بغیر اور کسی روحانی سربلندی کے لالچ سے بے پرواہو کر در اقدس کی طرف جاں نثارانہ دوڑے چلے آتے ہیں اور در اقدس پر دمبدم سجدات کررہے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب آگے چل کر بیان فرماتے ہیں کہ حضور پر ہی محبوبیت کا کمال ختم ہے اور نوع بشر میں سے محبوبیت کا درجہ اور کسی کے لئے مختص نہیں فرمایا گیا۔ البتہ حضور نبی اکرم ؐ کی امت میں سے خاص ہستیوں کو درجہ محبوبیت حضور کے طفیل میسر ہے جس کی وجہ سے ان پاک اور مبارک ہستیوں کی محبت بھی دلوں میں جاگزیں ہوگئی ہے اور اسی محبوبیت کے طفیل حضور نبی اکرم ؐ کی طرح یہ پاک ہستیاں بھی ہر قسم کی خلائق کی مسجود اور دلوں کی محبوب ہیں۔ اور یہ پاک ہستیاں کون ہیں؟

حضور والا قطب الاقطاب، شہباز لامکانی، حضرت میراں، پیر دستگیر سید محی الدین، سید عبدالقادر الجیلانی، قدس سرہٗ النورانی اور حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء رضوان اللہ تعالیٰ علیھم اجمعین! راقم کو یقین ہے کہ زائران کو چہء عالیہ غوثیہ کو رخصت کے وقت جس محبت اور خلوص سے تمام محبان سرکار غوث الوریٰ نے جن میں سے اکثر راقم الحروف کے واقف اور کئی ایک راقم الحروف کو جانتے بھی نہ تھے۔ الوداع کہی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ حضور غوث الوریٰؓ کی محبوبیت کے صدقے میں حضور کے نیازمندوں کے لئے بھی لوگوں میں محبت اور احترام کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ خدا جانے کہاں کہاں کے محبان سرکار غوث الوریٰ نے اس مقدس قافلے کے ساتھ ساتھ مجھ جیسے حقیر اور سراپا تقصیر کو بھی گلدستوں اور پھولوں کے ہاروں سے فی الحقیقت لاد دیا۔ پیرخانہ شریف سے ہی حرفی پاک کا ورد کرتے ہوئے یہ قافلہ مسجد عالیہ غوثیہ میں پہنچا اور اس تھوڑے سے فاصلے میں عقیدتمندان دربار عالیہ غوثیہ نے قدم پر دودھ، شربت کی سبیلیں لگا رکھی تھیں اور اس وقت اس قدر مجمع خلائق تھا کہ اس پر حیرت ہوتی تھی۔ مسجد شریف میں پہنچ کر ظہر کی نماز ادا کی گئی اور کوچہ عالیہ غوثیہ کے خوش صحت پیر بھائی باری باری قبلہ حافظ صاحب، برادرم صاحبزادہ محمد اشفاق صاحب، حاجی فیض محمد صاحب، بھائی محمد بشیر صاحب، پہلوان معراج دین صاحب، مستری محمد تقی صاحب اور اس خادم کے گلے ملے اور پھر پھولوں کی بارش کا دوسرا دور چلا جبکہ اس مقدس قافلے نے مسجد غوثیہ سے لے کر نیا بازار کے چوک والا مختصر سا راستہ بھی کافی

وقت کے بعد طے کیا۔ سائلان دربار عالیہ غوثیہ کا ایک بے پناہ ہجوم تھا جو قبلہ حافظ صاحب کی وساطت گرامی سے دربار کو آیا۔ سرکار غوث الوریٰ میں اپنی اپنی مرادوں کی درخواستیں پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس ہجوم میں مجھے ایک محترمہ کا والہانہ انداز التجانہ بھولے گا جو بآواز بلند عرض کر رہی تھی کہ دربار عالی میں میری جانب سے عرض کرنا کہ میرا بیٹا فضل حسین جلد گھر آوے۔ اس کی نسبت معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا اس وقت دماغی امراض کے ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ تاج دین صاحب کارپوریشن کونسلر صاحب بھی نہایت عاجزی سے عرض کر رہے تھے کہ سرکار کے دربار عالی میں ان کے حق میں عطائے فرزند نرینہ کی درخواست پیش کی جاوے۔ بہت سے احباب تحریری درخواستیں بھی پیش کر رہے تھے کہ بغداد شریف پہنچ کر آستانہ سرکار غوث الوریٰ میں جالی مبارک کے اندر پیش کر دی جاوے۔ اس وقت تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ دربار عالیہ غوثیہ میں شان رحمت اللعالمینی پورے جوبن پر ہے اور ہر طالب کے لئے صلائے عام ہے کہ اس دربار عالی سے جو چاہے طلب کر لے۔ بقول رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی مرحوم

غوث الاعظمؒ سے جو چاہو گے ملے گا حسرت　　　پھر کہو حاضر دربار ہوں شیئاً للہ! (29)

21 رمضان المبارک کے اجلال واحترام میں ہمارے لئے یہ فرمان تھا کہ اس گاڑی پر چلنا ہے جو اکیس گھنٹے میں لاہور سے کراچی پہنچتی ہے۔ لامحالہ یہ گاڑی پاکستان کوئین تھی جسے پاک ریلوے نے تیز گام کا نیا نام بخشا ہے حالانکہ گاڑی قدم نہیں اٹھاتی بلکہ پہیوں پر چلتی ہے۔ اس لئے اس کا موزوں نام تیز رو، صبا رفتار یا عوامی نام طوفان میل موزوں تھا۔ بہرصورت جب ہم تیز گام کے تھان (یعنی لاہور ریلوے سٹیشن) پر پہنچے تو اس وقت الوداع کہنے والے مریدانِ باخلاص سرکار غوثیت مدار کا کافی ہجوم تھا جن میں سب برادران قافلہ کے عزیز، رشتہ دار، دوست اور پیر بھائی شامل تھے۔ بندہ کے احباب میں سید منیر حسین صاحب ایم۔ اے، شیخ داؤد قدس اور حاجی قادر بخش صاحب موجود تھے۔ جناب والد صاحب قبلہ اور والدہ صاحبہ نے بھی علالت کے باوجود ریلوے سٹیشن پر مجھے اپنی دعاؤں سے نوازا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ حضور غوث العلمین کے صدقے میں بندہ کو ان کی خدمت کرنے کا موقع عطا فرمائے اور حضور غوثیت مآب کا سایہ و رحمت میرے والدین پر بھی رہے۔ آمین۔ نیازمندان شوق کے قافلے کو اپنے دامن میں لئے 'تیز گام' نے ایک طرارہ جو بھرا تو منٹگمری پہنچ کر دم لیا۔ گویا جس طرح شوق کا تقاضا تھا کہ کسی طرح اڑ کر بارگاہ غوثیت میں پہنچیں اور جبین نیاز کو در اقدس پر دھر کر دم لیں۔ اس طرح ہوا اور ہم بلا مبالغہ شوق کے پروں پر

اترتے چلے گئے۔ یہ بھی ایک کرامت ہے۔ ہمارے لئے سیکنڈ کلاس کی اکٹھی سیٹیں صرف 'تیز گام' پر ہی ملیں جس پر سوار ہو کر جانا ہمارے لئے مقدر فرمایا جا چکا تھا۔ منٹگمری پہنچے تو برادرم سلطان احمد منٹگمری بسکٹوں کی ایک پیٹی لے کر جس کا پہلے ہی آرڈر دیا جا چکا تھا اور اور بہت وافر کھانا لے کر موجود تھے۔ شیخ محمد امین صاحب برادر اکبر شیخ محمد شفیع بانی بسکٹ فیکٹری منٹگمری نہایت خاموشی سے منٹگمری کے قافلے کی سربراہی کر رہے تھے۔ گویا قبلہء دل، کعبہ جاں حضرت پیر مصطفیٰ صاحب کی شفقتوں اور عنایتوں کی یہ پہلی دعوت تھی جو گھر سے روانہ ہوتے ہی گاڑی کے پہلے مستقر پر ہمیں عطا ہوئی۔ اس دعوت کو ہم سب نے سیر ہو کر کھایا بلکہ کچھ حصہ صبح کے لئے بھی بچ رہا۔ اگر چہ ہمارے موسمی سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں برف رکھوائی گئی تھی لیکن منٹگمری سے بھی برف کا ایک سانچہ ہماری ہمراہ کر دیا گیا۔ ہمارے اس قافلے کے ہمراہ کراچی تک میرے دوست حاجی رانا رشید احمد صاحب قادری اور جو برادرم معراج دین کے بھانجے ہیں، ہمراہ آئے۔ دوسرے دن یعنی 23 مئی کی صبح کو میں حیدر آباد سندھ سے آگے برادرم رانا رشید احمد صاحب کے پاس ان کے ڈبے میں جا بیٹھا۔ جہاں قبلہ حافظ برکت علی صاحب کی طرف سے سرکاری دعوت کا ایک وافر حصہ ہمارے ڈبے میں پہنچ گیا۔ مجھے مسرت ہے کہ برادرم رانا رشید احمد صاحب کی سخاوت سے اس ڈبے کے سارے مسافر سرکاری لنگر سے سرفراز ہوئے۔ اور فیضان قادریہ کا حصہ، جو ان کے لئے مقدر تھا۔ رانا صاحب کی معرفت ان تک پہنچ گیا۔ عین اکیس گھنٹے کے سفر کے بعد قبلہ حافظ صاحب کی سرکردگی میں یہ قافلہ کراچی پہنچ گیا۔ جب ہم برادرم حاجی فیض محمد صاحب کے ایک دوست میاں غلام نبی صاحب، فروٹ مرچنٹ کی دکان متصل مسجد جامع کراچی میں پہنچ گئے۔ جس کا خدا جانے کس نے گنگا جمنی نام ''نیو میمن مسجد'' تجویز کیا ہے۔ عقیدتمندان سرکار غوث مآب ہی اس مسجد کی تعمیر کے ذمہ دار ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس مسجد کو سرکار کے اسم گرامی سے نسبت دی جاتی۔ عام طور پر شاہی مساجد سے لے کر عام لوگوں کی تعمیر کی ہوئی مساجد میں گل سر سبد کے طور پر افضل الذکر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اس مسجد کی پیشانی پر نہ بسم اللہ الرحمن الرحیم اور نہ ہی کلمہ شریف درج ہے بلکہ آیہء مبارک و من دخلہ کان آمنا (30) تحریر کی گئی ہے جو بیت اللہ شریف سے مخصوص ہے۔ برادرم غلام نبی صاحب کے ذریعے ہمارے عراق شریف کے لئے ویزے پہلے سے منظور کرائے رکھے تھے اور اب ہمیں صرف زرمبادلہ لینا تھا۔ جس کے لئے برادرم غلام نبی صاحب نے چھکن شاہ صاحب کو

تکلیف دے رکھی تھی۔ یہ حضرت زائرین عراق شریف کو اس قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں اور ایک کاروباری وکیل کی طرح اپنے موکلوں کو پوری پوری آسائش بہم پہنچانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اس بارے میں انہوں نے بہت سا کام اپنے نائبین کو بانٹ رکھا ہے۔ جن کے دونو جوان نائب جو لاہور کے باشندے ہیں۔ نہایت خلیق اور ہمارے لئے کارآمد ثابت ہوئے۔ ایک اور صاحب جو ویسے پنجابی تھے ہمیں بلا وجہ رعونت پسند نظر آئے لیکن سرکار عالی کا کرم چونکہ ہمارے شامل حال تھا اس لئے ہمیں اس بارے میں غیبی امداد ملی اور چھکن شاہ کے دو لاہوری نوجوان ہمارے شناسا ہی نکل آئے جنہوں نے اپنی بساط بھر ہمیں سہولت پہنچائی۔ بدقسمتی سے 24 مئی کو زر مبادلہ کے کاغذات مکمل نہ ہو سکے۔ اس لئے ہمیں جمعہ شریف 25 مئی کو ایسٹرن بنک میں جا کر کوشش کر کے بنک مذکورہ کی شاخ بصرہ شریف کے نام چالیس چالیس پاؤنڈ کا حکم ادائیگی لینا پڑا۔ سرکاری حکم کے ماتحت ہمیں بارہ بج کر گیارہ منٹ پر روانہ ہو جانا تھا۔ اس لئے حضور کی مہربانی سے گیارہ بجے کے قریب ہم بنک سے فارغ ہو کر غلام نبی صاحب کی دوکان پر پہنچ گئے۔ بندرگاہ پر سب سے پہلے ہمیں پاکستان کے کسٹم والوں سے واسطہ پڑا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ سارا کام ایک سوچی سمجھی سکیم اور خاص ترتیب کے ساتھ انجام دیا جائے۔ یہ درست ہے کہ اکثر بدنام کنندہ نکوناے چند قسم کے لوگوں نے زائرین اور حجاج کے گروہ کو کسٹم کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے بدنام کر رکھا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ گھر سے سفر حج اور زیارات کے نیک ارادے سے نکلیں۔ وہ اکوئی ایسے مجرم ہوتے ہیں جن کے متعلق شروع ہی سے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ یہ چور یا ڈاکو ہیں۔ میری رائے میں جس طرح ہر کارخانہ یا فیکٹری میں کارخانہ جات اور مزدوروں سے متعلقہ قانون کے متعلق ایک پوسٹر موجود ہوتا ہے اس طرح لینڈ کسٹم اور بحری کسٹم کے قوانین کا خلاصہ، ان تمام قوانین کے علاوہ جو پاکستان میں داخلے کے متعلق ہیں اور ان اشیاء کی فہرست جو کسٹم سے مستثنیٰ ہیں یا ان پر کس قدر کسٹم عائد ہوتا ہے۔ ہر کسٹم کی چوکی پر نمایاں جگہ چسپاں ہونی چاہئیں۔ ہمارے پاکستان میں تاجر پیشہ طبقہ کے سوا عام لوگوں (بالخصوص زائرین اور حجاج کو جن میں بوڑھے اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے) کو ان قوانین کا بہت کم علم ہے اور ہو سکتا ہے کہ جس چیز پر چند روپے کی رقم بطور کسٹم واجب الادا ہو، اس پر صحیح قانونی مطالبہ کی بجائے بہت زیادہ رقم ناجائز طور پر وصول ہو رہی ہو۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ دور دراز سے آئے ہوئے حجاج اور زائرین کو بڑے شہروں مثلاً کراچی یا لاہور کی ترقی یافتہ پبلک یا بعض کسٹم چور تاجروں کی طرح

چالاک سمجھ کر ان سے سختی کا سلوک ہونا چاہیے۔ یہ لوگ غلط یا صحیح طور پر اپنے سادہ دل پر جب ہمارے کسی ایک محکمے کے کارکنوں کا مخالف لے کر جاتے ہیں تو اس کا اثر دور دست مقامات تک پہنچتا ہے جس سے بے وجہ لوگوں میں بے انصافی بیدار ہوتی ہے۔ ہماری پبلک سرونٹ عام طور پر مردم شناس ہوتے تھے اور ایک نظر میں بھانپ لیتے تھے کہ ساری آبادی میں مشکوک شخص کون ہے لیکن اب ہر ایک کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا، بالخصوص زائرین عراق شریف یا حجاج بیت اللہ شریف کو فرض کر لینا کہ یہ کسٹم چور ہیں۔ کوئی جائز معلوم نہیں ہوتا۔ صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی چیز ملک سے باہر نہیں جا سکتی تو اسے کسی قیمت پر ملک سے باہر نہیں جانے دینا چاہیے اور جو چیز بغیر حصول کسٹم نہیں آسکتی اس پر ضرور کسٹم ادا ہونی چاہیے لیکن ان قوانین کی اشاعت عام ہونی چاہیے۔ آخر جب قانون سے ناواقفی کوئی جائز عذر نہیں ہے تو کسٹم کے قوانین اور پاکستان سے باہر جانے یا اس میں داخل ہونے کے قوانین اور پاکستان میں ضروری اشیاء کے قوانین کے مضمون کو کسٹم کی ہر چوکی پر کیوں نہ عام کیا جائے۔ زائرین اور حجاج کے ساتھ ہمارے سرکاری ملازموں کا کچھ اس طرح سلوک ہونا چاہیے کہ یہ حضرات محسوس کریں کہ ان کے اس نیک سفر کو ہمارے ملکی بھائی بالخصوص سرکاری ملازم مستحسن سمجھتے ہیں اور جو اصحاب کسٹم کے محکمے میں مختلف فرائض انجام دیتے ہیں۔ وہ محب وطن پاکستانی ہیں اور کوئی ہندو اور سکھ نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا تعلق کسی پاکستانی دشمن ملک سے ہے۔ میرا ذاتی اندازہ ہے کہ مفاد عامہ کے پیش نظر کم افسران محکمہ نے، جن سے ہمیں واسطہ پڑا تھا۔ کام کیا۔ اور اکثر اوقات ایسا ہوا کہ حالات بدلتے ہی ایک امر جیسے ناجائز اور ناممکن بیان کیا جاتا تھا۔ الہ دین چراغ کے اثر کی طرح فوراً مباح اور جائز بن گیا۔ البتہ پولیس کے امی گریشن (31) سٹاف کا رویہ عین ان کے فرائض کے مطابق تھا۔ یہ بات کم کرتے اور پڑتال زیادہ کرتے تھے۔ اور سو میں سے پچانوے حالات میں یہ حضرات کوئی بات کئے بغیر اپنی مہر توثیق پاسپورٹ پر ثبت کر دیتے تھے۔ محکمہ صحت کا بھی یہی حال تھا۔ ہم سب نے اپنے پاسپورٹ کے ہمراہ ٹیکے کے کاغذات جو ہیلتھ آفیسر صاحب لاہور نے جاری کئے تھے، نکال رکھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب انہیں دیکھتے گئے اور ان کا ایک اسسٹنٹ ہمارے بازوؤں پر ایک ایسی ہی مہر لگاتا گیا جیسی صحت کے مطابق گوشت پر ہر صبح وٹرنری کا ڈاکٹر لگا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم نے پاکستان کی سرزمین عزیز کو گرامی تر خطہ پاک عراق کے ارادہ سے خیر باد کہنے کے لئے 'ڈمرا' مملوکہ برٹش انڈیا سٹیم نیویگیشن کمپنی (32) پر سوار ہونا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کمپنی انگریزوں اور ہندوستانیوں کی مملوکہ

ہے جس کے ذریعے پاکستان کی آبادی کا کافی حصہ کراچی سے مشرقی پاکستان (چٹاگانگ کو) اور کراچی سے بصرہ شریف اور جدہ شریف کو زیارت اور حج کے لئے آتا جاتا ہے۔ ایک ایسا تاجر جس کے مقتدر گاہوں میں پاکستان بھی ہو، پاکستان کا ضرور ہمدرد ہونا چاہیے اور اسے پاکستانیوں کا اس طرح بھی اعتماد ہونا چاہیے کہ اس کے حصص پاکستانیوں کی بھی ملکیت ہوں۔ اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں کم از کم ایک تہائی ہندوستانی مسلمان ضرور ہوں تاکہ حجاج اور زائرین سے ہمدردانہ اور آبرومندانہ سلوک ہو سکے۔ شاہجہاں بادشاہ کی لڑکی کا علاج کرنے کے صلے میں انگریز ڈاکٹر نے ذاتی انعام کی بجائے بمبئی کا جزیرہ اور اپنی قوم کے لئے تجارتی رعائتیں طلب کی تھیں۔ یہی بیج آگے چل کر سلطنت برطانیہ کے تاج میں درخشندہ ستارہ، مرحوم حکومت ہند کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جب کہ انگریزوں نے اس نیم براعظم ہندو پاکستان پر کوئی ڈیڑھ صدی کے قریب براہ راست حکومت کی۔ بہتر ہوتا تقسیم ملکی کے وقت ہمارے مدبر مسئلے کے اس پہلو پر بھی غور فرماتے اور اس معاملے میں بھی بھارتیوں کی تقلید کرتے۔ جہاں انگریز کمپنیوں کے نام تو برقرار ہیں لیکن ملکیت سب ہندوؤں کی ہوگئی ہیں۔ لیکن ہم نے شاید دوسرے اہم امور کی طرف اس قدر زیادہ توجہ دے رکھی ہے کہ انگریز کمپنیوں میں مسلمانوں کی شرکت۔ بلاد اسلامیہ میں ان سب امور مثلاً، سکہ، دکانداری، ملازمتوں اور کاروبار جیسے غیر اہم امور نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ وہ تو خدا جانے چچا سام اور جان بل میں دنیا کی منڈیوں پر قبضہ کرنے کی دھن کیوں سمارہی ہے ورنہ یہ امور کوئی ایسی شے نہیں جن پر کوئی سمجھدار لیڈر توجہ نہ دے سکے۔ اگر ہم تقسیم ملکی کے بعد ان تمام معاملات بلاد اسلامیہ کے اندر سابق حکومت ہند کے جانشین بن جاتے تو کیا ہرج تھا۔ پہلے اس طرف ہندوستان غیر منقسم کا سکہ چلتا تھا اس کے بعد پاکستان کے سکے کو اس کے جانشین کا رتبہ حاصل ہونا چاہیے تھا۔ یہ درست ہے کہ ہم انگریز کے یار وفادار ہیں لیکن اس وفاداری کا کم از کم یہ صلہ تو ملتا کہ مسقط دبئی، ام سعید، بحرین، کویت، آبادان کی انگریز تیل کمپنیوں میں ہمیں سابق ہندوستانی حکومت اور آبادی کے جملہ حقوق ملتے۔ خلیج فارس کے جملہ شیوخ بفضلہ تعالیٰ ہمارے دینی بھائی ہیں۔ ان کے ساتھ ہمارے ایسے تعلقات ہوتے کہ ہمارے حقیقی تاجر بھائی جو کلکتہ، بمبئی، مدراس، آگرہ، دہلی وغیرہ سے ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں اور آئے دن جعلی تاجروں کے مقابلے میں امپورٹ لائسنسوں کی بھیک مانگا کرتے ہیں۔ ان اسلامی ممالک کی منڈیوں پر چھا جائے۔ آج اگر کوئی ہمارے سکے کو نہیں پوچھتا تو اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ خلیج فارس کی تمام منڈیاں پاکستان

دشمن تاجروں کے ہاتھ میں ہیں۔ انگریز تیل کمپنیوں کے اعلیٰ ایشیائی حکام بھی پاکستان ہیں اور فرزندان پاکستان سے ان علاقوں میں قریباً وہی کام لیا جاتا ہے جو بھارت میں یور پیوں اور شاید اب مسلمانوں کے لئے مقدر سے آج کل حکومتیں خیر سگالی کے مشنوں پر ہزار ہا روپے خرچ کرتی ہیں لیکن سرکار عالی حضور غوث اعظم جیلانی ؒ کا دربار عالی بغداد شریف میں، حضرت امام عالی مقام جناب امام حسین علیہ السلام کا وجود پاک کربلائے معلےٰ میں اور شہنشاہ کون و مکاں اعلیٰ سرکار حضور نبی اکرم ﷺ کا دربارِ دُربار مدینہ منورہ ہو اور بیت اللہ شریف مکہ مکرمہ میں، ایسے جلیل القدر مراکز ہیں جن میں ہزار ہا ہزار مشتاقان دیدار اپنے ذاتی یا کم از کم حکومت پر کسی قسم کا بار عائد کئے بغیر روپیہ خرچ کر کے پاکستان کے دور دست مقامات سے حاضری کے لئے آتے ہیں اور ان غیر سرکاری لیکن دینی طور پر یقیناً سرکاری مشنوں کی کوئی تعداد باقی نہیں رہتی اور اگر حکومت پاکستان ان امور کی طرف تھوڑی سی توجہ زیادہ کرے تو کم از کم بلاد اسلامیہ میں تو پاکستان کے حق میں اس قدر زیادہ فضا ساز گار ہو سکتی ہے کہ رسمی حد بندیوں کے علاوہ ان میں کوئی مغائرت برقرار نہیں رہتی۔ یہ بجا ہے کہ انگریز اور امریکہ ہمارے دوست ہیں لیکن اسلامی حکومت پاکستان کے نقطہ نظر سے ہر مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہے۔ ہمیں اپنے دوستوں سے کئے ہوئے وعدوں کو ضرور پورا کرنا چاہیے۔ لیکن دوست کے مقابلے میں بھائی کو قطعاً فراموش نہیں کرنا چاہیے خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جب ہم پولیس اور کسٹم حکم سے فارغ ہو کر 'ڈمرا' جہاز پر سوار ہونے کے لئے جہاز کی سیڑھی کے سرے پر پہنچے تو یہاں ایک اور کلرک کم کریوں (یعنی نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کلرک ہے اور نہ ہی یہ نظر آتا تھا کہ جہاز کے عملے کا آدمی ہے) ایک تنگ پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے کہ یہ نہیں جا سکتا، وہ نہیں جا سکتا اور جب گوہر مقصود ان کے ہاتھ آیا اور گلے سے مل گئے تو سب گلہ جاتا رہا۔ کوئی اس خدائی فوجدار سے پوچھے کہ پولیس اور کسٹم حکام کی چیکنگ کے بعد تو کون ذات شریف ہوتا ہے، جو اسباب کی پڑتال کا دم بھرتا ہے۔ جی تو چاہا کہ فسانہ آزاد کے روایتی میاں خوجی کی طرح دو دو ہاتھ کر لوں۔ لیکن افسوس کہ نہ ہوئی قرولی ورنہ بچے کی چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ جہازی کمپنیاں جو ٹکٹ کی پشت پر اپنی ذمہ داری بچانے والی شرائط شائع کرتی ہیں کم از کم اس امر کی وضاحت کر دیا کریں کہ ایک ملک کے حکام نے جس چیز کی برآمد کی اجازت دے دی ہو، اس کا جہاز پر آنا عین مباح ہے۔ قلیوں سے ہم نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ ہمارا اسباب کسی موزوں جگہ پر رکھنا۔ کیونکہ قلیوں کے داخلے سے پہلے کسی سواری کو جہاز پر آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ انہوں نے

عرشے کے اس مقام پر اسباب رکھا۔ جس کے نیچے درآمد برآمد کا مال پڑا رہتا ہے۔ خیر بہر صورت قلی روپے مانگے وقت احسان جتانے لگے کہ ہم یہ ٹوکرا بچا کر لائے اور یہ ٹرنک بچا کر لائے لیکن جب ہم نے پوچھا کہ کیوں؟ ان میں کیا رکھا تھا جو بچا کر لائے یا رکیا راستے میں ڈاکو پڑے ہیں جن سے بچا کر لائے تو اس کے بعد انہوں نے اپنا مطالبہ پیش کر دیا جس سے انہوں نے یہ امر ہمارے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہمارے اسباب کو جہاز پر لانے میں انہوں نے کم از کم ہفت خوان رستم ضرور طے کئے ہیں۔ بہر صورت وہ اکیس کی رعایت سے مبلغ اکیس روپے ہی لے کر چلتے ہوئے اور ہم نے جہاز پر بستر دراز کر کے سب سے پہلے کمر سیدھی کی۔ ایک دو بار جسم کو کھینچ تان کر تین چار جمائیاں عرض کیں اور پھر ہم جہاز کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئے۔

گھر سے رخصت کے وقت کچھ ایسا سماں بندھا، گویا یہ آخری ملاقات ہے اور شاید اس کے بعد گھر والوں کو ہمارا رخ زیبا دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ اگر چہ پرانے زمانے کے مقابلے میں اب سفر میں بھی حضر کے سے آرام میسر ہیں لیکن انسانی فطرت کو کیا کہیے کہ وہ اب بھی مستقبل سے خائف ہے۔ آخر کیوں نہ ہو، موت و حیات کا اختیار ہم عامیوں کو کہاں نصیب، اس لئے جہاں دور کا سفر در پیش آیا اور ہم گھر سے بندھے لوگوں کے چہروں پر سکرات موت کی سی حالت ظاہر ہونی شروع ہوئی۔ اعلیٰ سرکاروں کے حکم سے دور دراز ممالک میں تشریف لے جانے والے اور پھر ظاہری صورت میں پلٹ کر نہ آنے والے پاک لوگوں یا شمشیر بکف ان مجاہدوں کا ذکر تو چھوڑیے جو رحمت اللعالمینی کا پیام لے کر خاک پاک عرب سے نکلے اور ابر رحمت کی طرح مشرق میں ہندو پاکستان، برما، ملایا، انڈونیشیا، بورنیو، چین، ماچین بلکہ جاپان تک چھا گئے اور مغرب میں مصر، ٹریپولی، الجزائر، مغرب الاقصیٰ، مراکش، سپین بلکہ کولمبس اور واسکوڈے گاما کی رہنمائی کرتے ہوئے نئی دنیا امریکہ اور راس امید کے راستے سوات تک پہنچ گئے۔ آج کل کی غیر مسلم قوموں کا یہ عالم ہے کہ ایک انگریز لیڈی تن تنہا لندن کے وکٹوریا ریلوے سٹیشن سے گاڑی پر سوار ہو کر بے دھڑک جہاں جانا چاہتی ہے مشرق و مغرب میں چلی جاتی ہے۔ لیکن ایک ہم ہیں کہ سفر کو وسیلہ ظفر نہ جانتے ہیں اور نہ ہی مانتے ہیں اس لئے سفر کی برکتیں جو ہمارے اجداد کو نصیب تھیں۔ ان سے ہم کلیتہً محروم ہو گئے ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ ایسے قسمت آزما بھی جن کے دھرم میں سمندر پار جانا مہا پاپ سمجھا جاتا تھا وہ کسی زمانے میں وطن چھوڑ کر افریقہ، عرب اور عراق کے ساحلی علاقوں میں پہنچے اور اب ان کی اولاد ان علاقوں میں تجارت کے بل بوتے پر وہی پوزیشن اختیار کئے ہوئے ہے جو

گزشتہ صدیوں میں پاک لوگوں کی تائید اور عرب ملاحوں کی عالم گیر سیاحت کے طفیل عرب تاجروں کو حاصل تھی۔ جنہوں نے عراق و عرب مقدس سے محض تائید ایزدی کے ساتھ سفر اختیار کیا اور پاکستان، ہندوستان اور انڈونیشیا میں معزز حکومتوں کے سربراہ بن گئے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم دنیا کے ادنیٰ لذائذ کی **خاطر** ہی لندن اور امریکہ کا سفر نہ اختیار کیا کریں بلکہ ایک بلند تر مقصد کے لئے ایسے سفر بھی آغاز کریں جن کے نتیجے کے طور پر کم از کم دنیا کی سرخروئی تو حاصل ہو اور اگر ان سفروں میں توشۂ آخرت بھی ہاتھ آ جائے تو کیا کہنا۔ غرضیکہ جب اعزہ اور اقربا کی معیت میں ہم نے سفر اختیار کیا تو گھر والوں کے جذبات اور قلق سے ہمیں یوں محسوس ہوا گویا شاید ہم نے جناب عزرائیلؑ سے ملاقات کر لی ہے اور اب ہم نہیں بلکہ بلکہ ہمارا جنازہ جا رہا ہے۔ یہ تاثر موہمی گاڑی میں پہنچ کر بھی برقرار رہا جہاں کی خنکی اور ٹھنڈک اس موسم کا پتا دیتی تھی۔ جس کی خوشخبری باخبر ہستیوں کی زبانی یوں ملی ہے کہ مومنوں کو لحد میں ایسی ہی ٹھنڈک اور خنکی نصیب ہوگی۔ جب منٹگمری ریلوے سٹیشن پر ہمیں سرکاری دعوت کی پہلی قسط، موسم کے پہلے خربوزوں کے ساتھ وصول ہوئی جن کی مٹھاس اب تک کام و دہن کو یاد ہے۔ تو دل غیر مستحق اس خوش فہمی کا شکار ہو گیا کہ مقدس ہمراہیوں کی محبت اور شوق کے صدقے میں اسے بھی بے حساب ہی جنت کا میوہ پہنچ گیا ہے۔ جہاز پر پہنچے تو محسوس ہوا گویا گوشۂ لحد میں کافی دیر آرام فرمانے کے بعد اب ہم میدان حشر میں پہنچ گئے ہیں۔ وہ جو سنا اور پڑھا تھا کہ پہلے اعمال کی پڑتال ہوگی تو کسٹم کے عمال نے کچھ ویسا ہی نقشہ پیش کیا۔ آخر ان آنریری فرشتوں سے نپٹ کر، فرشتوں کی ایک اور ادنیٰ قسم سے واسطہ پڑا جنہیں دنیا والے محض اپنی کم فہمی کی وجہ سے قلی کہتے ہیں ورنہ یہ کچھ عذاب کے فرشتوں کے بھائی بند معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کے جھلسے ہوئے چہروں اور گھونگھر والے بالوں سے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ جہنم کے نہیں تو ساحل جہنم کے ضرور رہنے والے ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ کون کس اعلیٰ سفر پر جا رہا ہے بلکہ انہیں تو یہ غرض تھی کہ جا دبے جا اس قدر روپیہ غریب حاجیوں اور زائروں سے نوچ کھسوٹ لیں کہ اپنے گروہ میں اپنی طرف سے لوٹ کا زیادہ حصہ دکھا کر مشترکہ پول سے زیادہ حصہ رسدی وصول کر سکیں اور اپنے سے بڑے فرشتہ ہائے عذاب کی نظر میں کھپ سکیں کہ یہ بڑے کام کا فرشتہ ہے۔ اسے آئندہ بھی دنیا والوں کو عقبیٰ کی ریہرسل کرانے کے کام پر لگا رہنے دینا چاہیے۔ شکلیں بھی ان کی کچھ اس طرح کی ڈراؤنی ہیں کہ ایک عام شخص شام کے بعد اپنے گاؤں کے قبرستان میں انہیں دیکھ پائے تو کس حیل و حجت کے بغیر دیووں اور جنوں کے وجود کا اقرار کر

لے۔ جہاز میں ہر طرف نفسی نفسی کا عالم۔ داخلے کے وقت ہر شخص کی یہی کوشش تھی کہ اسے جلد از جلد ایسی آرام دہ جگہ ملے کہ اس کے لئے جہاز جنت بن جائے۔ بارے حضور کی شفقت اور نوازش سے ہمارا یہ مرحلہ تو بخیر وخوبی طے ہوگیا۔ جہاز پر دو قسم کے لوگ سوار ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے کھانے پینے کا انتظام جہاز کی کمپنی کے سپرد ہوتا ہے اور دوسرے وہ لوگ جو اپنا انتظام خود کرتے ہیں۔ پہلے لوگ ٹکٹ خریدتے وقت کھانے پینے کا خرچ بھی سفر شروع کرتے وقت کمپنی کو ادا کر دیتے ہیں جس کے عوض ان کے نام اجازتی ٹکٹ جاری کر دیا جاتا ہے کہ وقت مقررہ پر کھانے کی میز پر کھانا اور چائے کھا پی سکیں۔ کھانے کے احاطے کے سرے پر لوگ قطار باندے، اپنا کھانے کا ٹکٹ ہاتھ میں لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنا اپنا ٹکٹ دکھا کر باری باری کھانے کے احاطے میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ مجھے اس سے یاد آگیا کہ قیامت کے دن جن لوگوں کے داہنے ہاتھ میں اجازت نامہ ہوگا وہ فائز المرام ہوں گے۔ چنانچہ یہی ہوا جن لوگوں کے پاس ٹکٹ تھا وہ تو کام و دہن سے تا بہ شکم سیر ہوتے گئے اور جو لوگ احاطے کی لکڑی کر پھلانگ کر کھانے کی میز پر جا پہنچے تھے انہیں کھانے کی بجائے دھکے کھانے پڑے۔

☆☆☆

نئی نئی راہیں (33)

سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شخص ہمیشہ کے لئے ایک جگہ سے جا رہا ہو جس کے برتاؤ اور سلوک کے چرچے شہر یا علاقے میں ضرب المثل ہو چکے ہوں اس کی رخصت پر الوداعی خطبے کا مقطع کیوں عرض کیا جائے۔ غور سے دیکھا جائے تو انسان کی قدرتی خواہشوں کا خلاصہ یہی ہے کہ وہ خود آرام سے رہے اور اسے کوئی تکلیف نہ دے۔ اس لئے وہ ہزار طرح کے جتن کرتا ہے۔ کبھی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک عمر صرف کر دیتا ہے، کبھی جان جوکھوں میں ڈال کر دور دراز کے سفر اختیار کرتا ہے۔ ان تمام سرگرمیوں سے اس کا مقصد عموماً یہی ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ مرتبے پائے یا کثیر دولت کا مالک بنے اور اس طرح آرام سے رہے اور تکلیف سے بچے۔ ان کے علاوہ ایسے بھلے مانس بھی ہیں جو رنج کو دور اور راحت کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں سے کام لینے کی بجائے صرف زبان ہلانا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ ان 'اہل زبان' حضرات کا ابتدائی اصول یہ ہے کہ جس شخص سے فائدہ پہنچنے کی توقع یا نقصان کا احتمال ہو، اسے نوک زبان سے ہی رام کر لیا جائے۔ خیر مقدم، خطبہ استقبالیہ اور الوداعی جلسے اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔

آپ کے ہاں ایک نئے حاکم تشریف لاتے ہیں۔ ممدوح کے وسیع اختیارات کا آپ کو بخوبی علم ہے۔ آپ ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرض کر لیتے ہیں کہ ان میں وہ تمام اوصاف ہیں جو آپ کے نقطہ نظر سے ان میں موجود ہونے چاہئیں۔ اس سے آپ کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس بہانے ان کے مفید مطلب اوصاف کو ابھارا جائے یا ضرر رساں طبیعتوں کا پیشگی ہی بندوبست کیا جائے البتہ قومی اداروں کی طرف سے احباب کی شان میں صدارت کی کرسی پیش کئے جانے کے بعد جو قصیدے پڑھے جاتے ہیں انکا سبب بھی حصول راحت کا جذبہ ہوتا ہے۔ ان حالات میں ممدوح کے بیان کردہ اوصاف عموماً محض حسن ظن کا درجہ رکھتے ہیں اور براہ راست تجربے کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ چونکہ ہر اعتبار سے ان کی حیثیت حسن طلب کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے وقتی ضروریات کی بناء پر ان کے پیش کئے جانے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس ہم نہیں سمجھ سکے کہ جب ایک شخص آپ کے علاقے میں اپنی مقررہ مدت بسر کر کے جا رہا ہو اور اس سے

براہ راست آرام یا نقصان پہنچنے کے امکانات منقطع ہو رہے ہوں۔ان کی خدمت میں الوداعی خطبہ پیش کرنے کی رسم کیوں اختیار کی جاتی ہے۔اتنا عرض کرنا بے جانہ ہوگا کہ الوداعی خطبوں کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جنہیں خاص مقصد کو سامنے رکھ کر لکھا اور لکھوایا جاتا ہے اور دوسرے وہ خطبے جو برائے بیت ہی ارشاد کئے جاتے ہیں۔اس لئے خطاب کرنے والے یا مخاطب حضرات کی خواہشات یا ضروریات کو سامنے رکھ کر بخوبی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ خطبہ اشد ضروری قسم کا ہے یا محض تفریحی۔

الوداعی خطبوں کی ساخت اور رنگ ڈھنگ یکساں ہوتا ہے۔اگر دو مختلف موقعوں پر پڑھے گئے خطبوں کی جزوی تفصیلات کو ایک دوسرے سے تبدیل کردیں تو ان کے مفہوم میں کوئی فرق نہ آسکے گا۔اور مفہوم بھی وہی پرانا۔آپ ایسے ہیں اور ویسے ہیں۔کسی کو رستم وسہراب، کسی کو فرشتہ سیرت اور ''باپ نہ مارے پدڑی بیٹا تیرانداز'' قسم کے لوگوں کو ''والا شان بہادر'' کے خطاب دینا ان منافقانہ خطبوں کی خصوصی صفت ہوتی ہے۔اس منافقت کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ آپ اپنی یا مخاطب کی ذاتی خواہشوں کو سامنے رکھ کر اس خطبے کو تصنیف فرماتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک صاحب رشوت لینے کی بنا پر تبدیل کردیئے جاتے ہیں۔ان کے خلاف اس الزام میں سرکاری تحقیقات جاری ہیں۔وہ گزشتہ خدمات کے صلہ میں آپ کو اس امر پر آمادہ کرلیں گے کہ آپ ان کے حق میں ایسا سرٹیفکیٹ مہیا فرمادیں جو سندر ہے اور عندالضرورت کام آوے۔اس لئے آپ ان کے اعزاز میں ایک جلسہ بلائیں گے اور اس میں ایسے لوگ بلائیں گے جو آپ کے خیالات کی مخالفت میں کوئی آواز نہ اٹھائیں۔گویا آپ اپنے لنگوٹیے دوستوں یا غیر معتبر قسم کے شہریوں کو بلائیں گے۔کھانے کی میز پر مجلس کا درجہ حرارت معلوم کرنے کے لئے پہلے اس شخص کا نام کسی اسم صفت کے بغیر روشناس کرائیں گے جسے بدقسمتی سے مہمان کے خلاف موجودہ طوفان بپا کرنے کی شہرت حاصل ہو۔اگر اس کا نام آتے ہیں ''زندہ باد'' کے نعرے بلند ہوں یا حاضرین چپ سادھ لیں تو سمجھئے کہ دال میں کالا کالا ہے اور الوداعی خطبہ پیش کرنا خطرے کی بات! اس کے برعکس ان کا نام آتے ہی اگر صلواتوں کا ڈونگرا برسے تو زمین ہموار اور حالات خاطر خواہ خیال کیجئے!

ان حالات میں مخاطب حضرات کی طرف سے پہلی کوشش یہ کی جاتی ہے کہ جدا ہونے والے صاحب کے سب سے زیادہ نامور مخالف کو ان کی شان میں الوداعی خطبہ پیش کرنے پر آمادہ

کیا جائے۔ اس لئے ہر ممکن طریقے سے اس پر زور ڈالا جاتا ہے کہ جو زبان اس سے بیشتر شکایت کے لئے وقف رہی ہے وہی اب حق توصیف بھی ادا کرے۔ اگر وہ اس پر آمادہ نہ ہو سکے تو اسے آخری مہمانی کے فرائض انجام دینے پر تو ضرور رضا مند کرلیا جاتا ہے۔ بعد میں الوداعی خطبے یا ضیافت کی روداد کا کسی ہمدرد اخبار میں شائع کرانا ضروری اور جن پرچوں میں وہ مضمون شائع ہوں۔ وہ دنیا میں پروانہء راہداری اور اس کے بعد توشہء آخرت۔ غیر ضروری خطبے حاصل کرنے میں کسی تردد کی ضرورت نہیں۔ البتہ مخاطب احباب سے طبی مشورے کی بنا پر اگر ضرور ہی دعوت کھانا ہو تو معمولی کوشش سے بیٹے کی پیدائش یا امتحان میں کامیابی کی واجب الادا دعوتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ قومی جلسوں میں دولتمند صاحبوں کی خدمت میں جو الوداعی تقریر پیش کی جاتی ہے وہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے دلچسپ ہوتی ہے۔ اسے غور سے سننے کے بعد فوراً معلوم ہو سکتا ہے۔ آیا خطاب کرنے والے ممدوح سے خوش ہیں۔ اور ادھر مخاطب کے چہرے پر نزع کی سی مردنی یا خوشی کی دمک دیکھ کر بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انھیں آج کی صدارت مہنگی پڑی ہے یا وہ سستے چھوٹے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم پرانی روش کو چھوڑ کر نئی نئی راہیں اختیار کریں۔ سچ کو اپنائیں اور جھوٹ کے طومار باندھنا چھوڑ دیں۔ اور اس الوداعی خطبے کو ہمیشہ کے لئے ترک کر دیں جس میں منافقت اور جھوٹ کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ لیجئے ایک رشوت ستاں حاکم کی خدمت میں پیش ہونے والا خطبہ سنئے:

''جناب عالی! اس مالک ذوالجلال کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آپ (جو ہماری شامت اعمال کی صورت میں قدرت کی طرف سے ہمیں سزا دینے کے واسطے مامور کئے گئے تھے) اپنا مقصد پوری طرح حاصل کرنے کے بعد یہاں سے تشریف لے جارہے ہیں۔ جناب محترم! مجھے اعتراف ہے کہ ہماری خوشی بے جا ہے کیونکہ ہماری سب سے زیادہ دودھ دینے والی بھینسیں آپ کے دوستوں کے توسط سے منزل مقصود پر پہنچ چکی ہیں اور آپ نے نقدی، اناج، بھوسے اور گھی کی صورت میں ہم سے جو خراج وصول کیا جاتا تھا اس کا بیشتر حصہ اس وقت منڈی میں بکنے کے لئے موجود ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ان کی وصولی شدہ رقم سے آپ کو ریلوے کے ان تین ڈبوں کا کرایہ ادا کرنا ہے جن میں آپ کا مال غنیمت بمشکل سما سکا ہے اور جس کی بلٹی گزشتہ تجربے کی روشنی میں آپ نے احتیاطاً اپنی زوجہ محترمہ کے نام کٹوائی ہے۔ کاش وہ رقم بھی آپ بچا سکتے۔ اس سانحہ میں ہمیں آپ سے پوری پوری ہمدردی ہے لیکن ان کے ہوتے ہوئے بھی ہمیں خدا کا شکر صرف اس لئے کرنا ہے

کہ جان بچی لاکھوں پائے۔

جناب عالی! ایک دنیا جانتی ہے کہ آپ میں شروع سے ہی سرسوتی (علم کی دیوی) کی وبا نہ تھی۔ آپ نے اپنی فطری نااہلیتوں کی وجہ سے ماں کی گود سے آج تک اپنے جسم پر جو چوٹیں سہیں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ اس سے بھی زیادہ موثر سلوک کے مستحق تھے۔ بندہ پرور! آپ نے ابھی اس مجلس میں استفسار فرمایا تھا کہ وہ منزلہ مکان کس کا ہے آپ کو افسوس ہے کہ اس کا قبالہ حاصل کرنے کی آپ کو کیوں فرصت نہ مل سکی۔ آپ کا افسوس بجا ہے اور ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کو اس کا نعم البدل عطا کرے۔ آخر میں ہمیں مظلوم پور کے ان لوگوں سے پوری پوری ہمدردی ہے جن کے پاس آپ بلائے بے درماں کی صورت میں ادھر جا رہے ہیں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ جس دن آپ پر لوگ سدھاریں گے خلق خدا اطمینان کا سانس لے گی"۔

ایک اور خطبہ، الوداعیہ سنیئے۔ مخاطب کے ساتھ خطاب کرنے والے کے تعلقات مسلمہ طور پر کشیدہ ہیں۔ لیکن چند مجبوریوں نے پڑھنے والے کی زبان پر وہ خطبہ جاری کر دیا ہے۔ سنئے "جناب عالی! یہ سطریں مجھی سے پڑھوا کر آخر تو نے نہر پر پٹنے کا بدلہ مجھ سے لے ہی لیا نا۔ اچھا! یار زندہ صحبت باقی۔ تیرے حق میں خطبہ پڑھنے کی تکلیف کے مقابلے میں صاحب کی خوشنودی کی راحت ہزار درجہ اچھی ہے۔ صاحب نے مجھ سے وعدہ بھی کر لیا ہے کہ وہ جاگیر مجھے مل جائے گی جس کے خلاف تیرا قلم اب تک ہزاروں میل طے کر چکا ہے۔ میری تعریف پر خوش ہو رہے ہو۔ میری زبان سے اپنی نسبت رحم دل اور انصاف پرور افسر کے الفاظ سن کر تمہاری باچھیں کھلی جا رہی ہیں؟ تم سمجھ رہے ہو کہ ہفت روزہ "خواب و خیال" کے آئندہ پرچے میں تم میرے خطبے کو من و عن چھپوا سکو گے! اس سے منہ دھو رکھو۔ اگر ایڈیٹر نے مزاحیہ کالم میں میری تقریر کی گت نہ بنائی تو میرا نام بدل ڈالنا! تم کہہ رہے ہو کہ آپ نے پہلے نہ بتایا۔ ورنہ ایسے اچھے کھانے چکھنے کے لئے ہم روز آپ کے ہاں آیا کرتے" یہ طنز سر آنکھوں پر لیکن میں تمہارا ابھی استاد ہوں۔ تمہارے لئے میں نے علیحدہ کھانا پکوایا ہے اور اس میں وہ گھی ڈالا ہے جسے آج صبح ہماری بلی سونگھ گئی تھی۔ جس اُٹھنگی کی سبزی تم زہر مار کر رہے ہو۔ اسے ایک ایسے شوم سے حاصل کیا گیا ہے جو تمہارے سر پر ہمیشہ بھوت بن کر سوار رہے گا۔۔۔۔ ہاہا۔۔ میرے خطبے کو سن کر صاحب کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا ہے۔ اے لو! چیئرز دینے میں بھی صاحب ہی نے سبقت کی بس میرا مقصد حاصل ہو گیا۔ تم اور تمہاری یہ تعریف جائے بھاڑ میں، خدا تیرا ستیاناس کرے اور جہاں کہیں تو جائے، جوتوں کے ہار اور توے

کی سیاہی حسب معمول تیرے استقبال کو تیار رہیں!!''

اب قومی جلسوں کی طرف آیئے۔ان کی طرف سے دوطرح کے الوداعی خطبے پیش کئے جاتے ہیں۔ایک وہ جن میں خطاب کرنے والے لوگ مخاطب کی سخاوت یا کام سے خوش ہوتے ہیں۔اس کے برعکس دوسرے وہ جنہیں محض خانہ پوری کے لئے پیش کیا جاتا ہے ورنہ اگر کام کالحاظ کیا جائے تو مخاطب کے ساتھ ناگفتہ بہ سلوک روا رکھا جائے۔دونوں خطبے عرض ہیں سنئے!

''محترم مہمان خوشامد پرست! آپ کی شان میں یہ قصیدہ دووجوہ کی بناء پر عرض کیا جا رہا ہے۔انجمن 'ارباب خیال' کے صدر صاحب کی تعمیل ارشاد کے لئے اور اس لئے بھی کہ میرا چہرہ آپ کو یاد رہے۔تاکہ ضرورت کے وقت آج کی طرح آپ کو الو بنا سکوں۔آپ کے متعلق بتانے والے نے صحیح اطلاع بہم پہنچائی تھی کہ آپ وے روپیہ بٹورنے کے لئے موزوں ہوگا کہ تھانے دار صاحب کے ذریعے ہی آپ کی خدمت میں انجمن کی صدارت پیش کی جائے۔آپ تو ہمیں صرف پچاس پر ہی ٹرخانے والے تھے، یہ تو خدا تھانے دار صاحب کا بھلا کرے جنہوں نے اس رقم کے دائیں طرف ایک اور صفر کا اضافہ کرایا۔ہماری بدقسمتی سے ان کے بیٹے نے آج تار دے کر فوراً بلا بھیجا ہے۔اور آپ جلدی میں یہاں سے تشریف لے جارہے ہیں لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی امداد دینے کا جو وعدہ آپ نے ابھی ابھی ارشاد کیا ہے۔وہ انشاءاللہ آپ کو ضرور مہنگا پڑے گا۔ہماری دعا ہے کہ آپ سلامتی سے منزل مقصود پر پہنچیں اور خدا آپ ایسے گھامڑوں کی تعداد میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے تاکہ ع چوں احمق در جہاں باقی ست کس مفلس نمی ماند(37)، سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جاسکے،،

اسی تقریب کے لئے دوسرا خطبہ بھی عرض کرتا ہوں۔''اجی مولانا صاحب! ہم نے تو آپ کو 'بہت بھاری 'لیڈر سمجھ کر بلایا تھا۔یہ ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ آپ بڑے گاؤدی ہیں۔آپ نے آج تقریر کیا فرمائی۔دوسرے لفظوں میں گھاس کاٹی۔انہی اوقات پر آپ تیس سے کم پر رضا مند نہ ہوتے تھے۔ایسی تقریریں تو ہم روپے کی پانچ پانچ کرالیں۔ہمیں کیا معلوم کہ ریشم وکمخواب میں گدھا چھپا ہوا ہے۔آپ نے سامعین کو تلقین فرمائی کہ کھانے، پینے اور پہننے میں سادگی سے کام لینا چاہئے۔کاش اس سنہری اصول پر آپ خود کاربند ہوسکتے۔اور ہماری انجمن کو وہ رقم بچ جاتی جسے آج آپ کے 'ماحضر' پر خرچ کیا گیا ہے۔جبہ ودستار پہن کر آپ امن کے فرشتے معلوم ہوتے تھے لیکن ہمیں یاد ہے کہ جب ہم آپ کو یہاں لانے کے لئے فریب پور پہنچے تھے تو آپ اپنی بے گنہ گھر

والی کو پیٹ پیٹ کر ہٹے ہی تھے۔آپ کی چاپلوسی سے بھری استقبالیہ ہنسی کے ساتھ ساتھ ہم نے آپ کا اندھی پھوپھی سے چالاکی سے جائداد اپنے نام منتقل کرا لینے کا کارنامہ بھی پوری طرح سنا تھا۔جو اس وقت وہ عفیفہ رو رو کر بیان کر رہی تھی۔یقین مانئے کہ اس داستان کا ایک ایک لفظ ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔آخر میں آپ اتنی مہربانی کیجئے کہ جانا آپ کو تھرڈ میں ہی ہے۔ہم سے سیکنڈ کلاس کا کرایہ جرمانے کے طور پر طلب نہ کیجئے۔اگر آپ نے ہمارے اس جائز مطالبے کو قبول فرمالیا تو آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ میلاد شریف میں آپ کو ضرور بلائیں گے اور لوگوں کے دلوں سے اگر آپ کی آج والی تقریر محو ہو سکی تو انشاءاللہ تمیں روپے ہی دلوائیں گے۔البتہ آپ سے اتنی استدعا ہے کہ ایسی محفلوں میں جب آپ حلوے کو اپنے دل سے صرف تین انچ کے فاصلے پر نازل کرنے کا تہیہ فرمالیں تو اس نیاز مند کو ضرور یاد رکھیں۔

چوں با حبیب نشینی و "حلوا پیائی"   بیاد آر خضر خان دال پیارا (35)

شریر لڑکے (36)

کئی ایک شریر لڑکوں نے اپنی اپنی آپ بیتیاں آپ سے عرض کی ہیں۔ میں شریر بچہ تو خیر کبھی نہ تھا لیکن ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

ہمارا مدرسہ ویسے تو کسی گاؤں میں واقع نہیں۔ لیکن ہم اسے شہر کا مدرسہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ آدھے تیتر، آدھے بٹیر کی طرح وہ ایک ہی وقت میں گاؤں کا سکول بھی ہے اور شہر کا مدرسہ بھی۔ اگر کبھی دیہات سے طلباء کی غیر معمولی تعداد اس میں آداخل ہو تو یہ فوراً دیہاتی ملکیت بن جاتا ہے اور اگر ترچھی مانگوں والے شہری بچے زیادہ ہو جائیں تو یہ ہر لحاظ سے شہری دکھائی دینے لگتا ہے۔ انقلاب زمانہ اور نظام تعلیم کی ہمہ گیری کے طفیل اب دیہات سے کم طلبا اس میں پڑھنے کو آتے ہیں لیکن' جس زمانے میں آتش جواں تھا' ان کی خاصی تعداد اس مدرسے میں تعلیم حاصل کیا کرتی تھی جسے گھر میں تیار کئے ہوئے گھی، گڑ اور ستو کی انتظار اکثر رہا کرتی تھی اور آہستہ آہستہ ہمارا یہ عقیدہ ہو چلا تھا کہ ہمیں اس سکول میں تعلیم دلانے کے بہانے اپنے گاؤں سے دیس نکالا دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب کبھی گھر کی کوئی سوغات کسی آنے جانے والے کے ہاتھ بورڈنگ ہاؤس میں پہنچتی تھی تو نہ صرف وہ چیز ہی ہمیں محبوب و مرغوب معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ ہمیشہ اسے لانے والا نوکر یا کمین بھی ہمارے معزز مہمان کا رتبہ حاصل کر لیتا تھا۔ چنانچہ ہمارا بورڈنگ ہاؤس ایسے معزز مہمانوں سے آئے دن بھرا رہتا تھا۔ ان کی سواری کے جانور کے بچے کو سارے ہوسٹل کے احاطے میں کلیلیں کرنے اور بھاگتے رہنے کی عام اجازت تھی اور کثرت استعمال سے یہ حق اس حد تک مستند ہو گیا تھا کہ ایسے مہمانوں کے جانوروں سمیت آ جانے یا ان کے ساتھ باتیں کرنے کے لئے جماعت کے کمرے سے نکل جانے پر' مانیٹر' کو بھی اعتراض کرنے کا حق باقی نہ رہا تھا۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ہمارے سکول کے حالات بدل گئے جن ماسٹر صاحب کے ذمے بورڈنگ ہاؤس کا انتظام تھا انکی بجائے ایک بزرگ تشریف لائے جنہوں نے شاید عمر بھر میں گاؤں کا منہ تک نہ دیکھا ہوگا۔ بیچارے دبلے پتلے منحنی سے آدمی پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے اور وہمی طبیعت کے مالک تھے۔ مکھن دیکھنے سے انہیں گھن آتی تھی۔ دودھ کو چائے میں ملا کر پیتے تھے۔ اور لسی انہیں ہضم نہیں ہو سکتی تھی۔ اکثر شاہ مراد، شاہ جنات سے اپنے گہرے تعلقات کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں تفریح کے وقفے میں بورڈنگ ہاؤس کی طرف کتابیں رکھنے

کو جو آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے کے سامنے ہاموں نائی اپنی گھوڑی کی باگ تھامے کھڑا ہے جس پر خرچی کے لئے ایک طرف گھی کا ٹین اور دوسری طرف گڑ کی بھیلیاں اور کچھ ستو تھے، والدنے دو آنے کم چار روپے اگلے مہینے کے خرچ کے لئے بھی اس کے ہاتھ بھیجے تھے۔ ہاموں نے اپنے رومال کے دوسرے سرے سے اڑھائی آنے کے پیسے بھی مجھے دیئے جو میری چھوٹی بہن نے میرے لئے اکٹھے کر رکھے تھے اور سب کی آنکھ بچا کر اس کے حوالے کئے تھے۔ میں نے باورچی کے ذریعے یہ سامان سنبھال لیا اور گھوڑی کو ایک درخت کے ساتھ بندھوا کر اس کے آگے دانہ اور بھوسہ ڈلوا دیا۔ باورچی کو یہ بتا کر کہ ہاموں بھی میرے ساتھ کھانا کھائے گا میں اپنی کتابیں لے کر سکول چلا گیا۔

دو اڑھائی گھنٹے کے بعد واپس آ کر کیا دیکھتا ہوں کہ سارے بورڈنگ ہاؤس میں ماسٹر صاحب کی آواز گونج رہی ہے۔ لڑکے اپنے کمروں کے آگے برآمدے میں سہمے کھڑے ہیں اور ایک نوکر نے باورچی خانے میں بچھیرے کو بہ مشکل قابو کر رکھا ہے۔ میں ابھی اپنے کمرے کا قفل کھول ہی رہا تھا کہ "ادھر آ، نابکار!" نے مجھے چونکا دیا۔ ان کے کمرے میں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ماسٹر صاحب عربی، فارسی، اردو، انگریزی، پنجابی اور نہ جانے کس کس زبان میں 'ماضی تمنائی' کی گردان کر رہے ہیں اور بے چارہ ہاموں نائی حیرت سے منہ کھولے ماسٹر صاحب کی طرف تک رہا ہے کہ اللہ میاں نے انہیں کتنا علم بخش دیا ہے۔ ماسٹر صاحب کے حکم کے مطابق نہ تو ہاموں کو کھانا ملا اور نہ ٹھہرنے کا موقع۔ بلکہ ان کے کہنے پر بھنگی نے گھوڑی کا رسّہ بھی چھوڑ دیا۔ اور بیچارے ہاموں کو بے آبرو ہو کر بورڈنگ ہاؤس سے جانا پڑا۔ اس واقعہ کو دو چار دن گزر گئے۔ دیہاتی طالب علموں کی متفقہ رائے تھی کہ جو سلوک ہاموں نائی سے روا رکھا گیا ہے۔ اسے بعد میں آنے والے مہمانوں پر بھی برتا جا سکتا ہے اس لئے 'مجموعی دفاع' کے پیش نظر 'مشترکہ دشمن' سے دو دو ہاتھ کرنے کا حتمی فیصلہ ہوا اور قرار پایا کہ اس سارے قصے کو بہادر خاں نمٹائے۔ بہادر خاں ویسے تو نویں جماعت ہی کا طالب علم تھا لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب سے نویں جماعت میں تھا۔ اس کی مونچھیں موٹی اور سیاہ تھیں اور قد چھ سات فٹ سے کیا کم ہوگا۔ ہمارے اکثر استاد بھی اس سے کنی کتراتے تھے۔ جب نماز عشاء کے بعد ہمارے ماسٹر صاحب تسبیح پھیرنے سے فارغ ہو بیٹھے تو بہادر خاں نے اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے 'ہوحق' کا نعرہ بلند کیا، ہم سب بھاگ کر اس کے گرد کھڑے ہو گئے۔ کسی نے اس کے بازوؤں کو دبانا شروع کیا اور کوئی اس کے تلووں کو

سہلانے لگا۔ ایک من چلے نے اپنی جان پر کھیل کر ماسٹر صاحب کو جا اطلاع دی کہ بہادر خاں کو اچانک کچھ ہوگیا ہے۔ بہادر خاں سلیم الطبع اور متین لڑکا تھا اس نے کبھی کسی ماسٹر صاحب کو شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ اس لئے سبھی اس کا لحاظ کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب بیچارے دوڑے دوڑے آئے اور بہادر خاں سے آتے ہی پوچھنے لگے'' کہو بیٹا! خیریت تو ہے۔ یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟'' بہادر خاں گرج کر بولا'' ہو کیا گیا ہے! ہوں! ذرا ٹھہرو تمہیں ابھی بتاتا ہوں''۔ بہادر خاں کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اور اس کی طاقت میں محیر العقول حد تک اضافہ ہوگیا تھا۔ ماسٹر صاحب کو بہادر خاں سے ایسے انداز گفتگو کی توقع نہ تھی۔ وہ حیران ہو رہے تھے کہ بیچارہ بہادر خاں کس مصیبت سے دوچار ہوگیا ہے۔ اتنے میں بہادر خاں نے پھر کڑک کر کہا'' ماسٹر صاحب! آپ نے وضو کرتے وقت میرے کھانے پر پانی کیوں انڈیلا؟'' یہ سنتے ہی ماسٹر صاحب کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ وہ گھبرا کر کہنے لگے کہ'' بھئی یہ تو کوئی جن معلوم ہوتا ہے؟'' میں حیران تھا کہ بہادر خاں جیسا سعادت مند بچہ آج کیونکر گستاخی سے پیش آرہا ہے۔ افوہ! مجھے یاد آیا کہ میں نے چبوترے کے جنوبی کونے پر وضو کیا تھا۔ مجھے خود شک تھا کہ اس طرف کسی بزرگ کا مزار ہے۔ مجھ سے واقعی بڑی غلطی ہوئی''۔'' صرف جن''۔ فتح خاں بولا'' واہ ماسٹر صاحب! آپ ابھی سے ہمیں بھول گئے۔ ہم ہیں شاہ مراد، شاہ جنات، یونہی رعایا کا حال دریافت کرنے آج صبح سے نکلے ہوئے ہیں۔ اس وقت خاصہ نوش کرنے بیٹھے تھے کہ آپ نے مابدولت کے خوان نعمت پر پانی پھیر دیا''۔ بورڈنگ ہاؤس میں ماسٹر صاحب کا پرانا دوست شاہ جنات آئے اور وہ اپنی اہمیت کو نہ سمجھیں یہ ناممکن تھا۔ یہ آپ نے اظہار افسوس کرتے ہوئے بے تکلفی کے ساتھ جناب بادشاہ سلامت کی پائنتی کا رخ کیا اور دوسرے لمحے میں آپ شاہ جنات کے پاؤں دبا رہے تھے۔ اس وقت ہم سب فخر کے ساتھ اپنے ماسٹر صاحب کے مقام بلند کو دیکھ رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کی زبان پر سورۃ مزمل کا ورد بھی جاری تھا۔'' اچھا! آپ ہمارے نکالنے کے درپے ہیں''۔ بہادر خاں بولا'' چلو ہم نہیں جاتے۔'' اور اس کے ساتھ ہی بہادر خاں نے ماسٹر صاحب کے سینے میں اس زور سے دولاتیں رسید کیں کہ آپ چارپائی سے دور جا گرے اور پھر خود ہی جھاڑ پھونک کر بولے۔'' دیکھو بیٹا! یہ ہمارا دم تھا جو بادشاہ سلامت کا وار سنبھال لیا۔ ورنہ کوئی اور ہوتا تو اس وقت تک اس کی انتڑیاں ہوا میں لٹک رہی ہوتیں۔''

بہادر خاں نے جواب میں کہا'' ہم وار ہی اس پر کرتے ہیں جو اس قابل ہو۔ کسی ایسے

ویسے پرخود بدولت تھوڑا ہی ہاتھ اٹھاتے ہیں۔" ماسٹر نے فخر وغرور سے اپنی گردن کو اونچا کر کے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ اور ہم سب بیک زبان بولے کہ" ہمارا استاد واقعی بڑا استاد ہے۔"

ہمارے اقرار اہمیت پر ماسٹر صاحب کا سینہ خوشی سے تن گیا۔ اوآپ نے بہادر خاں کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ" بادشاہ سلامت! معاف کیجئے گا۔ آپ نے غریب خانے پر قدم رنجہ کیوں فرمایا؟" بہادر خاں نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا" ارے بھئی! پہلے جو ہم بتا چکے ہیں پھر۔۔۔اب۔ " ماسٹر صاحب چمک کر بولے" اس کا سبب ضرور بتانا ہوگا تجھے حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم، اے شاہ جنات"۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام نامی سنتے ہی بہادر خاں ہارے ہوئے جوار یے کی طرح کہنے لگا" اے آدم زاد! تجھے یہ باتیں کس نے بتادی ہیں۔ اگر تو نے یہ مقدس نام نہ لیا ہوتا تو ہرگز تجھے اپنی آمد کا سبب نہ بتاتا۔ اچھا چونکہ یہ راز سلطنت ہے اس لئے ادھر آ، تیرے کان میں بتاتا ہوں"۔ ماسٹر صاحب پورے وثوق کے ساتھ" شاہ جنات" کو ہمراہ لے کر اپنی کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔ ابھی وہ برآمدے ہی میں تھے کہ بہادر خاں نے کہا" میں جمرود شاہ کا بیٹا ہوں" اور اس کے ساتھ ہی اس نے ماسٹر صاحب کے اس زور سے تھپڑ رسید کیا کہ ان پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔

ماسٹر صاحب بولے" آخر کیوں نہ ہو۔ اٹک پار کا جن ہے اتنا بھی نہ ہوگا۔ یہ تو اس کی شاہانہ ادائیں ہیں"۔ ہم نے مل کر عرض کی کہ" ماسٹر صاحب آپ کوئی سخت سا وظیفہ پڑھیں تاکہ غریب بہادر خاں کو اس موذی کے پنجے سے چھٹکارا نصیب ہو۔ یہ جن تو اس کا برا حال کر رہا ہو گا"۔ آپ نے جواب دیا" جبھی تو میں بہادر خاں کو ہاتھ تک نہیں لگا رہا۔ ورنہ درد تو بعد میں یہ مظلوم بچہ محسوس کرے گا۔ اس جن کا تو بال بھی بیکا نہ ہوگا"۔ اتنے میں بہادر خاں کی آواز آئی" ارے ماسٹر صاحب! تم بھی کیا یاد کرو گے کہ مابدولت آئے تھے۔ چلو تمہیں وہ مقام دکھائیں جہاں تم نے اپنے روپے رکھ کر بھلا دیئے ہیں"۔ ماسٹر صاحب نے آج صبح ہی ہمیں بتایا تھا کہ چھٹیوں کے ایک مہینے کی تنخواہ کہیں رکھ کر بھول چکے ہیں۔ ماسٹر صاحب کی باچھیں کھل گئیں اور انھوں نے" صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد (37) " کی کھڑے کھڑے دل نشیں انداز میں تفسیر بھی فرما دی اور خوشامد بھرے لہجے میں کہنے لگے۔" یہ حضور کا لطف خاص ہے کہ بندگان عالی پر اس قدر نوازش فرماتے ہیں۔" یہ سن کر بہادر خاں نے ماسٹر صاحب کو محبت سے اپنے ہمراہ لیا اور ان کے دفتر کو چلا۔ وہاں بہادر خاں نے اتفاقاً اس زور سے ان کا دیوار کے ساتھ سر ٹکرایا کہ ماسٹر صاحب نے

روپے وصول کئے بغیر ہی باہر آنے میں اپنی سلامتی سمجھی۔اس دوران میں ہم سب نے مل کر بہادر خاں کو پکڑ لیا اور اسے ٹھنڈا پانی پلا کر چارپائی پر سلا دیا۔ہم رات بھر ماسٹر صاحب کو یقین دلاتے رہے کہ اگر آج بورڈنگ ہاؤس میں آپ موجود نہ ہوئے تو جمرود شاہ کے بیٹے مراد شاہ والئی جنات کو نکالنا بہت مشکل کام تھا۔صبح ہوئی تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے بلا کر گزشتہ رات کے واقعہ کے متعلق استفسار کیا۔میں نے "شاہ جنات" کا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرے اور نہایت ادب سے عرض کیا کہ مجھے تو اس کا کوئی علم نہیں۔آپ متعلقہ ماسٹر صاحب سے ہی اس کا حال دریافت کر لیں۔ادھر یار لوگوں نے ماسٹر صاحب کو یقین دلا دیا تھا کہ اگر آپ ہی نے اس واقعہ کو درست تسلیم کر لیا تو اس میں نہ صرف آپ کی ہیٹی ہوگی بلکہ آپ کے انتظام پر بھی حرف آئے گا۔نتیجہ یہ ہوگا کہ بورڈنگ ہاؤس کو کسی دوسرے ماسٹر صاحب کے حوالے کر دیا جائے گا اور زیادہ تنخواہ لینے کی بجائے آپ کو الٹا مکان کا کرایہ بھی اپنی گرہ سے دینا پڑے گا۔بات صاف تھی تیر عین نشانے پر بیٹھا اور جب ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس رات کے واقعات کے متعلق ان سے کچھ پوچھا تو وہ صاف مکر گئے اور کہنے لگے کہ میرے انتظام میں ایسا نہیں ہوسکتا۔اس روز جناب ہیڈ ماسٹر صاحب دام اقبالہٗ نے مجھے اور تو کچھ نہ کہا لیکن انگریزی کی گھنٹی میں ایک معمولی ہجے کی غلطی پر اس قدر پیٹا کہ آج تک سند ہے اور بوقت ضرورت کام آتا ہے۔

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا (38)

اسے محض ایک حادثہ سمجھئے کہ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج لائل پور سے ایف ۔ اے کا کورس ختم کرنے کے بعد 1927ء میں ہمارے 'جرم ھائے سیاہ' کو اسلامیہ کالج کے دامن عفو میں پناہ ملی۔ سلام علی نجد ومن حل بالنجد! (39) سکول کی زندگی میں ابتدا سے آخر تک 'مولا بخش' کا سکہ چلتا ہے اسلئے قدرتی طور پر ہم اس زمانے میں کالج کی زندگی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ لائل پور کالج کا زمانہ، ہماری شخصی ذمہ داری اور آزادی کا پہلا مرحلہ تھا۔ اسکے دوران میں پہلے پہل آزادی کی فضا نصیب ہوئی۔ کہیں کنسرٹیں تھیں تو کہیں تقریری مقابلے، شفیق استاد خود طالبعلموں کے دل بڑھاتے اور مباحثوں میں ذاتی چوٹوں کو خوش طبعی کے ساتھ وصول کرتے۔ اسلامیہ کالج میں ہم آتو گئے لیکن ڈرتے ڈرتے۔ جانے آئندہ کیسی زندگی نصیب ہو۔ ہمارا اندازہ تھا کہ چونکہ یہ اسلامیہ کالج ہے اس لیے یہاں سب طلباء اپنی نگاہیں نیچی رکھتے ہوں گے اور پروفیسروں کے سامنے جاتے ڈر سے کانپتے ہوں گے۔ جس طرح ہم اپنے محلّہ کی مسجد میں حافظ شہاب الدین مرحوم سے سبق لیتے وقت سر سے پاؤں تک "مشتری ہشیار باش" (40) بن جایا کرتے تھے۔ پروفیسروں کے متعلق ہمارا یہی خیال تھا کہ وہ 'بزرگ صورت' حضرات ہوں گے جن کے پاس ادب کی خاطر، کالج میں ہر طرف عملی طور پر ایک دفعہ ایک سو چوالیس (41) کا دور دورہ رہتا ہوگا۔ لیکن آنے پر معلوم ہوا کہ یہ محض ہمارے اندازے تھے۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج کے پروفیسروں میں سے دو اتالیق، صاحب حلقہ تھے۔ ایک تو استاذی پروفیسر شیخ سراج الدین آذر مرحوم اور دوسرے محترمی خواجہ دل محمد صاحب۔ خواجہ صاحب قبلہ سماع محض کے قائل تھے اور آج بھی ہیں۔ لیکن آذر صاحب مرحوم 'آواز با ساز' پر ایمان رکھتے تھے۔ چنانچہ خواجہ صاحب کے گروپ کا نقشہ قوالی کی مجلس تک ہی رہتا تھا۔ آذر مرحوم کے گروپ میں سازوں کی کارسازی سے اور ہی نقشہ جمارہتا تھا۔ جس میں آذر مرحوم اپنے ہاتھ سے رنگ بھرتے تھے۔ اور اگر اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو آذر صاحب کے گروپ فروغ مشرق (یہ تاریخی نام ہے جس سے اس کا سال تاسیس 1926ء نکلتا ہے) کی تمام رنگینیاں اس کے داہنے ہاتھ کی کمائی تھیں۔ یوں سمجھئے کہ طبلہ اور

سارنگی اس گروپ کا قومی نشان تھا۔ بخت کو بیش غریبوں کا گوارا نہ ہوا اور آذر صاحب اسلامیہ کالج کو چھوڑ کر پسرور کے گورنمنٹ کالج کے وائس پرنسپل ہو گئے۔ فروغ مشرق گروپ، ایسے تو ترنجن کی طرح جس کی سب سے سینئر سکھی ڈولی میں سسرال پہنچ گئی ہو، بے رونق ہو کر رہ گیا اور ایک مرتبہ پھر وہی دھڑ۔۔۔ کا محسوس ہونے لگا، جانے آئندہ کیسی زندگی نصیب ہو جو آزادی کے پہلے گہوارے لائل پور کالج کو چھوڑتے وقت سامنے آیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے نئے ٹیوٹر تاثیر صاحب مقرر ہوئے ہیں۔ عبدالبشیر آذری، جو اس سے پہلے 'استاد' (آذر مرحوم) کے فراق میں ڈانواں ڈول سے رہتے تھے۔ اس دن خلاف معمول ہشاش بشاش نظر آئے۔ ان کی بشاشت سے سب نے ہوا کا رخ پہچان لیا اور اس مرغ بادنما، اے تو بہ، طائر فرخ پے وفرخندہ پیام (42) پر سب نے خلاف معمول تہہ دل سے شاباش اور مرحبا کے ڈونگرے برسائے اور اسکو تاج ملا ھدھد سلیمان کا! (43)

اکیلے اتوار کو نئے صاحب، گروپ میں اس طرح گھلے ملے بیٹھے تھے گویا برسوں کی جان پہچان ہے۔ فضا میں اجنبیت کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہی آذر مرحوم والی بے تکلفی اور وہی انگریزی کے استاد ہونے کے باوجود مشرقیت، ہم نے پیرزادہ احتشام، چلم کے مرثیے والے روڈرولر کی طرف دیکھا اور احتشام صاحب نے مجید اظہر کی طرف اشاروں ہی اشاروں میں طے پا گیا کہ ٹریلر تو اچھا ہے۔ خدا نے چاہا تو فلم بھی خوب رہے گی۔ سب کی یہی رائے تھی کہ تاثیر صاحب کے ہوتے۔ ع داغ فراق، حضرت آذر کا، جائے گا

پہلی ہوسٹل (44) کی دوسری منزل کے جنوب مشرقی گوشے میں کالج کے مشہور Aristocrat سرور نیازی کا آشیانہ بلکہ عجائب خانہ تھا۔ کہیں طبلہ سربسجود ہے تو کہیں ستار تارے گن رہی ہے کہ کب سرور صاحب تصویر بنانے سے فارغ ہوں اور ان کی ماہر فن انگلیاں اس کے تاروں سے انکھیلیاں شروع کریں۔ سب لڑکوں کا یہی چلن تھا کہ دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا کیونکہ اس 'طالبعلم' کی ملاقات کو کالج کے پروفیسر صاحبان تک آیا کرتے تھے اور ایسی خاص خاص تقریبوں ہی پر ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب ان کے کمرے میں آ جا سکتے تھے۔ اگرچہ آرز کی کلاس میں جو سب کالجوں کی مشترکہ ہوا کرتی تھی نیازی صاحب ہمارے ہم سبق تھے لیکن عرصے سے باہمی اجنبیت کی دیوار برقرار تھی۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ سردیوں کی ایک شام جب کہ گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی، پر بوندا بھی

نہیں پڑی تھی۔ دادو ملازم آیا کہ صاحب حقہ مانگتے ہیں۔ میں نے پوچھا کون؟ کہنے لگا کہ اوپر کرے والے نیازی صاحب۔ میں ان دنوں حقے کا بڑا رسیا تھا۔ اور اس معاملے میں دوسروں کو کم ہی شریک کرتا تھا۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ چلو تقریب بہر ملاقات ہی سہی۔ میں نے مستند محققین (حقے پینے والے، ایجاد استاد آذر مرحوم) کے قول کے مطابق 'مسی کے باغ کے تمباکو' کی ایک چلم اس کے حوالے کی اور پورے اہتمام سے حقہ تیار کرا کے بھجوایا کہ کوئی پیئے تو یاد کرے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی ملازم واپس آیا اور کہنے لگا چلئے صاحب پروفیسر صاحب آپ کو بھی بلاتے ہیں۔ اس پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ چنانچہ میں پہنچا تو نیازی صاحب کے علاوہ ہمارے تاثیر صاحب اور بدر مرحوم بھی موجود تھے مجھے دیکھتے ہی آپ نے ہمت افزا شفقت سے ہاتھ میری طرف بڑھایا اور فرمایا کہ بھئی میں نے آذری سے تمہاری تعریف سنی ہے میں نے آج اسی لئے ادھر کا رخ کیا ہے کہ لگے ہاتھوں سرور کے ساتھ تم سے بھی ملاقات ہو جائے۔

سرور نے ایک دو چیزیں گائیں اور جب سرور نے باجے پر لہرا بجایا۔ اس اہتمام والتزام کے ساتھ کہ دائیں پاؤں سے، جس پر گھنگھرو بندھے تھے، گت ناچتے جاتے تھے۔ بائیں پاؤں سے پنکھا چلا کر باجے کو ہوا دیتے جاتے تھے۔ دائیں ہاتھ سے پنکھے کو ٹھوکر دیکر ہارمونیم کو ستار میں تبدیل کرتے جاتے تھے۔ اور بائیں ہاتھ سے سروں کو دباتے جاتے تھے تو تاثیر صاحب جھوم جھوم گئے اور فرمانے لگے کہ بھئی یہ بات تم نے نئی پیدا کی ہے اور پھر اس سلسلے میں رفیق غزنوی کا ذکر خیر شروع ہو گیا۔ یہ حضرت گورنمنٹ کالج کے ماہر موسیقی تھے۔ وہی مقام جو سرور نیازی کو اسلامیہ کالج میں حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں لکھنو کے لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ انیس مرحوم کی فصاحت پر جان دیتا تھا اور دوسرا گروہ دبیر مبروز کی بلاغت پر ایمان رکھتا تھا۔ ان دونوں رفیق غزنوی اور سرور نیازی کے مداحوں کا کچھ یہی عالم ہو گیا تھا۔ گورنمنٹ کالج، جس میں پروفیسر بخاری پیش پیش تھے 'رفیقیوں' کا گڑھ تھا اور اسلامیہ کالج میں 'نیازیئے' کثرت سے تھے۔ ریڈیو کے زمانے سے بہت، پہلے اس زبان بندی کے عہد میں متین مجلسوں کا سنگار، یہی دو مسلمان طالبعلم تھے جنہیں مداحوں کے جھرمٹ سے اپنی کتابوں کی طرف توجہ دینے کی کم ہی فرصت ملا کرتی تھی۔ تاثیر صاحب دل ہی دل میں پکے 'رفیقیے' تھے۔ لیکن انہیں سرور نیازی کے کمال فن سے بھی انکار نہ تھا۔ چنانچہ موسیقی کی مجلس میں بھی 'خوب تان لگائی ہے، واہ وا اس مینڈ کو ذرا اور ظاہر کرو' جیسے کلمات سے نیازی کے جوہر موسیقی کو اور اجاگر کرنے کی

کوشش کرتے۔ جس طرح ہونہار ادیبوں کو داد دے کر ان کی ہمت بندھاتے تھے۔ ایک دن پیغام ملا کہ آج پروفیسر تاثیر صاحب کریسنٹ ہوٹل میں، محمود نظامی کے کمرے میں بزم افروز ہیں۔ بس وہیں رتجگا ہو گیا۔ اور یہ محفل اسی وقت جا کر تمام ہوئی۔ جب مولانا عمر خاں مرحوم اپنی نورانی ڈاڑھی پر محبت سے ہاتھ پھیرتے تشریف لائے۔ 'میاں میاں! کالج نہیں چلو گے، دیکھو آٹھ بج رہے ہیں۔'

آذر مرحوم کے زمانے میں فروغ مشرق گروپ کی سرگرمیاں عملی طور پر آذر مرحوم کے دست و بازو کی رہین منت ہوا کرتی تھیں۔ اور سب تقریباً تابع مہمل ہی رہا کرتے تھے۔ ان کے برعکس تاثیر صاحب کی حیثیت داؤ پیچ بتانے والے جگت استاد کی تھی۔ جو اپنے شاگردوں کو آپ ابھارتے تھے۔ کبھی خود اشارۃً کنایۃً سمجھاتے میاں یوں کہو۔ رفتہ رفتہ فروغ مشرق گروپ میں تحریر و تقریر کی اتنی آزادی ہو گئی کہ کسی متمدن ملک میں بھی اتنی آزادی مشکل سے میسر آ سکے گی اور نہ صرف اسلامیہ کالج کے گروپوں کے لڑکے جوق در جوق اس کے اجلاسوں میں شریک ہونے لگے۔ بلکہ گورنمنٹ کالج اور فارمن کالج کی چیدہ چیدہ ہستیوں کو بھی کثرت کے ساتھ فروغ مشرق کے اجلاسوں میں شریک پایا گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بزم فروغ مشرق کے ایک عام اجلاس میں سارے کا سارا کالج طلباء اور پروفیسروں سمیت موجود تھا (ڈاکٹر سعید اللہ جوان دنوں نئے نئے آئے تھے۔ وہ بھی شریک تھے) اس میں مضمون بھی پڑھے گئے اور شعر بھی (رسمی اور بے جان قافیہ پیمائی نہیں بلکہ ایسے شعر جو زندہ موجود تھے) پھر سردار نیازی کی باری آئی۔ جسکے سوز و ساز نے ایک سماں باندھ دیا۔ راقم الحروف بھی ان دنوں زندہ تھا۔ گانے بجانے سے فارغ ہوئے تو گرد و پیش کا جائزہ لینے کی نوبت آئی۔ حاضرین پر نظر دوڑائی گئی اور جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا چلتے چلتے ہر شخص تاثیر صاحب ہیں کہ ساتھ ساتھ لقمہ دیتے جاتے ہیں اور ہونہار شاگرد بات پا کر بات کو کہیں سے کہیں پہنچا رہے ہیں۔ اتنے میں بابا پیر خاں چپراسی آ جاتا ہے۔ صاحب اب تو سرمن کا وقت بھی گزرنے والا ہے۔ لوگ بادل نخواستہ منتشر ہو جاتے ہیں۔ سیڑھیوں سے اتر کر دیکھتے ہیں کہ چند گم نام قسم کے افراد حبیبیہ ہال میں حاضر ہیں اور اپنی دھن کے پکے عمر خاں مرحوم کی آواز میں وہی زور قائم ہے جو ابتدائے تقریر میں تھا۔

'فروغ مشرق' میں آزادیء تحریر و تقریر کی یہاں تک نوبت پہنچی کہ یاروں نے تاثیر

صاحب کے محبوب دوست حفیظ جالندھری پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ حفیظ صاحب کی شاعری کی ابتدا تھی۔ اور وہ ان دنوں اردو میں چھوٹی چھوٹی بحروں کے گیت رائج کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کے مشہور گیتوں 'یوں وقت گزرتا ہے فرصت کی تمنا میں' جاگ سوز عشق جاگ' 'ابھی تو میں جوان ہوں' کو تختۂ مشق بنایا گیا۔ تاثیر صاحب کی خفگی کے ڈر سے ان تمام کارستانیوں کو پہلے پہلے صیغہ ءراز میں رکھا گیا لیکن آخر کہاں تک۔ فروغ مشرق میں ہمیشہ نئی چیز کی فرمائش رہتی تھی اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ آزری اور نیازی کے ذریعے ان کے کان میں کچھ اس کے متعلق بھنک پڑ چکی تھی۔ ایک دن انہوں نے خود فرمایا کہ بھئی حفیظ کی کوئی پیروڈی سناؤ۔ ڈرتے ڈرتے 'ابھی تو میں جوان ہوں' کا چربہ پیش کیا تو تاثیر صاحب ناراض تو کجا، الٹے خوش ہوئے۔ بلکہ ایک دن حفیظ صاحب کو بھی پکڑ لائے کہ 'شعر ما ھم گوش کن' (45)۔ تاثیر مرحوم (جنکے متعلق راقم الحروف کو یقین ہے کہ) ان چند استادوں میں سے تھے جو اپنی طبعی شفقت کی بنا پر اپنے شاگردوں کی بہبودی میں ذاتی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ ان کی غلطیوں سے بعض اوقات نہ صرف درگزر فرماتے بلکہ اکثر انکی حمایت بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فروغ مشرق کے ارکان کالج چھوڑنے کے بعد بھی فروغ مشرق کے ارکان ہی رہے۔ ایک مرتبہ جب کہ میں اسلامیہ کالج سے لاء کالج میں جا چکا تھا۔ حسب معمول ایک اتوار کو فروغ مشرق کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے آیا۔ اس وقت حبیبیہ ہال کے چاروں طرف فرزندان کالج جمع تھے کہ نیچے اترنے کی سیڑھیوں سے شیخ ایم۔ اے غنی صاحب (جن کا نام شیکسپیئر کے بہترین استاد کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا) اپنے پُر عظمت جبہ ءفضیلت (گاؤن، طیلسان) میں ملبوس برآمد ہوئے اور آتے ہی آپ نے مجمع خلاف قانون سے خطاب فرمایا:

Why are you standing here? Please evaporate!

بھئی کیوں گل محمد بنے کھڑے ہو سب کے سب؟ ہوا ہو جاؤ! شاباش! یہاں سب لوگ شیخ صاحب مرحوم کے معصوم غصے کا تماشا دیکھنے کے منتظر! شیخ صاحب نے اس خاکسار کی طرف توجہ فرمائی:

What is your name and what is your Roll No?

(تمہارا کیا نام ہے اور تمہارا رول نمبر کیا ہے؟) اتفاق سے جواب میں شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس سیزر کا یہ فقرہ زبان پر آ گیا۔ کہ None Brutus! None! (کوئی نہیں اے بروٹس! کوئی نہیں!) بندہ تو یہ کہہ کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ اور شیخ صاحب مرحوم لینا، پکڑنا، جانے نہ پائے کے احکام صادر

فرما کر سٹاف روم میں تشریف لے گئے۔ ادھر تاثیر صاحب تک یہ معاملہ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے شیخ صاحب کو آتے ہی کان میں کچھ ایسی بات کہی کہ وہ فرط شفقت سے مسکرا دیئے۔ اور بات آئی گئی ہوگئی۔ تاثیر صاحب نے اپنے شاگردوں کو ان کے ہاں جا جا کر ایک لڑی میں پرو دیا اور فروغ مشرق کو اتنا فروغ دیا کہ آج یہ بلا مبالغہ انہیں کا زندہ کارنامہ نظر آتا ہے۔ اور پھر ان حالات میں جبکہ کالج کے ارباب اقتدار کی طرف سے اس معاملے میں انکی ہمت افزائی تو کجا الٹی مخالفت کی گئی۔

اس وقت کے اسلامیہ کالج کے یہی دو درخشاں نشان تو تھے۔ بزم فروغ مشرق، تاثیر کا مکتبہ دانش اور مرحوم شیخ ایم۔ اے غنی شیکسپیئر پڑھانے کے استاد اجل! جغرافیہ کی اصطلاح میں یہی مال و ساور بھیجا جا سکتا تھا اور یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ ویسے کالج پر سرزمین افریقہ کی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ جن میں تبسم کی بجلی شاذو نادر ہی کوندا کرتی تھی ان حالات کے باوجود اسلامیہ کالج کے در و دیوار، تاثیر اور شاگردان تاثیر کے حیات بخش بلند قہقہوں سے باغ و بہار بن گئے تھے۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ''صحرا'' مگر بہ تنگئ چشم حسود تھا! (46)

استاد بوٹے خاں گلزار کا حال (47)

جس وقت وہ صاحب کمال ادب کی گاڑی میں ایجاد کے گھوڑے کو جوت کر عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے سخن کے ہر موڑ سے 'بچ جاؤ، بچ جاؤ' کی آوازیں بلند کیں۔ عقد ثریا اس کے گھوڑے کا دانہ بنا جسے آب حیات میں بھگویا گیا۔ اب ایک ایسے استاد کا ذکر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں کیونکہ اس شعر کے پتلے کے گھوڑے کا بھی رونگٹا رونگٹا بیکار نہ تھا۔ اس واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا۔ ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

یہ جھنڈے خان پرچم کے بیٹے تھے۔ جنہوں نے تیس سال تک سنٹرل ماڈل سکول کی ڈرل ماسٹری کے اکھاڑے کو اپنی جسمانی ورزشوں کے علاوہ دماغی کاوشوں سے بھی اندر کا اکھاڑا بنائے رکھا۔ ان دنوں ملحقہ ٹریننگ کالج میں نارمل اور ایس۔ وی کی جماعتیں بھی ہوتی تھیں جن کے طلباء کو استاد پرچم مرحوم اصلاح بھی دیا کرتے تھے۔ ابتداء میں ان کی تنخواہ بہت کم تھی۔ اس لئے زبان کی آبیاری کے لئے وہ اپنے اشعار کو کہ فرزندان معنوی شاعر کے ہوتے ہیں مشتاقان سخن میں اس طرح سے تقسیم فرماتے تھے کہ بیس تیس پرچے اپنی نیکر کی دونوں جیبوں میں بھر کر ہر شام سنٹرل ٹریننگ کالج کے گراؤنڈ میں کھڑے ہو جاتے۔ جو ہر سخن کے پرکھنے والے جوق در جوق آتے اور خاطر خواہ انعام دے کر مختلف پرچے لے جاتے تھے۔ لطف یہ تھا کہ دو ماہ کے بعد پرچہ دینے کی بجائے آپ شاگردوں سے خود شعر کہلواتے اور انہیں سن سن کر خوش ہوتے۔

لطیفہ: پرچم مرحوم سے جب اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمانے لگے کہ یہ زبان کی ترویج کا جبری طریقہ ہے۔ کیونکہ اول اول خریدار سخن جب ان شاہ پاروں کو مشاعرے میں پڑھتا ہے تو وہ محسوس نہیں کرتا کہ اسے قدر دانوں کے حلقے میں ایک نغز گو شاعر کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ ایک شاعر کی ہستی مسلّم ہو چکنے کے بعد اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے۔ وہ بڈھا استاد سخن اس بات کو خوب جانتا تھا کہ اپنی شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے مبتدی جبری شعر گوئی شروع کر دے گا۔ اس میں نکتہ

'جز و یست از پیغمبری' اس فن شریف کو 'ملو عادکر ہا'[1] وہ بھی تھا۔ جن لوگوں کو شاعر نہ ہونا ہوتا تھا۔
یہ تھا کہ جن لوگوں کو شاعر نہ ہونا ہوتا تھا۔ وہ بھی ملوعا و کرہا اس فن شریف کو جز و یست از پیغمبری
اختیار کر لیتے تھے۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ یہ سب انہی باکمالوں کا صدقہ ہے کہ گاؤں
کے سو مدرسوں میں نوے مدرس شاعر ہیں اور باقی دس بھی تخلص کے سوا نہیں۔

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں (48)
وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

استاد بوٹے خاں گلزار کی والدہ کے جیتے جی ان کے والد نے نکاح کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ
اس واقعہ سے دو ماہ بعد پیدا ہوئے تھے۔ پرچم مرحوم کو نئی دلھن سے زیادہ محبت تھی۔ اس لئے ان کی
تعلیم و تربیت میں بہت غفلت برتی گئی۔ ان کی والدہ نے چنگڑ محلہ میں ایک مکان لے رکھا تھا۔ وہ
عفیفہ وہیں قناعت کی چادر اوڑھے گزران کر رہی تھی اور بوٹے خان بھی کبھی ٹریننگ کالج کی سڑک
والی دیوار پر بیٹھ کر اپنے والد بزرگوار کے احکام اور ان کی فوری تعمیل کے منظر دور ہی سے دیکھ لیا
کرتے تھے۔ ان کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ بچپن میں ان کی والدہ کہیں چکی پیسنے گئی تھی۔
یہ جھولے میں پڑے رو رہے تھے کہ اتنے میں ایک کتا آیا اور ان کے ہاں سے ایک روٹی لے کر
چلتا بنا۔ انہوں نے اپنی توتلی زبان میں کتے کی آمد اور روٹی کی گم شدگی کی داستان کو ایسے دلآویز
طریقے سے ادا کیا کہ ماں کو روٹی کھونے کا غم جاتا رہا۔ اور انہوں نے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کیا
اور اپنے خاوند کے خلاف دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے پیشین گوئی کی کہ اس موئے سے یہ بچہ ہزار
درجے اچھا شاعر ہوگا۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ یہ سب کچھ ان کی والدہ کی دعا کا اثر تھا۔
وحیدی سلمہٗ (کہ مستند نشانی بزرگوں کی ہیں) فرماتے ہیں کہ میں نے تو خود بوٹے خاں
کی والدہ سے جب اس واقعہ کی صحت کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے یاد کر کے اس کی تصدیق
کی اور کہا کہ فی الحقیقت اس وقت بوٹے خاں کی عمر برس دن سے کچھ کم تھی۔ جھنڈے خاں پرچم
مرحوم اپنی ایک آواز کے ساتھ سینکڑوں گردنوں کا جھکنا دیکھنے کے عادی تھے۔ انھوں نے نکاح ثانی
کر لیا۔ وحیدی صاحب لکھتے ہیں کہ نکاح ثانی سے تین ماہ پیشتر انہیں محکمہ تعلیم میں اگلا گریڈ بھی مل
گیا تھا۔ اس لئے آئندہ فراغت کے پیش نظر انہوں نے بیاہ کیا۔ اگرچہ باپ نے ان کی تعلیم و
تربیت میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ لیکن ان کے شاگردان تعلیمی کہ اکثر ان میں سے شاگردان معنوی
بھی تھے۔ پر شاباش ہے کہ ان میں سے بعض ننھے بوٹے خاں کو بزرگوں کی نشانی سمجھ کر گلے کا
تعویذ بنائے پھرتے تھے۔ اور جس سے جو کچھ بن نہ پڑتا تھا۔ اپنے استاد زادے کی خدمت سے
دریغ نہ کرتا تھا۔ ان شاگردوں میں فخر کا طرّہ دستار منشی جیون بخش اجل مرحوم کو ملا۔ جنہوں نے

ہمت کی کمر باندھ کر ایک جمعۃ الوداع کو شاہی مسجد لاہور میں چندہ کر کے بوٹے خاں کے لئے ایک گھوڑا اور تانگا خریدا۔ جس سے یہ دونوں ماں بیٹا فراغت سے گزران کرنے لگے۔ اس وقت استاد مرحوم کی عمر انیس برس کی تھی۔ آپ نے چالیس سال کی عمر تک لاہور میں کوچوانی کی۔ وردی میں امتیاز اور بقائے دوام کا تخفہ لگایا۔ اور نقارۂ فخر کی اس آواز کو کوئی نہیں دبا سکتا کہ ایک مرتبہ بھی قانون شکنی کے سلسلے میں ان کا چالان نہیں ہوا۔

استاد کا معمول تھا کہ صبح چار بجے سے بارہ بجے تک اور پھر تین بجے شام سے رات کے نو بجے تک تانگا چلاتے تھے۔ اور باقی وقت مشق سخن کی نذر کرتے تھے۔ بارہ بجے سے تین بجے تک دوست احباب کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ شاگرد غزلیں اصلاح کو دیتے تھے۔ نوکر انہیں ایک کھاروے کی تھیلی میں بھر کر پہلو میں رکھ دیتے تھے۔ وہ بھی بناتے تھے اور ملاقاتیوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کی محویت کا یہ عالم تھا کہ چنگڑ محلے والے مکان کی بیٹھک میں ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ آپ کی عفیفہ ماں ہمیشہ کمیٹی کے نلکے سے پانی بھرتی رہی اور استاد کو معلوم بھی نہ ہوا کہ ان کے گھر میں کنگا موجود ہے۔ ایک دن اندھیرے میں کہ اس گھر میں بجز شاعری کے نور کے اور کچھ نہ تھا۔ اجل مرحوم کا پاؤں اس سے الجھا تو استاد نے کہا کہ 'کیا ہوا' انہوں نے جواب دیا کہ 'کچھ یونہی نلکے سے پاؤں نے ٹکر لی ہے'۔ یہ فرمانے لگے 'یہاں نلکا بھی ہے؟' انہوں نے عرض کی 'حضرت اسی لئے تو آپ کو یہاں لائے ہیں کہ ہر وقت پانی ملتا رہے' ان کے پاس پھٹے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ 'میں تو اس باغ کی آبیاری میں ایسا لگا ہوں کہ ان کے نلکے کی خبر ہی نہیں'۔ یہ کہہ کر چپکے ہو رہے۔ کیا محویت ہے کئی برس گزر جائیں۔ واٹر ٹیکس برابر ادا کرتے رہیں۔ اور یہ پتہ نہ ہو کہ گھر میں نلکا موجود ہے۔ خیر ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ انہوں نے دنیا کے نلکے کی طرف نہ دیکھا اور خدا نے ان کے کلام میں وہ روانی دی کہ آج پانی بھی اس کے آگے پانی بھرتا ہے۔

ایک دفعہ لاہور میں موٹر بسیں رائج ہوئیں۔ اسٹیشن سے ہائی کورٹ تک چھ پیسے کرایہ تھا۔ راستے میں جو اترے اکنی دے۔ مشتاقان سخن نئی چیز پر ٹوٹ پڑے حتٰی کہ اکنی میں سالم تانگے کو کوئی نہ پوچھتا تھا۔ میرے دوستو! وہ زمانہ عجب زمانہ تھا۔ صبح سویرے گھوڑے کا یہ خرچ کہ چھ پیسے کا گڑ، اڑھائی آنے کا آٹا اور تین آنے کا دانہ، دوسرے تیسرے دن مصالحہ۔ دوپہر کو ڈنر کے طور پر ہرا چارہ۔ شام کو پھر چھ آنے کا دانہ۔ گویا ایک روپیہ یومیہ اکیلے گھوڑے کا خرچ اس پر

خانگی اخراجات مستزاد۔ اس دوران میں ایک دفعہ استاد مرحوم پر دو وقت فاقے سے گزر گئے۔ نبض شناس ماں نے کہ بیٹے کی طبیعت سے پوری طرح واقف تھی۔ زبان طعن سے ان کی ہمت کے سمندر کو تازیانہ دیا کہ 'تجھے تانگہ چلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا'۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ دوسرے دن ان کی والدہ کو اپنے میکے کالا شاہ کاکو جانا تھا۔ یہ راستہ اور بھیس بدل کر گاڑی کے اس ڈبے میں پہنچ گئے۔ جس کے ایک گوشے میں اس کی ماں پڑی تھی۔ انہوں نے متانت کے ساتھ جیب سے ایک شیشی نکالی اور بلند آواز سے پکارے 'صاحبان! ہمارے کارخانے کی دوائیوں کی پہلی ہی خوراک اپنا اثر دکھاتی ہے'۔ اس کے بعد آپ نے خوب زور شور سے مقولے پڑھنے اور شعر رٹنے شروع کر دیئے۔ پھر انہوں نے ایک پڑیا نکالی۔ جس میں وہ ایک ایک سونف پر کھانڈ لپیٹی گئی تھی۔ اس کی دو دو گولیاں آپ نے گاڑی میں مفت بانٹنا شروع کیں۔ جو آتا الفر بہ خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر ان کی بات کا یقین کر لیتا۔ یہ انہیں گولیاں چکھاتے تھے۔ پھر ان سے پیسے کماتے تھے جن دوستوں سے راز کہ رکھا تھا۔ انہوں نے والدہ کو خبر کی۔ اس ماما کی ماری نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو فی الحقیقت ادھنیوں، دھیلوں، پیسوں اور کوڑیوں کے ڈھیر ان کی جیب میں کھنکھنا رہے ہیں۔ اس تفریح طبع یا لیاقت ہر فنی کے اظہار کے ساتھ نکتہ یہ تھا کہ ماں بیٹے کو محض وبال دوش نہ سمجھے اور نہ کوچوانی کا پابند جانے۔ جس کوچے میں جائے گا۔ کچھ اچھا ہی لے نکلے گا۔

نازک مزاجی۔ نقل۔ ایک دن آپ نے کسی موچی سے اپنا بوٹ جو بزرگوں کی نشانی تھی گٹھوایا۔ اس نے معمول سے زیادہ موٹے دھاگے کے ساتھ سیا۔ اتفاق سے اس وقت ان کے پاس کوئی اور جوڑا نہ تھا۔ چنانچہ مجبوراً اسی کو پہننا پڑا لیکن فوراً ہی پاؤں میں درد ہونے لگ گیا۔ فرماتے تھے کہ 'میں نے کبھی باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن رینالڈ کے سارے ناول اور منظوم ہیر رانجھا کے قصے کی تمام جزئیات گویا ان کی زبان پر تھیں'۔ مگر مجھے اس پر تعجب نہیں۔ تانگے چلاتے وقت گھوڑے پر فی البدیہہ منظوم غصہ اتارتے تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ سواری کے ساتھ کرائے کا تصفیہ بھی نظم میں کرتے تھے۔ مجھے اس کا بھی خیال نہیں کیونکہ جس فن کو وہ لئے بیٹھے تھے۔ یہ سب اس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ وہ نوشادر کا ایک استعمال بھی جانتے تھے۔ جس سے بڑے بڑے قلعی گران کے مرید ہوتے تھے۔ دودھ دوہنے میں ایسی صفائی اور چستی برتتے تھے کہ اکثر گوجر اس پر تعجب کیا کرتے تھے۔ بعض جولاہوں کو ان کے فن میں قابلیت خداداد سے انہوں نے ایسی ایسی اصلاحیں دی ہیں جو آج تک دل پر نقش ہیں۔ نیل کی تجارت کے اسرار وہ

جانتے تھے۔ حکمت کی گتھیاں وہ سلجھاتے تھے۔ خواب کی تعبیر میں انہیں خدا نے ایک ملکہ راسخہ دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ انسان کو دنیا بھر کے علوم سے واقفیت رکھنی چاہیے۔ وہ اس دنیا کو ایک دلچسپ چیز سمجھتے تھے۔ خود فرماتے ہیں۔

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ　　ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ (49)

آپ کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ اوائل عمر میں گھوڑے اور ٹانگے کا شغل اختیار کیا تھا۔ پھر ہمیشہ اس مضمون کو اپنے اشعار میں باندھا کئے۔ ذرا دیکھنا۔ کس قدر گرم مطلع ارشاد فرمایا ہے۔

گھوڑے کو کداتا ہوا وہ شوخ اگر آوے　　اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آوے (50)

استاد مرحوم کی عمر بتیس سال کی تھی جب آپ نے اپنی مشہور آفاق کتاب 'گھوڑے کے جنسی تعلقات' تصنیف فرمائی۔ آپ نے علم نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں گھوڑے کی دماغی، عقلی اور جسمانی حرکات پر ایک ایسا محاکمہ کیا ہے جس کا جواب نہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس کے جس قدر خیالات بلند ہیں اتنی ہی زبان تعریف سے بالا ہے۔

لطیفہ۔ ایک دفعہ عجیب اتفاق ہوا۔ لاہور میں جوبلی کے جشن پر ایک مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا۔ جس میں یو۔ پی تک کے قسمت آزما شریک ہو رہے تھے۔ استاد گلزار مرحوم نے بھی شاگردوں کے اصرار پر ایک غزل لکھی۔ مطلع تھا

نہ سرکس کا نہ منڈی کا نہ یہ بازار کا گھوڑا　　لڑے گا آج دو دو ٹکریں گلزار کا گھوڑا (51)

جیون بخش اجل فرماتے تھے کہ اس کے بعد جب وہ اپنے ٹانگے پر سوار ہو کر مشاعرے کو چلے تو موچی دروازے کے قریب گھوڑا ید کا اور ان کے ٹانگے کی کہیں ٹکر ہو گئی۔ اجل مرحوم لکھتے ہیں کہ میں نے جوان ہو کر استاد سے پوچھا کہ حضرت کیا آپ کو پہلے سے ہی اس کا علم تھا؟ تو آہستہ سے فرمایا کہ بس بیٹھے بیٹھے کبھی کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ انہیں کرامات تھی یا وہ غیب دان تھے۔ ایک حسن اتفاق تھا جو لطف طبع کے لئے لکھ دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک دفعہ مشاعرے میں غزل ہوئی جس کا مطلع تھا۔

اے گلزار اگر چہ ہم کو آپ سے کوئی بیر نہیں　　لیکن کچھ آثار برے ہیں عشق میں اب کے خیر نہیں (52)

گھر پہنچے تو ان کی عفیفہ بیوی اور ضعیفہ ماں دونوں برس پڑیں۔ کہ ہم غریب آدمی ہیں دو ٹکے کی اوقات۔ موئے شاعروں کی طرح خاک پھانکنا کوئی تمہیں زیب دیتا ہے۔ اس پر بی اماں

نے جھاڑو اور بیوی نے جوتوں سے اپنے حال میں مگن رہنے کی تاکید کی۔ اور وہ شرافت کا پتلا صبرو استقلال سے ان تمام مصائب کو جھیلتا رہا۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ اتفاق سے مرزا رطل بوق شیرازی جو خود صاحب دیوان اور ان کے جلیل القدر شاگردوں میں سے تھے، مشاعرہ کے بعد پھر ان کے گھر پر موجود تھے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد انہوں نے اس مطلع کو پڑھا اور پوچھا کہ حضور یہ کیا؟ جو کچھ زبان سے نکلتا ہے وہ بعد میں ہو جاتا ہے۔ اس پر آنکھیں بند کر کے فرمایا کہ بس ادھر ہی کا فیضان ہے۔

اخیر میں استاد نے تانگا چلانا چھوڑ دیا۔ ان کے گھر کے قریب ہی چند احباب رات کے پردے میں قمار بازی کے ذریعے قسمت آزمائی کیا کرتے تھے۔ یہ بھی انہیں کے پاس رہتے۔ کسی کے جیتنے پر قصیدہ اور ہارنے پُرمرثیہ لکھتے۔ ان کا مقولہ تھا کہ مرد وہ ہے جسے معمولی ضروریات زندگی بھی میسر نہ ہوں اور وہ ان کے لئے تگ ودو میں مصروف رہے۔

ایک روز شاہ محمد غوث کے تکیہ (53) سے باہر رات بسر کی۔ آپ ابھی سو ہی رہے تھے کہ الاؤ بجھ گیا۔ اور صبح ہوتے ہوتے وہ استاد یگانہ جس کے بعد اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام ہندوستان میں پیدا ہو، نمونیہ کی وجہ سے پاس والے راکھ کے ڈھیر کی طرح خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ افسوس اتنے شاگردوں کے ہوتے ہوئے کسی بے حیا کو اتنی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ اس کی تعریف وہ ہی کہتا۔

یوں مریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے ‏‏‏‏‏‏ اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

☆☆☆

دیباچہ 'حسن نظر' از چرخ چنیوٹی (54)

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا!

اپریل 1937ء تک مجھے گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج دھرمسالہ (کانگڑہ) میں فارسی، اردو اور تاریخ پڑھانے کا شرف حاصل رہا۔ لیکن دل میں یہ خلش بدستور چٹکیاں لیتی رہی کہ وکالت پیشہ آدمی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ 'شہر سے دور شہر یار سے دور' ملازمت کی جھک مارتا پھرے۔ وکالت کے میدان میں متوقع کامیابیوں کے پیش نظر میں نے استعفیٰ داغ دیا اور واپس اپنے وطن چنیوٹ آپہنچا۔

مجھے گھر پہنچے کوئی دو چار دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک بھولے بھالے پرخلوص نوجوان سے میری ملاقات ہوئی جو اپنی لیاقت، دیانت، شرافت اور حسن کارکردگی سے آگے چل کر ایک بلند مقام حاصل کرنے والے تھے۔ جناب ایشر داس چرخ چنیوٹی، جنہوں نے اسی سال اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ میری درخواست پر ہم دونوں نے وکالت کی گاڑی میں دو پہیوں کی طرح مل کر کام کرنا شروع کر دیا اور اگرچہ کاروباری تعلق کچھ عرصے کے بعد ختم ہو گیا لیکن ہم خیالی اور ہم طبع کا جو باہمی تعلق ہے وہ اللہ کے فضل سے اب تک قائم ہے۔ اور خدا نے چاہا تو جیتے جی کبھی ختم نہ ہوگا۔

ان دنوں ہم دونوں 'تازہ واردان بساط دل' تھے۔ اور ہمارے ذہن اس مرحلے پر تھے کہ باہر سے جو اثر بھی ملے قبول کر لیں۔ میرے استاد گرامی پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے فرزند داؤد، جنہیں بعد میں دنیا نے اختر شیرانی کے شہرہ آفاق نام سے جانا اور پہچانا' جب لاہور کے ہنگاموں سے اکتا جاتے تو 'مزامنہ کا بدلنے کے لئے' سیدھا چنیوٹ کا رخ کرتے جہاں راقم اور جناب ایشر داس چرخ ان کے لئے چشم براہ رہتے۔ جب وہ ہمیں اچھی طرح نواز لیتے تو چنیوٹ سے ہی بھوانے کے راستے عازم جھنگ ہو جاتے جہاں ہمارے محبوب دوست سید شبیر حسین تحصیل دار تھے۔ گویا چنیوٹ ہو یا جھنگ، سید شبیر حسین اور جناب اختر شیرانی کا قرب ایک مسلسل تعلیمی تجربہ تھا۔ جو ہر وقت ہمیں میسر تھا۔ تھوڑے دنوں ہی میں جناب چرخ کے ذوق میں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی ہوتی گئی اور چنیوٹ کا معروف ہفت روزہ پرچہ 'یادِ خدا' جناب چرخ کے رشحات قلم سے مزین رہنے لگا۔

1942ء میں جنگ عظیم ثانی کے دوران میں نے ریڈیو پر لاہور سے تقریر نشر کی موضوع 'دیہاتی رسوم' تھا اور 'زبان پنجابی' اتفاق سے سر سکندر حیات خاں مرحوم وزیر اعظم پنجاب نے اسے سن پایا۔ اور ہمارے علم کے بغیر بالا بالا ہی یہ فیصلہ ہو گیا کہ تحریک پنچایت کے سلسلے میں قانونی مشیر کی حیثیت سے مجھے لاہور میں تعینات کیا جائے۔ میرے لاہور پہنچنے پر جناب چرخ چنیوٹی کے لئے لاہور میں مستقل قیام کا بندوبست بھی ہو گیا۔ اور تحریک پنچایت کو فروغ دینے میں جناب چرخ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس تحریک کے اپنے ہفت روزہ پرچے 'پنچایت' کی ادارت چراغ حسن حسرت کے (اور ان کی غیر حاضری میں میرے) سپرد ہوتی تھی۔ حلقہ پنچایت میں دیگر ادبی شخصیات کے علاوہ جناب چرخ چنیوٹی بھی تھے۔ جن کے سادہ افکار، خلوص اور سچائی سے پُر ہوتے تھے۔

مجھے خوشی ہے کہ جناب چرخ کی شاعری میں پنجاب کا جوان خون دوڑ رہا ہے۔ اس میں دریائے چناب کی خنک اور صحت مند ہوا کے جھونکے دلوں کو ٹھنڈک پہنچا رہے ہیں۔ ان کی شاعری فرضی خیالات پر مبنی نہیں بلکہ ان کے خیالات اور احساسات کی جڑیں، دیس کی سرزمین میں پاتال تک چلی گئی ہیں۔ وہ اپنی قلبی وارداتوں کو آپ بیان کرتے ہیں اور نہیں 'حدیث دلبراں' بیان کرنے کے لئے 'حدیث دیگراں' کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ میری دلی دعا ہے کہ جناب چرخ چنیوٹی جو زندہ دل اور حق گو شاعر اور پنجاب کے ادیبوں میں منفرد ہستی کے مالک ہیں اردو کے دامن کو پنجاب کے خلوص بھرے جذبات، بے ساختگی اور بے تکلفی سے ہمیشہ بھرپور اور مالا مال رکھیں اور وہ اردو کے آسمان ادب پر ہمیشہ مادہ آفتاب بن کر چمکیں۔ آمین!

لے نہ ڈوبے کہیں دریائے غضب اردو کا
سب کو لازم ہے دل و جاں سے ادب اردو کا
دو نہ کہیئے، کہ یہی ایک سخن کافی ہے
"شاعری چرخ کی سرمایہ ادب اردو کا" (55)

☆☆☆

ساڈی وسوں دے مسلے (56)

(افواہاں پھیلانا)

ایہہ منّی پرمنّی گل اے پئی دنیا وچ سارے فساد، زن، زر، زمین تے زبان توں اٹھد ے نہیں۔ زبان نوں گاہل مندے نال ورتیا جاوے تد وی فساد، تے جے اسنوں افواہاں پھیلان اتے لا دتا جاوے تے ایس توں ودھ کے ہور کوئی مصیبت ساڈی وسوں اچ نہیں آسکدی۔ افواہاں اگاں چل کے کئی قسماں وچ ونڈیاں جاسکدیاں نہیں۔ اک تے کسے اتے جھوٹا بہتان بھنیاں۔ ایہہ جاندیاں ہوئیاں پئی اس وچ کوئی حقیقت نہیں۔ تے دوجا شرارت دی نیت نال اجیہا نھکے کوڑ مارناں، پئی اوس نال فساد دی اگ پھیل جاوے۔ حضرت بابا بلھے شاہ ہوراں نیں ایسے واسطے فرمایا سی پئی ''سچ آکھیاں بھانبڑ مچدا اے'' ایہو جۓ سچ بارے ای حضرت شیخ سعدی ہوریں فرما گئے نیں پئی 'دروغ مصلحت آمیز بہ از راست فتنہ انگیز (57)۔' پئی جس سچیائی نال وادھا ہووے، اوس نالوں اوہ سیاناں کوڑ چنگا جس نال فساد دی اگ نہ بھڑکے۔ اک ہور گل وی اے۔ پئی ساڈی واسیوں وچ تماشا ویکھن واسطے وی افواہاں پھیلائیاں جاندیاں نہیں تے ہک چنگے بھلے بندے دا بھرم بھانکرے لاون واسطے وی گلاں گھڑیاں جاندیاں نیں۔ زبان دیاں رولیاں گولیاں وچ اوہ بہتان وی گنیں جاسکدے نیں۔ جیہاں وچ کسے دی عزت تے شہرت نوں دھبا لگدا ہووے۔ مثال کئی چنگے روح، اک آکھے نہ لگن والی شخصیت دی بابت، گین کر کے شہریاں پنڈ دیاں نکراں مل لیندے نیں تے آوندے جاندے نوں پۓ دسدے نیں پئی سنے ای راتیں کش ہویا اے۔ تے اگاں سنن والے بھی اس گال دا اوہ یرا کیتے بنا پئی ایس گل دا کوئی وجود وی ہے کہ نہیں، اس کوڑی گل نوں چالیندے نیں۔ تے اک چنگے بھلے شریف شخص دی عزت اپر حرف آجاندا اے۔ تے ایہو جیہاں افواہاں دی لپیٹ وچ کئی استاد وی آجاندے نیں، جیہاں کولوں پچھیا چھڑان واسطے، اونہاں نوں اسطراں بدنام کیتا جاندا اے۔ پئی مڑ کے اوس پنڈ داناں ای نہ لین۔ فساد دی اگ پھیلاون والیاں افواہاں وچ شاعری سیری وچ آجاندی اے۔ خورے کسے زمانے وچ دونہاں قوماں دے وچکار کدے کوئی بھیڑ ہو یا وی سی کہ نہیں۔ پڑ وچ جوش دلاون واسطے، دوہاں پاسیاں

اے شاعر سیر کئی کئی عجیب گھڑ دے۔
تے اپنے اپنے دھڑے نوں ہور ہلا شیری دوان واسطے، کئی اگلیاں ویلیاں دے کوڑے سچ قصے گھڑ گھڑ کے تے لوکاں نوں ہور جوش دو یندے نیں۔ بھانویں ایس بھیڑ دی گل نوں اگاں ودھان ای کیوں نہ ہو جاوے۔ ایس طرح ایہہ شر شیطان وی فساد پھیلاون والی فوج توں ہور طاقتور بندے نیں۔ تے ایس حکم دی سچیائی نوں ثبوت کر دیندے نیں پئی الشعرا ء یتبعون (پئی کئی شاعر شیطان دے چیلے بن کھلوندے نیں)

ایس دے نال نال اوہ لوکی وی آجاندے نیں جہڑے کسے دے آکھیاں اکھواں کوڑیاں افواہیں پھلاوندے نیں۔ دکھ لوکاں دے اپنے ہوندے نیں پر ایہہ اوہناں دکھی لوکاں دے ہتھ ٹھو کے بن جاندے نیں تے کدرے تے کسے بندے دے برخلاف جھوٹی رپٹ لکھوائی کھلوتے ہوندے نیں۔ تے کدرے اپنیاں موہریاں دی آکھاتے بے گناہ تے بے وسیاں بندیاں دے برخلاف کوڑی شہادت تے گواہی دتی کھلوتے ہندے نیں۔ تے جے کوئی تفتیشی افسر مل جاوے تے اوس نوں سونہہ چا کے انج یقین دوادیندے نیں جیویں حقی گل ایسے طراں ائی ہوئی ہووے۔

اساں عدالتاں دے کئی ایسے فیصلے پڑھے نیں جہناں وچ صاف لکھیا ہوئیا ہونداا ے پئی مقدمہ جھوٹا بنایا گیاا ے تے فلانے فلانے گواہ نے جھوٹی گواہی دتی اے۔ ایس واسطے ملزم نوں بری کیتا جانداا ے۔ لوکی مقدمیاں وچ بری ہو کے اگاں قنون دی یاری نہیں منگدے نیں تے ساڈے قنون وچ ایسیاں کوڑیاں بندیاں نوں پاکستان دی تعزیرات دی دفعہ 193 تھلے ست سال تیکر بنھیاں جاسکداا ے۔ تے جے کوئی کسے قتل دے مقدمے وچ ایسی جھوٹی شہادت دیوے، جس وچ عمر قید یا پھانسی دی سزا دتی جاسکدی ہووے تے فیر دفعہ 194 تعزیرات پاکستان تھلے ایسے جھوٹے گواہ نوں دس ورھیاں تیکر وی قید کیتا جاسکداا ے۔ ایسیاں فوجداری مقدمیاں تو وکھریاں انہاں دے برخلاف دیوانی وچ ہرجانے دے دعوے کر کے ڈگری وی کرائی جاسکدی اے۔ تے اک واری ایسیاں افواہیں پھیلان والیاں جھوٹھیاں گواہاں نوں برے، دے گھر تیکر وی لے جایا سکداا ے۔

انہاں افواہاں دے وچ ای گم عرضیاں دیناں تے ایہہ جاندیاں ہوئیاں پئی ایس تاردا سچ نال کوئی واسطہ نیں، جھوٹیاں تاراں دیناں وی آجانداا ے۔ قنون وچ ایسیاں جھوٹھیاں تاراں

باہتے دی مکو بدھا گیا اے۔ جہڑا کوئی ایہہ جاندیاں ہوئیاں پئی میں جھوٹھی تار دے رہیاں واں، تار دے قنون دی دفعہ 29 تھلے وی اس نوں سزا دتی جا سکدی اے تے ایس طراں کوڑ کت دا دارو کیتا اے۔

ساڈے پنجابی ادب وچ اک ایہو جہے افواہاں پھیلان والے دی حالت سئیں وارث شاہ ہوراں نیئیں انج لکھی اے۔

گل پائیکے سہلیاں لاہ ٹوپی، پاڑ جلیاں سنگھ تو گھٹیو نیں
بھن دور تے کنگے چھڑن لتیں، روڑھ وچ کھڑل دے سٹیو نیں
جھنجھوڑ سر توڑ کے، گھت مودھا، لانگڑ پاڑ کے دھڑ ادھڑ کٹیو نیں
وارث شاہ داڑھی پٹی پاڑ لانگڑ، ایہہ اکھڑ اا اے جا کھٹیو نیں (58)

تے فیر اگاں فرماندے نیں:

ہک مارلتاں، دوئی لاچھمکاں، ترئی نال چٹا کیاں ماردی ہے
کوئی اٹ وٹا، جتی، ڈھیم، پتھر کوئی پکڑ کے دھون، بھوئیں ماردی ہے
کوئی پٹ داڑھی، ڈبر وچ دیندی، کوئی ڈنڈ کا وچ گزاردی ہے
چور ماری دا ویکھئے چلو سادھو، وارث شاہ ایہہ ضبط سرکاردی ہے

ساڈے قنون وچ وی افواہیں پھیلاون والیاں نوں بھیڑی نظر نال ویکھیا جاندا اے۔ اس واسطے پرانی واسیوں وچ، افواہاں پھلاون والیاں نوں کٹن واسطے لوکی انج اے طیار ہوندے سن جویں سئیں وارث شاہ ہوراں نیں اہر تصویر کھچی اے۔

☆☆☆

تعارف (60)

میرے عزیز شاگرد، خلیل احمد ملک ہوراں نیں جد اپناں ایہہ ارادہ میرے اوپر ظاہر کیتا پئی اوہ قبلہ گاہی، حافظ برکت علی قادری لاہوری دی حیاتی تے اونہاں دی پنجابی شاعری بابت مقالہ لکھنا چاہندے نیں ۔ تاں میں اوہناں نوں شاباش آکھی تے ایہہ ای یقین دوایا۔ پئی اوہ میرے ولوں ہر طرح دی امداد دا یقین رکھن۔ اوہناں نیں وڈی محبت تے خلوص نال ایہہ مقالہ لکھیا اے۔ بھانویں ویکھن وچ ایسدا حجم تھوڑا ای معلوم ہووے گا۔ پر اوھناں پہلی کوشش وچ ایس موضوع اپر اپناں کش مواد اکھٹا کر دتا اے۔ جیس توں کم لئے کے آون والے لوک ایں تے ہور چوکھا چانن پاون دے قابل ہو جان گے۔

میری خوش بختی سی پئی میں مرحوم چوہدری محمد افضل ایم ۔ ایس سی مدرس فزکس ڈیپارٹمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاولپور دی رکی سفارش نال قبلہ حافظ صاحب دی خدمت بابرکت وچ 1943ء وچ پہنچیا ساں ۔ اوسدے بعد آپ دے وصال تیکر برابر حاضر خدمت رہیا۔ اوہناں دے عربی، فارسی، اردو تے پوری زباناں دے نال نال آپ دا سارا پنجابی کلام میرے سامنے ای لکھیا گیا۔ تے ہزاراں واری قبلہ حافظ صاحب دی مجلس پاک وچ خود اوھناں دی اپنی زبانی سنیاں تے پڑھیا پڑھایا گیا۔ عام لوکاں تو وکھریاں اوہناں مجلساں وچ جیہڑیاں علم تصوف نال تعلق رکھدیاں نیں۔ آپ دا کلام باقاعدہ پڑھیا جاندا اے۔ تے ایس دا بہتا حصہ خاص کر کے سی حرفی 'مقبول دربان دل ملول' عقیدتمنداں دا روزمرہ دا وظیفہ ہو گیا اے۔

حضرت سلطان العارفین سلطان باہو، میاں علی حیدر، میاں محمد بخش (سیف الملوک) وانگر قبلہ حافظ صاحب نرے شاعر ای نہیں سن۔ اوہ مرشد کامل دا درجہ رکھدے سن ۔ ساری عمر اوہناں جو فرمایا اوہ کر دکھایا۔ باراں وریاں دے سن جد آپ پہلی واری بغداد شریف پہنچے۔ فیر ایس سلسلے وچ انج پروئے گئے پئی اوہوای اوہناں دی زندگی دا مقصد بن گیا۔

قبلہ حافظ صاحب نے ست واری بغداد شریف دا سفر اختیار فرمایا۔ اوہناں چھیکڑلا سفر مئی جون 1957ء وچ ہویا۔ جس وچ میں وی اونہاں دے نال ساں ۔ ایس بابرکت سفر دیاں گلاں وکھری تفصیل چاہندیاں نیں ۔ حافظ صاحب نے حج بیت اللہ شریف تے روضہ ء پاک

مدینہ منورہ دی حاضری دا شرف وی حاصل کیتا۔

آپ دا وصال جمعے دے دن سویر دی اذان دے ویلے 8 نومبر 1963 بمطابق 20 جمادی الثانی 1383 ہجری نوں ہویا۔ تے راقم نیں آپ دے وصال دی تاریخ۔۔۔۔

لطف غوث پاک سے بالا نصیب   حافظ برکت علی پیراز حبیب (61)

وچوں کڈھی۔ آپ نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ آپ دیاں یادگاراں 'تبلیغ و نیاز کمیٹی' تے 'بزم احناف' کوچہ غوثیہ لاہور نیں۔ جنہاں دے انتظام تھلے آپ دے مزار مبارک اپر ختم شریف تے لنگر دی تقسیم توں وکھریاں دو عالی شان مسجداں دا انتظام وی اے۔ قبلہ گاہی حافظ صاحب دا پنجابی کلام اوہناں دے دوسرے کلام وانگر اک ایسا روشنی دا مینارا اے جس دے کولوں ہمیشہ نیکی دی تلقین دا چانن ہر ویلے رحمتاں دا مینہ ورساندا رہوے گا۔

میری دعا اے پئی اللہ تعالیٰ عزیزی خلیل احمد ملک دی اس پہلی کوشش نوں قبول فرماوے۔

☆☆☆

TERRAE INCOGNITAE (62)

Of course everyman is in himself a world of thoughts of evasive figures and ephemeral hopes. Nothing in the world, Says, Shakespeare, is good or bad in itself but thinking makes it so, A man expresses in his own way the things he hears, sees or fees. The voice of a partridge is the same, but to a confectioner, it appears to have said, 'Lun-Tel-Adrak'(63) and to a pious Muslim 'Subhan Teri Qudrat(64).' They say it is mal-observation but I dare say no in my opinion.(65)

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

A Newton would say that"Paradise Lost" proves nothing. And a poet (that bard of Nature' as Words worth puts him) would snuff at the puzzling and un-interesting problems of Mathematics, Algebra and Geometry. Man is an imaginative creature, he can picture his future on the basis of his imagination does not matter whether little or much. To all of you, especially those who have not developed their power of thinking, I transport to the Terrae Incognitae of imagination.

Says Byron is one of his most beautiful and sublime lyrical poems:-

"She walks in Beauty like the night
of cloudiness climes starry skies"

Now reader! It rests with you to think of a night of "cloudless climes" and "starry skies," to justify the poet's statement, to be lost in the unfathomable depth of imagination, to feel as I do, and as the poet himself did.

There are many of us, who, when asked to sing give this cold, solemn and annoying answer, "We have no voice befitting the task.' Now if you ask them, have you ever sung before?" They reply very calmly, "No." There, one is annoyed, "Well if you have never Ung before, how do you know that your voice is unmusical" If happily, they give out something then we come to know that in three quarters they have the capacity of a good singer, It is simply then bashful art, which makes the fully kind, I should say that prevents them from singing. Of course their inscrutable modesty and the un-hormonal sing inclinations of the society are the chief obstacles that keep them behind the veil, The same is the case with Poets.

Now-a-days when their supply is at its height in the market, the demand for them has decreased in the same ratio. Yet a good commodity like that of Iqbal and Tagore is demanded much. Why? Because of its unlimited utility, I do not hold dear a verse because it is written by some Rumi, Girami or Iqbal, but because it is fully of literary treasure and gems of marvelous

imagination. Just picture the line written by an unkown and unappreciated Indian Muse, who feels him-self enraptured by the sight of a dark, thick cloud and signs in his postoral way:- "*Jia mora lehrai hai chhai hai kali ghata*(66)" If you will imagine a bit then *lehrahi hai*"would transport you to regions unknown lands as yet unexplored. You will scarcely believe in what I say, yet this hemistich, to tell you the truth, inspires me and thrills my heart.

Again Ghalib says:-(67)

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ　　جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

Now just imagine the poor lover, In the dream (which he takes to be real) he chats with his beloved, plays with him, as the silent dirges after waves do with each other, or like the morning breeze that passes through the garden, playing on with the jasmine, narcissus and the rose. He feels himself quite unmolested by the cursed rivals and above all finds his beloved hind to him, But ah! The vesper bells!!! He wakes up. The vision flies. The poor lover in total despair addresses the beloved (in his absence)..........Now recite the verse. There are a hundred and one instances in our own literature that appeal to our mind greatly. For example Ghalib's verse:-

گدا سمجھ کر وہ چپ تھا میری جو شامت آئے　　اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے (68)

If you have imagined the innermost feelings of a lover wife who, with a sigh on her lips, which breathes romance-tears glittering in her eyes, sighs at the dead of night:- 'Piya jae pardes'.(69)

The poet Nazeeri, depicting the meeting scene of two friends separated and unremembered by each other, when one of them thinks that the other's love for him has faded away, while the other also assumes similarly, both of them remain silent for a little time, but at last one of them breaks the pervading silence, complains - and other things of the sort are brought forth in order to judge whether their mutual love still lurks in their hearts, says:-

چہ خوش است از دو یک دل سر حرف باز کردن   سخنے گزشتہ گفتن گلگبہ دراز کردن (70)

Again the same bard of Neshapur depicts the following scene:- The beloved is forced by circumstances not to see the lover on a particular day and in anticipation settles the occasion. The lover waits for the return of him all the night through, sometimes fearing a sudden mishap that might have befallen the beloved or some deceitfulness on the latter's part. The night gradually gives place to the day, when the beloved returns. At that time he says:-

بچھر دوے کہ امشب سوختی آزردہ جانے را   بقدر روز محشر طول دادی ہر زمانے را (71)

So there are numberless instances that appeal to

our imagination. Coleridge speaking of his"Ancient Mariner's' Lone liner says:-

"Alone alone all alone on a wide wide Sea." Or in order to impress upon our hearts, the helplessness of the Mariner, when there is no drop of water left for him to drink, he says:-" Water Water every where: but not a drop to drink."

If you lack in the power of imaginating something holy then get it and improve it now,. It would be of ample use to you. Through it you can call before your mind the years to come and the days gone by. It is thus, that you can enjoy "the sweetest songs" that are the outcome of 'saddest thoughts" which in days gone by once enraptured your hearts, claimed you in anxiety and put your bosoms to throb with the hopes you cherished once....now dashed to the ground. by dint of it every one of us can trace our duty to god and our parents.

It is through imagination only that one can enjoy poetry Personally. I love poetry, and I have decided to do through my imagination as Shelly's Skylark does:-

" Like a poet hidden
In the world of thought,
Singing hymns unbidden,
Till the world is wrought,
To sympathy with hopes and fears it headed not"

Khizar Tamimi

IIIrd year Roll No.88

مکاتیب

خط بنام 'ایڈیٹر' رومان، لاہور (1)

"........اب کی بار کافی صبر آزما انتظار کے بعد 'رومان' باصرہ نواز ہوا۔ اس لئے وہ 'دیر آید درست آید' کا صحیح مصداق ہے۔ تمہارا تخیل ہزار نرالا سہی لیکن اس کی بلندیوں کے ہم پہلے ہی شکار ہیں اور رومان کے دوسرے معاونین کے افکار نادرۂ روزگار سہی لیکن اس خوان نعمت کے ہم اس سے پہلے ہی میز بانوں میں ہیں۔ مگر سب سے زیادہ اس اشاعت میں جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ ڈاکٹر نجمی کا 'تارو' ہے۔ اگر چہ ستمبر کے رومان میں موصوف کا دیہاتی ڈاکٹر اردو ادب میں ایک نرالی چیز تھی لیکن (ڈاکٹر صاحب معاف فرمائیں) میں نے ان کی اس پہلی کامیاب کوشش کو ایک 'کودک نادان' کی روایتی 'از غلط بر ہدف زند تیرے' محمول کیا تھا۔ لیکن 'تارو' کے مطالعہ کے بعد ماننا پڑا کہ اردو افسانہ نویسی کے افق پر ڈاکٹر نجمی کے قالب میں ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ جس کی رخشانی ابتدا ہی سے جاذب توجہ ہے۔ اس وقت مجھے حیرت بھی ہے اور خوشی بھی۔ ایک طرف تو اپنے طریقہ تعلیم کے ناقص اور تقدیر کے اعجوبہ کار ہونیکا قائل ہو رہا ہوں جس نے ایک جوہر قابل (Genius) کو غیر شاعرانہ بلکہ 'معشوقانہ' (قطع و برید کے لحاظ سے) زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اور دوسری طرف اس وجہ سے خوش بھی ہوں کہ اس جوہر قابل نے ان مخالف حالات کے باوجود اپنا راستہ آپ نکال لیا ہے۔ اردو میں اگر چہ اچھے اچھے افسانے موجود ہیں لیکن بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے چند ایک کے سوا باقی تمام زندگی کے مرقعے پیش کرنے سے عاری ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے افسانے ہماری حقیقی زندگی کے دیکھے بھالے ہوئے پہلو پیش کرتے ہیں۔ جس پر جزئیات کو بھی بخوبی بیان کرنے کی قوت مشاہدہ مستزاد ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا قلم ان کے پیشہ ورانہ نشتر سے بھی زیادہ استادِ فن معلوم ہوتا ہے۔ اور اب ہمیں اردو افسانہ نویسی کی بہت سے توقعات ان کے دامن سے وابستہ نظر آ رہی ہیں۔

سید شبیر حسین صاحب کا 'روزنامچہ' بھی اچھوتی چیز ہے۔ سید صاحب نے اس قدر قدرت بیان کے ساتھ اس مضمون کو نبایا ہے کہ معلوم ہوتا ہے حضرت نے جگ بیتی کے پردے میں آپ بیتی بیان فرمائی ہے۔ اب تک ہم تحصیلداروں کو سرکاری بنیوں سے زیادہ نہ سمجھتے تھے۔ اب

معلوم ہوا کہ اس کلیے کے بھی 'بھاری بھرکم' استثنیٰ موجود ہیں۔ ماشاء اللہ از بسکہ لطائف جعفری صاحب کے تھے۔ اس لئے لازماً جاندار تھے لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت آپ 'راوی' کی ایڈیٹری نہیں فرما رہے ہیں۔ بلکہ 'رومان' لکھ رہے ہیں۔ اس لئے یہ بچوں والی تحریریں چھوڑیئے اور مستقل موضوعات پر اپنی فکاہیہ قابلیتوں کو بروئے کار لائیے۔ یہ کیا کہ ع صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں!(2) اس لئے رومان کی آئندہ اشاعت میں آپ کا ایک شاہکار ضرور ہو آخرع پس از آنکہ من نہ مانم، بچہ کار خواہی آمد(3)۔ اپنے مضمون نگاروں کی تعریف کے بعد 'نیش بعد از نوش(4)' کے طور پر اپنی ایک غلط بخشی بھی سن لو۔ 'رومان' مئی 1935ء میں شروع ہوا تھا۔ اس لئے مئی 1935ء کا رومان جلد اول کا نمبر اول ہے۔ پھر نومبر 1935ء سے دوسری جلد شروع ہوئی۔ چنانچہ جون 1936ء اور جولائی اس کے دوسرے اور تیسرے شمارے تھے۔ اس لحاظ سے نومبر 1936ء سے رومان کی چوتھی جلد شروع ہونی چاہیے لیکن تمہارے کسی ایسے کاتب نے جو جناب حافظ شیرازی کا سمرقند بخشی اور بخارا دہی میں کامل ظل اور بروز معلوم ہوتا ہے۔ اگست 1936ء کے 'رومان' کو مکرر جلد 3، نمبر 3 بجائے 4 درج کر دیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے تم نے ستمبر اور اکتوبر کے رومان کو نمبر 6،5 شمار کرنے کی بجائے غلطی سے نمبر 5،4 لکھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں رومان کی نئی جلد نومبر کی بجائے دسمبر سے شروع وہاں تمہیں بھی ایک کامل و سالم اشاعت کی جبری اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے۔ ہوش کرو اور یوں سود فراموش نہ ہو جاؤ۔ اگر تم موجودہ شرح بدل کے عوض بھی رومان مہیا کرتے رہو تو یہی جنس کیا کم سستی ہے کہ تم ایک اور اشاعت بے قیمت ہی عام کر رہے ہو۔ آخر شاعر ہو نا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ وہ ایک ایک سگریٹ کی قیمت کا محاسبہ کرنے والے منیجر شیخ نواب صاحب کس مرض کی دوا ہیں کہ مسلسل تین اشاعتوں میں وہ اس لغزش کو دور نہیں کر سکے۔ تم نے جو غزل سندھ کی ایک شوخ کم سن کے لئے تحریر کی ہے وہ اصل میں امیر مینائی کی زمین ہے لیکن جدت تخیل کے باوجود قافیہ کی تکرار اس میں کھٹکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لکھتے وقت تم اپنے حال میں نہ تھے یا شاید اس لئے کہ 'سندھی مٹھائی' کی فرمائش تھی۔

ہمارے بزرگ چودھری خوشی محمد صاحب ناظر نے ایک مدت سے رومان کو یاد نہیں فرمایا۔ ان سے درخواست کیجئے کہ آپ کا قلم فی الحقیقت گیسوئے اردو کا شانہ ہے۔ اس لئے براہ نوازش اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ہمیں متمتع ہونے سے محروم نہ کیجئے۔ مستوں کو سرود یاد

دلانے کے طور پر 'لیڈر اور ایڈیٹر کا مناظرہ' ارسال کرتا ہوں۔ دعا ہے قبلہ محترم چودھری صاحب کو میری اس نظم کے نقائص اس قدر زیادہ غصہ نہ دلائیں کہ وہ اس سے متاثر ہو کر اردو شاعری کا ایک غیر فانی نقش پیدا کر دیں ۔ حضرت قبلہ بابا جان کی خدمت اقدس میں سلام نیاز

برخوردار.......... کی دیدہ بوسی اور ہمرا یے غیرے نتھو خیرے کی دم میں نمدا۔ والسلام

تمہارا اپنا! خضر

خط بنام والد صاحب (5)

بصرہ (عراق)

4 جون 1956ء

بخدمت جناب والد صاحب قبلہ سلامت باشد۔ السلام علیکم۔ مزاج شریف!

ہم بخیریت تمام کل دس دن جہاز میں رہنے کے بعد بصرہ پہنچ گئے۔ آج بغداد شریف کے لئے سیٹیں بک چکی ہیں۔ اس لئے شام کو روانہ ہو کر انشاء اللہ کل صبح وہاں حاضری دیں گے۔ والدہ صاحبہ اور عزیزان کو دعوات اور پیار دیں، بخت، نعیم صاحب بھولا ریچھ اور کا کی کو خوب پیار کریں۔ عزیزی فاطمہ بی بی، منورہ شمیم کو پیار دیویں۔ ہمارا پتہ بغداد شریف میں حسب ذیل ہوگا:۔

''معرفت پیر سید سالم گیلانی صاحب، کلیدار حضرت غوث الاعظم جیلانی، محلہ باب الشیخ، بغداد شریف''

میں نے شفیع صاحب منٹگمری والے کو خط لکھ دیا ہے۔ پس وہ مبلغ پانچ صد روپیہ آپ کے حوالے کر دے گا۔ اگر مقصود آوے تو اس سے آپ مبلغ ایک سو روپیہ اپنے خرچ کے لئے رکھ لیں اور خرچ اندازے سے کریں۔ سب سے پہلے ٹیلیفون، بجلی کا بل ادا کریں۔ یہ لکھیں کہ منشی صاحب اور اللہ دتہ صاحب دفتر آتے ہیں یا کہ نہیں۔ اور انہوں نے مقدمات کے متعلق کیا کاوش کی ہے۔ مجھے پچھلے کام کے متعلق بہت تشویش ہے۔ اگر ہو سکے تو منشی جی سے کہیں کہ وہ اللہ دتہ سے کہہ کر میرے تمام مقدمات کی التوا کی درخواست پر غلام عباس صاحب جعفری ایڈووکیٹ سے دستخط کرا کر چھٹیوں کے بعد پر ملتوی کرالیں کیونکہ ہمیں یہاں کافی عرصہ لگے گا۔

برخوردار محمد نسیم کو ہر وقت دفتر میں حاضر رہنا چاہیے تاکہ لوگ یہاں سے مایوس نہ ہو کر جاویں۔ سپریم کورٹ نے 3 جون کو بند ہونا تھا۔ اس کے متعلق لکھیں کہ بریگیڈئیر صاحب کا مقدمہ لگ تو نہیں گیا تھا۔ فاطمہ بی بی کے نتیجہ سے آگاہ کریں۔ والدہ صاحبہ کو آرام سے رکھیں۔ اور اگر گھر میں دعوات کے بعد بیوی سے کہیں کہ وہ ہر ایک سے پورے سلوک کے ساتھ رہیں اور خرچ گزارے کا کریں۔ اُمید ہے کہ محمد شفیع صاحب اور بریگیڈئیر صاحب آپ کو کچھ بھیج سکیں۔ میں نے بریگیڈئیر صاحب کی بجائے محمد شفیع کو منٹگمری میں خط لکھ دیا ہے۔ آج شام چھ بجے ہم بغداد شریف روانہ ہو رہے ہیں۔ اب تک دس بارہ دن جہاز ہی میں رہے ہیں۔

والسلام

مولا بخش خضر

خط بنام نذر محمد خان ایڈووکیٹ جھنگ (6)

لاہور
29اکتوبر1969ء

برادرم محترم خان نذر محمد خان صاحب سلامت باشد!
السلام علیکم۔ مزاج شریف۔ احوال اینکہ۔ آئندہ سنیچر وار مورخہ یکم نومبر 1969ء کو میں برادرم راجہ محمد انور صاحب ایڈووکیٹ سپریم کورٹ و ہائی کورٹ کے ہمراہ جھنگ صدر پہنچ جاؤں گا۔ یہ دورہ مغربی پاکستان بار کونسل کے آئندہ انتخابات کے سلسلے میں راجہ صاحب ممدوح کے حق میں ہے۔ جو حالیہ انتخاب میں امیدوار ہیں۔
ہمیں اُمید ہے کہ آپ صاحبوں کا تعاون حاصل رہے گا۔

والسلام
آپ کا بھائی مولا بخش خضر تمیمی

خط بنام نذر محمد خان ایڈووکیٹ جھنگ (7)

4 مزنگ روڈ لاہور
13 نومبر 1969ء

برادرم محترم خان نذر محمد خان سلامت باشد!

السلام علیکم۔ مزاج شریف۔ ابھی تک آپ کی نگرانیوں میں کوئی تاریخ نہیں پڑی۔ آپ کو مبارک ہو۔

ڈپٹی کمشنر صاحب جھنگ کی سفارش مورخہ 19-07-1969 کہ انہیں سابقہ D.C کے احکام کے Review کی اجازت بخشی جاوے۔ کمشنر صاحب نے کل مورخہ 13-11-1969 کو منظوری فرمائی ہے۔ اب کوشش ضرور کریں کہ کوئی مقامی مخالف دخل اندازی نہ کرے۔ میں نے غلام شبیر صاحب کو بھی لکھ دیا ہے۔

والسلام
آپ کا بھائی خضر تمیمی

خط بنام منظور نسیم تمیمی (8)

لاہور

9 نومبر 1970ء

برخوردار منظور نسیم سلامت باشد!

آپ کا جو خط گھر میں آیا ہے۔ میں نے ابھی اسے پڑھا ہے۔ میں نے کوئی ایک ہفتہ ہوا منٹگمری خط لکھا تھا کہ عبدالغفور نے بیوی سے کہا تھا کہ وہ عزیزہ عنبرین خضر اور اس کی والدہ کو لاہور چھوڑ جاوے گا۔ ہمیں انکار و نکار نہیں۔ اور عزیزہ شمیم بھی ان کے ہمراہ آ کر مل جاوے۔ چنانچہ پرسوں شام کو عزیزہ خدیجہ بی بی اور شمیم بی بی یہاں پہنچ گئی ہیں اور سب بخیریت ہیں۔

میری ابھی شیخ صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کسی وقت ٹیلیفون کروں گا۔ ڈاکٹر دین محمد صاحب کے دفتر سے اشیاء سپرداری پر واپس ملیں یا نہیں۔ عید کو اب بیس دن رہ گئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ عید موقع پر ضرور آئیں گے۔ اگر عید کے ساتھ ایک آدھ چھٹی بھی ملا لیں تو بہتر ہے۔

مجھے لکھیں کہ یکم نومبر کو انہوں نے کس حساب سے ادائیگی کی ہے۔ عزیزہ فاطمہ اور منظور نے امیر روڈ والا مکان تبدیل کر لیا ہے۔ اور صغریٰ ہمسائی والا مکان جو بھاٹی دروازہ میں ہے۔ اس کا اوپر کا حصہ -/70 روپے ماہوار پر لیا ہے۔ گڈی غریب کو ٹائیفائیڈ بخار آ رہا ہے۔ اور وہ بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ چھوٹی حمیرہ اب تیز ہو گئی ہے اور چھوٹی کاکی کو بہت گلونڈیاں ڈالتی ہے اور پیار کرتی ہے۔ بیوی کا گلا خراب ہے۔ کیونکہ ہم نئے گھی کے تجربے کر رہے ہیں۔ بے بی پٹھانی، نعیم صاحب اور بخت بخیریت ہیں (9) بخت کو میں خود پڑھا رہا ہوں۔ اس نے داخلہ بھیج دیا ہے اور امتحان دسمبر میں ہوگا۔ اللہ پاک کامیاب کرے۔

والسلام
خضر تمیمی

جائزہ

کلام کا موضوعاتی جائزہ

خضر تمیمی کی سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ اکثر مسلمان شعرا نے حمد کا خصوصاً التزام کیا ہے۔ خضر تمیمی نے بھی اس مذہبی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے حمد لکھی جس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کا اقرار اور عجز و تشکر کا اظہار کیا ہے۔ خضر تمیمی کا اس نظریہ پر کامل ایمان ہے کہ رب کائنات وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کی قوتیں لامحدود اور رحمتیں لامتناہی ہیں۔ وہ اس بات پر بھی غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں کہ کارِ تخلیق اور تدبیر و تنظیم کائنات میں اس ذات پاک کا کوئی شریک نہیں۔ اس عقیدہ کا اظہار اور عنایات ربانی کا اقرار ایمانی جذبے کے ساتھ یوں کرتے ہیں:۔

تیری تعریف ہے بیروں حدودِ سعیِ امکاں ہے
ہماری سرحد ادراک کی بس انتہا تو ہے
بصارت لطف سے تیرے ہے قائم اپنی آنکھوں میں
مرے ٹوٹے ہوئے دل میں بصیرت کی ضیا تو ہے

خضر تمیمی عشق مصطفےٰ ﷺ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جب وہ حضور پاک ﷺ سے اپنی عقیدت اور نسبت کا اظہار کرتے ہیں تو 'با خدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار' کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی نعت میں جذبہ عشق، پر کیف ترنم اور موزوں الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ وہ نعت پاک لکھتے وقت اپنی بساط کے مطابق مقام اور عظمت کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی علم ہے کہ خدا تعالیٰ کے عطا کردہ خزانوں میں آپ ﷺ کو تصرف کا اختیار ہے۔ آپ ﷺ نہ صرف باعث تخلیق کائنات ہیں بلکہ روح کائنات اور مقصود کائنات بھی ہیں۔ اسی لئے کائنات کی تمام تر رنگینیاں آپ ﷺ ہی کی وجہ سے ہیں۔ نعت کا ایک بند دیکھیے۔

لطف نگاہِ پاک سے ہیں کھیتیاں سب کی ہری
زیرنگیں ہیں آپؐ کے، مخلوقِ خشکی و تری
جن و ملائک اور بشر ہر دم کریں فرمانبری
"تو از تری چابک تری و زبرگ گل نازک تری
از ہرچہ گویم بہتری حقا عجائب دلبری"

اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرنے کے لئے انہیں امیر خسرو کے اشعار بہت پسند آئے۔اس نعت میں امیر خسرو کے چار اشعار بطور تضمین شامل کر کے اپنی عقیدت کا اعلان اور ان سے والہانہ لگن کا اقرار کیا ہے۔وہ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں اپنی التجا پیش کرتے ہیں کہ انہیں در اقدس کی حاضری نصیب ہوتا کہ سکون قلب کی دولت سے مالا مال ہوں۔خضر تیمی نے اس درخواست کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے ایک عزیز دوست کے دکھ غم اور بیماری کے معاملات بھی دربار اقدس میں پیش کر کے کرم طلب کیا ہے۔ان کا پختہ ایمان ہے کہ ان کی چوکھٹ سے کوئی بھی سوالی کبھی خالی نہیں جاتا۔آپ ﷺ ہر سائل کی جھولی اپنے کرم کی دولت سے بھر دیتے ہیں۔یہ ٹھیک ہے کہ دوا ہر بیمار کی ضرورت ہوتی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر دعا کی تاثیر بھی بہت اہم ہے۔اس کے اثرات دل وجاں کی راحت کا سبب بنتے ہیں۔اس لئے اپنے دوست کی صحت یابی کے لئے بارگاہ ناز ﷺ میں دست بدعا ہو کر فریاد کرتے ہیں۔

ہیں خضر کی یہ تہہ دل سے دعا ہائے صمیم　　ہوں خلیق خوش بیاں پر حق کے الطاف عمیم

خضر تیمی جانتے ہیں کہ خدا کی عطا کا ذریعہ آپ ﷺ ہی کی ذات بابرکات ہے۔آپ ﷺ کے توسل سے جو کچھ مانگا جاتا ہے،عطا کیا جاتا ہے۔امت واحدہ کا تصور ہر سچے مسلمان کے دل کی آرزو اور آواز ہے۔خضر تیمی رنگ و نسل اور ملک وملت کی تمیز کو ختم کر کے صرف مسلمان بننے کی تلقین کرتے ہیں۔ظاہر اور باطن کو یک رنگ کرنے کی آرزو انہیں بے چین کرتی ہے تو اس بات کا دردمندانہ پیرائے میں اظہار کرتے ہیں۔انہیں اس بات کا علم ہے کہ قبیلے تو صرف پہچان کے لئے ہوتے ہیں۔صاحب تکریم بننے کے لئے متقی اور پارسا ہونا شرط ہے نہ کہ قومی اور لسانی برتری کا احساس ضروری ہوتا ہے۔اس لئے رسول کریم ﷺ کی غلامی حاصل کرنے پر زور دیتے ہوئے ایک پرچم تلے جمع ہونے کی تڑپ اپنے دل میں رکھتے ہیں جو مسلمان کی پہچان ہے۔

فخر دو عالم ' آقائے نامی　　شہنشہی ہے جن کی غلامی
ان کے کرم سے بھائی تمامی　　حبشی کہ ہندؤ رومی کہ شامی
ہیں ایک ملت' سب کی یہ پہچان
اول مسلمان ' آخر مسلمان

جسٹس دین محمد کی چنیوٹ میں آمد پر خضر تیمی نے احترام آدمیت کے آفاقی اصولوں اور مہمان کی عزت وتوقیر کے پیش نظر استقبالیہ نظم لکھی۔'خوش آمدید' کے عنوان سے لکھی گئی اس نظم

میں ذاتی اور منصبی اوصاف کے حوالے سے انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ آپ ان کی تشریف آوری پر دل کی گہرائیوں سے اظہار مسرت کرتے ہوئے اہل چنیوٹ کی نمائندگی کا حق ادا کیا ہے۔ اس نظم کے تمام اشعار میں استقبال اور احترام کا عجب سماں پایا جاتا ہے۔

بخت بیدار پہ چنیوٹ نہ کیوں اترائے　　خانہ نور میں جب آپ سلیماں آیا
ضامن عدل ہوئی ذات گرامی جس کی　　بن کے سرمایہ، آرام دل وجاں آیا
جلوہء دین محمد سے ہیں آنکھیں روشن　　للہ الحمد کہ وہ نازش دوراں آیا

سماج کا حصہ ہونے کے ناطے وہ سماجی حالات سے بخوبی واقف تھے۔ ملکی سیاسی حالات پر ان کی گہری نظر رہتی تھی۔ ایسا کوئی بھی واقعہ جو عوام میں شکوک وشبہات اور غیر یقینی صورت حال پیدا کرنے کا سبب بنتا' اس کا موثر اظہار کرتے۔ جن دنوں حکومت برطانیہ دوسری جنگ عظیم کا کھیل کھیل رہی تھی اس وقت لوگوں میں طرح طرح کے وسوسے پھیلائے جا رہے تھے۔ خضر تمیمی نے ان حالات وواقعات کو بھانپتے ہوئے لوگوں کو حکومت وقت سے بھرپور تعاون پر آمادہ کیا اور اپنی نظم کو 'اچھے شہری' کا عنوان دے کر ایسے کلمات ادا کئے جو حکمران دوستی کے آئینہ دار تھے۔

وہ مفروضہ خطروں سے ڈرتے نہیں　　اور افواہوں پہ کان دھرتے نہیں
انہیں خدمت ملک سے پیار ہے　　حفاظت انہیں اپنی درکار ہے

کہیں پیش کرتے ہیں وہ جان ومال　　وہ خطروں کو لیتے ہیں یونہی سنبھال
تسلی سے کرتے ہیں وہ کاروبار　　نہ ہو کام ان کو تو ہوں بے قرار

قیام پاکستان کے بعد پہلے مارشل لاء کے نتیجہ میں صدر محمد ایوب خان کا دور اقتدار آیا تو اس وقت پاک چین دوستی کو تقویت ملی۔ اس دوستی کا واضح ثبوت اس وقت عوام کے سامنے آیا جب پاک بھارت 1965ء کی جنگ ہوئی اور چین نے بھرپور امداد دی۔ اس موقع پر متعدد مسلمان ممالک نے پاکستان کا کھل کر ساتھ دیا۔ اس حق دوستی اور مسلم دوستی کے بارے میں بہت خوبصورت اشعار لکھے۔

آج ہے ایوب خاں تنظیم ملت کا نشاں　　ہو گیا ایک مسلم چین کا ایران کا
اس کے دم سے روس کے مسلم میں شوق اتحاد　　ترکی، عالی گہر بھی نور قلب و جان کا

گوملائی ایشیا ہے آنکھ کا تارا اسے　　لیکن انڈونیشیا ہے دوست عالی شان کا

خضر تمیمی نے اس نظم میں پاکستان کے محسنین کو والہانہ طریقے سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ انہیں علم تھا کہ اتحاد عالم اسلام سے کسی بھی طاغوتی طاقت کو برباد کیا جا سکتا ہے۔ اسی مثالی اتحاد کے نتیجہ میں ہی بھارتیوں کو منہ کی کھانا پڑی۔ خضر تمیمی صدر محمد ایوب خان کے کردار و عمل کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ 1965ء میں پاک بھارت جنگ کے دوران جو قومی اتحاد پیدا ہوگیا تھا اس کیفیت سے خضر تمیمی بہت خوش تھے کیونکہ پوری قوم کا جوش وولولہ دیدنی اور اتحاد مثالی تھا۔ قوم اور رہبر قوم دونوں ان کی نظر میں بلند ہو چکے تھے۔ انہوں نے صدر محمد ایوب خان کے بارے میں کہا:۔

ہر دم ہے اس کو فکر' سلامت رہے وطن　　ملت کو اک کڑی میں پرونے کا غم بھی ہے
ایوب خان ہے ملت بیضا کی آبرو　　آج اس کے دم سے دہر میں اپنا بھرم بھی ہے

خضر تمیمی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ ان کی باریک بین نظر ہر پہلو کی تہہ تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کی طبیعت میں احترام انسانیت اور خوش دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن ظریفانہ لہجہ بھی اپنی بہار دکھاتا تھا۔ کسی کی تعریف وتوصیف میں بخیلی کے قائل نہ تھے بلکہ فیاضی سے کام لیتے تھے۔ ایک طالبہ کو انہوں نے الوداعی تقریب میں پڑھنے کے لئے نظم لکھ کر دی تو ان تمام اساتذہ کا بڑا جامع تعارف کرایا۔ ہر خاتون ٹیچر کے مزاج اور اہلیت کو سامنے رکھا اور اس نظم میں ایک طرح مصوری کی کیفیت پیدا کر دی جس میں اپنائیت اور وابستگی نکھر کر سامنے آگئی ہے۔ شائستگی اور مزاحیہ اسلوب نے اس نظم کی اثریت میں اضافہ کر دیا۔

یہاں ہیڈ مسٹریس' جو مس امیں ہیں　　سراپا علم و شفقت' خوش جبیں ہیں
ہے مس چیمہ کو اسپیلنگ کا احساس　　یہ فرماتی ہیں رکھو ڈکشنری پاس

ہے مضموں ہوم اکنامکس اچھا　　ہے مس رفعت کو اس پر ناز سچا

ہے مس قیوم کی انگریزی باندی　　کوئی کیوں کر کہے' مینوں نئیں آندی'
ہے مس بھٹی کا بھی اخلاق اعلیٰ　　ادھر مس چودھری ہیں سرو بالا

خضر تمیمی کو سراپا نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔ موقع کی مناسبت سے اساتذہ کو خراج

تحسین پیش کر کے انہیں خود بھی طمانیت کا احساس ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں دو گونہ مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ان کی ایک نظم 'امداد باہمی' کے عنوان سے بھی ہے جس میں وہ امداد باہمی کے فوائد گنواتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ امداد باہمی سے سماجی رابطے بڑھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے قریب آنے کے مواقع ملتے ہیں۔ عوام کو قوت اور حوصلہ ملتا ہے۔ امداد باہمی کو خوشحالی کا راج، جاں فزارواج' عزم و عمل کا تاج اور حسین عمل کا باج قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تعاون کے عمل سے بے شمار مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ لوگوں میں محبت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ کھیت اور کھلیان خوبصورت نظر آنے لگتے ہیں۔ اس نظم میں انہوں نے فرد اور معاشرہ کے مضبوط رشتے کی اہمیت پر زور دے کر ثابت کیا ہے کہ اس کی وجہ سے کئی برکتیں نصیب ہوتی ہیں۔

ہر درد کا علاج ہے، امداد باہمی   خوشحالیوں کا راج ہے، امداد باہمی
اہل وطن نے پائی ہے جس سے حیاتِ نو   وہ جاں فزا رواج ہے، امداد باہمی
جنگل بھی اس کے فیض سے آخر ہرے ہوئے   عزم و عمل کا تاج ہے، امداد باہمی

یہ نظم اس دور کا تحفہ ہے جب خضر تمیمی محکمہ پنچایت میں ملازم تھے اور انہیں دور نزدیک کے قصبوں' دیہاتوں اور چکوک میں جانے کا موقع ملتا تھا۔ امداد باہمی کا پیغام لے کر ان علاقوں میں گئے تو لوگوں نے ان کی خوب پذیرائی کی۔ لارڈ بیڈن پال نے خدمت خلق کے لئے ایک تحریک شروع کی جس کو بوائے سکاؤٹ اور گرل گائیڈ کے خانوں میں تقسیم کیا۔ جنگ و امن میں اس تحریک نے گرانقدر خدمات انجام دیں اور یہ سلسلہ تقریباً تمام ممالک میں اب بھی جاری ہے۔ وہ اپنے ملک میں خدمت انسانی کے لئے بوائے سکاؤٹ اور گرل گائیڈ کی فعال حیثیت کے خواہش مند تھے۔ اس تحریک کے کردار کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ احترام انسانیت اور خدمت خلق ہی اس تحریک کا شیوہ ہے جو صلہ و ستائش سے بے نیاز ہے۔ اس لئے سکاؤٹ ان خدمات کی بجا آوری کے لئے اپنی آن پر وعدہ کرتا ہے اور کسی بھی مشکل وقت میں نہیں گھبراتا۔ خضر تمیمی نے خدمت خلق کے اس جذبے کو' سکاؤٹ کا ترانہ' کے عنوان سے نظم بند کیا ہے:

تمیز مذہب و ملت سے بالا   سکاؤٹ کا سدا اخلاق اعلیٰ
کسی بھی ملک کے ہوں، یار ہیں سب   مدد پر باہمی تیار ہیں سب
بھروسا اپنے لیڈر پر ہے ہر دم   کریں تعمیل اس کی مل کے باہم
سکاؤٹ ہوں مرا ایماں وفا ہے   میرا ہر بات میں ضامن خدا ہے

اردو ادب میں سہرا نگاری کو باقاعدہ صنف کا درجہ تو کبھی نہیں ملا تاہم کچھ شعرا نے اپنے عزیزوں اور قرابت داروں کے سہرے لکھے ہیں۔ سہرا نگاری کے تاریخی ارتقا پر سنجیدگی سے کبھی نہیں لکھا گیا مگر اس کے بکھرے بکھرے نمونے بیشتر شعرا کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ مرزا غالب کے دیوان میں بھی ایک سہرا موجود ہے۔ غالب خیال یہ ہے کہ قصیدہ نگاری کے ساتھ ساتھ یہ موضوع بھی قلم بند ہوتا رہا ہے۔ دراصل قصیدہ اور سہرا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ قصیدہ میں تعریف وتوصیف کسی منفعت کی متقاضی ہوتی ہے جب کہ سہرا صرف محبت اور قرابت کے اظہار کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس صنف میں بالعموم 'سہرا' کا لفظ ردیف ہوتا ہے۔ خضر تمیمی نے تین سہرے لکھے جن میں فریفتگی کا اظہار کیا گیا ہے جو دل کے تاروں کو چھیڑ کر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے سہروں میں روایتی طرز کے مطابق والدین، بہن بھائیوں اور قریبی عزیزوں کی دلی کیفیات کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خوشگوار اور کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے دعا بھی کی گئی ہے۔ مدن لعل کپور کے سہرا کے چند اشعار سے ان کی باطنی خوشی کا اظہار دیکھئے:۔

نہیں گلدستہء نسرین و سمن کا سہرا ؛ تیرے رخسار پہ ہے سارے چمن کا سہرا
رنگ و خوبی سے رخ لال کو شرماتا ہے ؛ اور خوشبو سے ہے یکسر یہ ختن کا سہرا
آب دینے کو اسے موج چناب آئی ہے ؛ خلد چنیوٹ سے آیا ہے سخن کا سہرا

آج جگدیش جو قرباں ہے تو بلونت فدا ؛ ماتا بہنوں کی دعائیں ہیں مدن کا سہرا

جو خوشی چرخ کی وہ خضر خوشی اپنی ہے ؛ کیوں نہ ہم جھوم کے پھر گائیں مدن کا سہرا

خضر تمیمی نے اپنے دوست کے بیٹے کے لئے بھی سہرا لکھا جس میں افراد خانہ کو بھی اس خوشی میں شریک کیا۔ خاندان کے افراد کی دانش وحکمت اور سماجی حیثیت کو اجاگر کیا۔ سہرا نگاری میں سماجی حیثیت کا تذکرہ خضر تمیمی کے ہاں نظر آتا ہے۔

رفیع صاحب کو ہو مبارک ، یہ بزم رفعت نشان شادی
بندھا ہے اب امتیاز کے سر، کلاہ عزت نشان شادی

یہ مظہر و امتیاز و پرویز ، اہل قانون و باخبر ہیں
خدا کے فضل وکرم سے اپنے بڑوں کی مانند باہنر ہیں

اگرچہ مدت ہوئی ہمارے سخن کی منقار زیر پر ہے
مگر یہ تقریب ہی کچھ ایسی تھی جس سے نغمہ سرا خضر ہے

ایک اور سہرا میں اپنے دیرینہ دوست چرخ چنیوٹی کے بیٹے ستیش کمار کے لئے اپنے جذبات واحساسات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ساری گزری محبتیں لوٹ آتی ہیں۔

آج احباب کی ہیں بزم میں روشن آنکھیں ۔۔۔ شانتی اور ستیش ہو گئے دلہا دلہن
پندرہ سال ہوئے جب میں ہوا زمزمہ سنج ۔۔۔ جا کے دہلی میں سر محفل شادی مدن
ترے اس سہرے کو اللہ سلامت رکھے ۔۔۔ تا قیامت رہے ان پھولوں کی ماتھے پہ پھبن

والدین کے دل میں اولاد کی خوشیاں کتنی تبدیلیاں لاتی ہیں اور اس طرح انہیں مسرت کشید کرنے کے جو مواقع میسر آتے ہیں، ان کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ والدین اپنی اولاد کے مستقبل کے بارے میں کیا کیا خواب بنتے ہیں۔ اس جذباتیت کا اظہار خضر تمیمی نے دعائیہ طریقے سے کیا ہے۔ اپنے بڑے بیٹے منظور نسیم تمیمی کی شادی کی تقریب میں سہرا تو نہ پڑھا۔ صرف دو اشعار ہی لکھ سکے۔ جنہیں دعوت نامہ میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر بعد میں چھپائی کے وقت دعوتی کارڈ سے یہ اشعار نکال دیئے:

باندھا فرزند جگر بند کے سر پر سہرا ۔۔۔ یہ معطر ، یہ معنبر ، یہ منور سہرا
ہے میرے دل کی تمناؤں کا پیکر سہرا ۔۔۔ باطنی میری دعاؤں کا ہے مظہر سہرا

اپنے چھوٹے بیٹے ساجد نعیم تمیمی کی فرمائش پر فرخ عزیز اثری کی دوسری سالگرہ کے لئے ایک بے حد خوبصورت نظم لکھی جس میں اپنے ظریفانہ انداز کو اپناتے ہوئے دعائیہ بنا دیا۔

باغ عزیز اثری پھولے پھلے ہمیشہ ۔۔۔ یہ نونہال جس کی زینت بڑھا رہا ہے
ہے آج یہ اکیلا، کل اس کے ساتھ ہوں گے ۔۔۔ بھائی بہن ، جنہیں یہ آکر بلا رہا ہے

خضر تمیمی کا چنیوٹ سے رشتہ کبھی نہ ٹوٹا، مجلسی زندگی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے بغیر ان کی زندگی بے رونق تھی۔ انہوں نے اپنے قدیم دوستوں کی رحلت پر غمناکی اور جذباتی کیفیت کا اظہار غمناک آنکھوں سے کیا۔ ان کی یہ نظمیں مرثیہ کے فنی لوازم پورا نہیں کرتیں۔ اس لئے انہیں تعزیتی نظمیں کہنا ہی درست ہے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست سلطان محمود کی وفات پر تعزیت کو توصیف کے انداز میں بیان کیا۔ ایک اور دوست میاں سر فضل حسین جو کہ پنجاب کی ایک معروف سیاسی شخصیت بھی تھے۔ ان کی وفات پر جذبات سے لبریز الفاظ ادا کئے:

اللہ اس کی روح کو دے جنت النعیم　　اس کی مشام جاں میں بسے خلد کی شمیم
انصاری و شفیع کا تازہ ابھی تھا غم　　فضل حسین آہ! تیری موت ہے ستم

ساجد نعیم تمیمی کے ایک قریبی دوست فرخ محمود کی شہادت پر تعزیتی نظم لکھی جس کو انہوں نے ساجد نعیم سے منسوب کر دیا۔ اس میں بھی بہت خوب صورت انداز اپنایا گیا ہے۔ اس تعزیتی نظم میں تعریف اور توصیف کی گئی ہے۔ جس سے قربت کا ایک پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اس نظم کے چند مختلف اشعار ملاحظہ ہوں۔

شہیدوں کے مقدر میں، حیات جاودانی ہے　　وگرنہ زندگانی یوں تو آنی اور جانی ہے
وہ ذات فرخ محمود اسم بامسمیٰ تھی　　کہ میدان وفا میں سرفروشی کی تمنا تھی
دسمبر آٹھ پیدائش کا دن، یوم شہادت بھی　　اسی پر ابتدا اس کی، یہی یوم شہادت بھی

خضر تمیمی ایک مزاحیہ شاعر کے ساتھ ساتھ معروف وکیل بھی تھے۔ ظاہر ہے ایک وکیل دلائل اور توجیہات کے موثر اور برمحل استعمال سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اس بات کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سوچ اور فکر میں سائینٹیفک تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ خضر تمیمی مغرب اور مشرق کی فکری اور تہذیبی آویزش سے مرعوب نہیں تھے لیکن اس سے متاثر ضرور تھے۔ اس کشمکش کو انہوں نے اپنے مناظروں میں جاندار طریقے سے پیش کیا ہے۔ ان سے قبل موازنہ کی بنیاد پر فنکاروں کی تخلیقات کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا رہا ہے۔ موازنہ دراصل مشترک بنیاد رکھنے والی دو چیزوں کے تقابلی مطالعہ کا نام ہے۔ اصولاً موازنہ میں ترجیح ثابت کرنا مقصد نہیں ہوتا کیونکہ ہر ادب پارے کو پرکھنے کے اصول اس ادب پارے کے اندر سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ اور ایک ادب پارے سے اخذ کردہ اصولوں کا اطلاق دوسرے ادب پارے پر نہیں ہوسکتا۔ بعض اوقات نقاد موازنہ کر کے ترجیح ثابت کرتے ہیں 'موازنہ انیس و دبیر' میں مولانا شبلی کا یہی مقصد تھا۔ سید نظیر الحسن رضوی نے مولانا شبلی کے اس موازنہ کے جواب میں 'المیزان' لکھا۔ انہوں نے مولانا شبلی نعمانی کے برعکس مرزا دبیر کو میر انیس پر فوقیت دی۔

اسی عرصہ میں 1857ء کی ناکام جنگ آزادی نے غیر یقینی صورت حال کو جنم دیا۔ بالخصوص مسلمانوں کا عرصہء حیات تنگ کیا گیا۔ اس عرصہ میں اودھ پنچ کے لکھاریوں نے مزاحیہ شاعری کے ذریعے ہنگامی نوعیت کے مسائل اور بے عملیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے ہر اس فرد اور موضوع پر لکھا جو مسلم تہذیب وثقافت کو برباد کر رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں بیشتر شعرا نے

اپنے موضوعات بدل لئے۔ 1874ء میں محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں مشاعروں میں مصرع طرح کی بجائے موضوعاتی مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔ مولانا حالی اس کے روح رواں رہے۔ انہوں نے مغربی ادب سے استفادہ کرتے ہوئے مشرقی ادب کے رخ کو بدل دیا۔ نظم کو نئے خیالات سے متعارف کرایا۔ مناظروں میں اصلاحی پہلو، طاقت لسانی کا اظہار، لطیف طنز اور سنجیدہ ظرافت سے مشرقی و مغربی تہذیب کا تجزیہ کیا۔ انہوں نے نئے فکر و خیال کے ذریعے تہذیب مغرب کے دلدادگان کی خود ساختہ فوقیت اور احساس برتری کے طلسم کو توڑ دیا۔ محمد حسین آزاد نے سماجی موضوعات پر اپنا قلم اٹھایا اور مناظرہ نگاری کا آغاز کیا۔ 1874ء میں مناظرہ رحم و انصاف، 1882ء میں مثنوی تعصب و انصاف، 1883ء میں مناظرہ واعظ و شاعر، 1887ء میں پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ، 1887ء میں دولت اور وقت کا مناظرہ اور پھر کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان لکھے۔ راجہ مہدی علی خان نے چور اور خدا لکھ کر معاشرتی رسوم پر گہرے طنز سے مناظروں کے موضوعات کو وسعت دی جبکہ خوشی محمد ناظر نے جوگی اور ناظر لکھ کر اس روایت کو اور زیادہ توانا کیا۔

علامہ اقبال اور نظیر اکبرآبادی کے ہاں مناظروں کی بجائے مکالماتی نظمیں ملتی ہیں۔ مناظرہ اور مکالمہ میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔ مکالمہ دو افراد کے درمیان گفتگو کا نام ہے اور یہ اپنی بات کو آپس ہی میں طے کرتے ہیں جبکہ مناظرہ میں دو گروہوں کے دلائل سن کر تیسرا فرد فیصلہ صادر کرتا ہے۔ مکالمہ نگاری میں مجرد تصورات و اوصاف کی تجسیم کر کے علامتی اور تمثیلی انداز اپنا کر موقف پیش کیا جاتا ہے جب کہ مناظرہ میں مشخص کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح انٹرویو میں سوال کرنے والا فریق مخاطب سے صرف بات کی وضاحت طلب کرتا ہے وہ خود شریک گفتگو نہیں ہوتا۔ مکالمہ میں سوال کرنے والا جب چاہے خود بھی گفتگو کا ایک کردار بن سکتا ہے۔ اس طرح دونوں کی شخصیتوں میں انعکاس کی ایک ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ مکالمہ ہم کلامی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خضر تیمی نے اپنے مناظروں میں فریقین کو اپنا موقف بیان کرنے کا پورا پورا موقع دیا ہے پھر انصاف کی کرسی پر براجمان ہو کر وزنی استدلال کی بنا پر فیصلہ دیا ہے۔ انصاف کے اس تناظر میں مضبوط دلائل اور فطری قوانین ان کے پیش نظر رہے ہیں۔ نقش باطل کو مٹانے کا رویہ اکبرالہ آبادی اور علامہ اقبال میں بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ اکبرالہ آبادی اس یلغار کی روک تھام کرتے ہوئے مشتعل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ علامہ اقبال فلسفیانہ گتھیاں سلجھانے لگ جاتے ہیں مگر خضر تیمی اس

مقام پر مزاح سے کام لیتے ہوئے موقع پر فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ اسے کسی اور وقت کے لئے اٹھا نہیں رکھتے۔ اکبرالہ آبادی اور خضر تمیمی میں مماثلت کی ایک وجہ انگریزی زبان کا استعمال ہے۔ یہ دونوں مغربی تہذیب کے اثرات سے بدکتے ہیں۔ خضر تمیمی کی عدالت میں فریقین موقف کو مضبوط بنانے کے لیے ضرب الامثال اور تضمین کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ یہاں وہ مباحثہ کا انداز اپنا لیتے ہیں مگر خضر تمیمی انہیں پٹڑی سے اترنے نہیں دیتے۔ خضر تمیمی نے خوبصورت طرز بیان اور اسلوب سے کام لے کر مناظروں کی تاثیر اور معنویت کو ابھارا ہے۔ ان مناظروں میں خضر تمیمی نے علامہ اقبال کے 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' کے طرز کو بھی کہیں کہیں اپنایا ہے۔ خضر تمیمی نے ان مناظروں میں ظرافت کا لبادہ اوڑھ کر بہت کام کی باتیں کی ہیں۔ 'موٹر اور بیل گاڑی کا مناظرہ' میں اس طرح نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

وہ بھولا بھالا دیہاتی، وہ زینت دشت وصحرا کی
پھٹکتی بھی نہیں بھولے سے جس کے پاس غمنا کی

لیا موٹا سا رسا اور موٹر سے اُسے باندھا
کیا گاڑی سے پھر پیوست اور بیلوں کو دے ہانکا

پھر اس ماں کی طرح لے آئی گاڑی کھینچ موٹر کو
پکڑ کر چوٹی سے لائے جو نافرمان دختر کو

خضر تمیمی نے 'حقے اور سگریٹ کا مناظرہ' میں اپنا فیصلہ اس طرح دیا ہے۔

چلا آتا ہوں نسلاً بعد نسلاً — تمہاری زندگی ہے بلکہ اک دن
جو دیکھا میں نے سگرٹ بجھ گیا تھا — زمیں پہ راکھ سا نیچے پڑا تھا
مگر ویسے ہی حقہ گڑگڑاتا — دعائے فاتحہ ، واں پڑھ رہا تھا

'چائے اور لسی کا مناظرہ' میں خالصتاً مقامی اور دیہی الفاظ و خیالات استعمال کر کے دلائل کی بنیاد پر لسی کی برتری واضح کی ہے۔ مشرقی مزاج، دیہی زندگی اور طرز معاشرت کے بارے میں خضر تمیمی کا مطالعہ اور مشاہدہ خاصا گہرا نظر آتا ہے۔ اس لئے جزئیات کو بیان کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کی۔ احسان دانش نے دیہات کے تمدن اور تہذیبی اقدار کو بڑے دلکش اور دیرپا انداز میں بیان کیا تھا۔ خضر تمیمی نے اس روایت کو مہارت کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ اس مناظرے کا جھگڑا ان الفاظ میں مناتے ہیں:

چائے ابھی تھی گرم ابھی ہو گئی ہے سرد رکھتے نہیں ہیں رنگ کبھی وہ جوان مرد
آخر وہی پہنچتے ہیں اوج کمال پر جو مستقل مزاج رہیں، ایک حال پر

'میم اور بیگم کا مناظرہ' ان کے عمدہ مناظروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں خضر تمیمی عورت کو شمع محفل بننے سے روکتے ہیں اور خاتون خانہ کی حیثیت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ خاتون کے سر پر حیا کی چادر دیکھنا چاہتے ہیں اور میم کے مادر پدر آزاد معاشرہ سے نفرت کرتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی بھی انہیں فطری اور حیادار لباس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس خلاف فطرف تہذیب پر سخت لب ولہجہ اپنایا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اس تہذیب کے اثرات سے بچنے کے لئے زن کو نازن بننے سے روکا ہے اور مولانا ظفر علی خان تو تہذیب نو کے منہ پر تھپڑ رسید کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ خضر تمیمی غصیلے الفاظ استعمال کرنے کی بجائے دلائل کا سہارا لیتے ہیں تا کہ بات کو منطقی طریقے سے ذہن نشیں کرا سکیں۔ وہ شدت کے قائل نہیں بلکہ دھیما لہجہ اختیار کرتے ہوئے اخلاقیات کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اس مناظرہ میں فریقین کو پورا موقع دیتے ہوئے منصفی کے تقاضے پورا کرتے ہیں اور اس کا ایک فیصلہ مندرجہ ذیل ذیل اشعار میں دیکھئے۔

ان کو برقعے نے بچایا جو چلی سرد ہوا ایسی سردی میں بدن میم کا لیکن ٹھٹھرا
جھوٹ سچ جانے، ازل سے ہے جو علام خبیر ہم کو ہر بات میں بیگم کی ملی خیر کثیر

'ہیٹ اور پگڑی کا مناظرہ' بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس میں بھی خضر تمیمی نے ذہن کی خلاقی کو عمدگی سے برتا ہے۔ خضر تمیمی کی تخلیق ایک نظریے کے گرد گھومتی ہے۔ وہ ہے مشرقیت سے پیار اور اس کا پرچار۔ عصری تقاضے کچھ بھی ہوں لیکن اپنے خمیر کی بُو باس ہی پیاری لگتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار ان کا جزو ایمان ہے۔ نقطہ نظر اور عصری تقاضوں کے بارے میں ان کا موقف بالکل صحیح ہے۔ ان مناظروں میں خضر تمیمی صرف دو تہذیبوں کے تصادم میں اُلجھ کر نہیں رہ گئے بلکہ ان کا نظریاتی اور تنقیدی شعور بھی عیاں ہوا ہے۔ وہ اشیاء کی ماہیت کو بھی پرکھنا جانتے ہیں۔ پہلوؤں کا ادراک حاصل کرنے کے بعد طنز کی لطافت اور مزاح کی گہرائی سے صرف نظر نہیں کرتے۔ 'ہیٹ اور پگڑی کے مناظرہ' میں بھی انہوں نے متوازن پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس مناظرہ کا فیصلہ بھی متوقع الفاظ میں کیا گیا ہے مگر اس میں جانب داری دکھائی نہیں دیتی بلکہ مضبوط دلائل اور حقائق کی بنیاد پر فیصلہ سامنے آتا ہے۔

اس جنگ میں بی بیٹ تو یکسر گئی رگڑی اور فتح کے سہرے سے سرافراز تھی پگڑی

'سارنگی اور طبلہ' میں بھی انہوں نے کمال درجے کی منظر اور مناظرہ نگاری کی ہے۔ یہاں ان کے اسلوب میں روانی کے علاوہ فن موسیقی کے اسرار و رموز پر مضبوط گرفت نظر آتی ہے۔ لئے اور تھاپ کا امتزاج شعر کی قرات اور تفہیم میں دلکشی پیدا کرتا ہے۔ اس مناظرہ میں بھی انہوں نے اپنی مٹی کی بُو باس کو دلائل کی بنیاد پر سبقت دی ہے۔ وہ درزبان نسواں گفتگو میں خوب ملکہ رکھتے ہیں۔ شاعر دیوانہ دونوں کے بیچ بیٹھ کر دلائل سنتا ہے:

سارنگی بولی طبلے سے تم یونہی شور مچاتے ہو
اے منہ پھٹ طبلے دیوانے کیوں کان ہمارے کھاتے ہو

آواز تمہاری کوّے سی اور شکل چھلاوے سی تیری
ان میٹھی میٹھی تانوں کے، تم رنگ میں بھنگ ملاتے ہو

یوں کہنے لگا سارنگی سے جلتی پر تیل گراتی ہو
ہم رنج و الم کے مارے ہیں تم آکر اور ستاتی ہو

عشاق سے منہ پھیرا کیوں پھر تو نے ہمیں آگھیرا کیوں
رہنے دو تجھے چپ مجبوراً کیوں میری زباں کھلواتی ہو

خضر تمیمی نے ان تمام مناظروں میں علامتی انداز اختیار کر کے مشرقیت اور مغربیت کے فرق کو واضح کیا ہے اور ٹھوس دلائل کی بنیاد پر مشرقی تہذیب و تمدن کی برتری ثابت کی ہے جو مشرق سے ان کی اپنی فطری محبت کی دلیل بھی بن جاتی ہے۔ ان مناظروں میں خضر تمیمی کا ظریفانہ اسلوب واضح طور پر نظر آتا ہے۔ انہوں نے جس باریک بینی سے ان مناظروں میں حقائق پیش کئے ہیں وہ خضر تمیمی جیسے زیرک شاعر ہی کا کام ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنا وہ فریضہ بھی دیانت داری سے انجام دیا ہے جو ایک حساس فرد کو ادا کرنا چاہیے کیونکہ گندی تہذیب پھیل جانے سے معاشرہ میں غلاظت اور تعفن پھیل جاتا ہے جس سے دم گھٹنے لگتا ہے پھر یہ شعرا و ادبا کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ آگے بڑھ کر ان اثرات کو پھیلنے سے روکیں۔ خضر تمیمی کے ہاں مزاح نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ان کی فکاہیہ نظمیں بھی دامن دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ دوسروں پر ہنسنا اور ان کا تمسخر اڑانا بہت آسان کام ہے مگر اپنا مذاق اڑانا اور ہی زیادہ مشکل کام ہے۔ خضر تمیمی اس

میدان میں بھی بازی لے گئے ہیں۔ 'وکیلوں کی فریاد' کے عنوان سے لکھی گئی اس نظم میں بھی لگی لپٹی بغیر انہوں نے وہ باتیں کی ہیں جن کا پردہ چاک کرنے سے تو وارد وکلا گھبراتے ہیں۔ ظاہر ہے مادی دور میں مادی وسائل کی ضرورت ہر فرد کو ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ۔ فاقہ کشی تو کسی صورت میں برداشت نہیں ہوتی۔ اس لئے جو مل جائے اسے غنیمت سمجھ کر قبول کرلیا جاتا ہے۔ اس نظم میں منشی کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ اپنی جیب میں کچھ نہ کچھ ڈالنے کے لئے فکرمند رہتا ہے۔ اس لئے اپنے وکیل کو اشارہ کر کے بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ اس نکاحیہ نظم کا ایک بند دیکھیئے جس میں اپنی غربت اور تنگدستی کا اظہار رو دھو کر نہیں کرتے بلکہ طنز و مزاح کے پیرائے میں کرتے ہیں:۔

مانگیں جو روپے ایک موکل سے پچھتر — وہ کہتا ہے کہ پانچ ہی لے لو تو ہے بہتر
منشی کا اشارہ ہے یہ جائے نہ نکل کر — غیرت کے تقاضے میں ہے یہ خاک برابر
سوچا کہ مگر گھر میں ہے فاقوں ہی کا سایہ — پانچوں ہی کے لینے کو ادھر ہاتھ بڑھایا

خضر تیمی اس نظم کے آخری بند میں تو وکالت کے پیشے کی ناکامیوں پر شدید پریشان ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات کا اندازہ لگایئے:

دنیا کو الہی کہیں دوبارہ بنا دے
منظور ہے گر ہم کو لکڑ ہارا بنا دے
مزدور بنا دے تو پنہارا بنا دے
یا ورنہ کہیں ڈاک کا ہرکارہ بنا دے

پر باز ہم آئے ہیں وکالت سے الہی
دشمن کے بھی در پیش نہ آئے یہ تباہی

خضر تیمی کو پیروڈی لکھنے میں ملکہ حاصل تھا۔ یہی تحریف نگاری اور مناظرے ان کی شہرت کا اصل سبب بنے۔ معروف شعرا کے کلام کو سامنے رکھ کر پیروڈی میں مشق سخن کی تو ان کے جوہر کھلتے گئے۔ ہاتھ کی روانی سے بڑھ کر ذہن کی روانی ان کے زیادہ کام آئی۔ 'مجھ کو تینوں یکساں ہیں' ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر نے اپنی کچھ باطنی کیفیات کے درمیان حد فاصل کھینچنے کی بجائے انہیں ہم آمیز کیا ہے۔ ایک کیفیت کی وضاحت کے لیے تین تین باتوں کا تذکرہ نہایت عمدگی سے کرتے ہیں۔ مطالعہ، بھوک، عشق، دلبر اور دنیا سے روانگی کے معاملات کو انسانی نفسیات

کے پس منظر میں واضح کیا ہے۔ ک' کال کا سال' نظم میں ہر بند ایک الگ مسئلے کو واضح کرنے کے باوجود الگ نہیں رہتا بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ شاعر نے اپنے تخیل کو سماجی حوالے سے پیش کیا ہے ۔انہوں نے گرانی کے ایام میں اس حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے جس سے عام آدمی تو متاثر ہوتا ہی ہے مگر شاعر اسے لذت لے لے کر بیان کرتا ہے۔ 'چلم کا مرثیہ' بظاہر ایسی نظم ہے جس میں شاعر اپنے شوق کی تکمیل کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ چلم اور حقے کے ہر جزو کو باریک بینی سے بیان کرتا ہے۔ خضر تمیمی خود بھی حقہ نوش رہے اس لیے اس نظم میں وہ سارے تجربات اور مشاہدات شامل ہیں جو ایک حقہ پینے والے کے روبرو ہوتے ہیں۔ 'جہاں رمضان رہتا تھا' یہ نظم آورد آمد کی خوبیاں رکھتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے دیہات کے ایک سادہ لوح شخص کے روز و شب کے بارے میں بتایا ہے۔ اس کی زندگی کے معمولات کو بے حد سادگی اور روانی سے پیش کیا ہے۔

'ہاتھ کی روانی' ان کی مشہور نظموں میں سے ایک ہے۔ اس میں شاعر نے عام کھانوں اور دعوتوں میں پیدا ہونے والی ہلڑ بازی کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے' کھانے پر ٹوٹ پڑو'۔ یہ وہی منظر ہے جو خضر تمیمی کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں رہا۔ ایک خاص دعوت کو عمومیت کا رنگ دے کر انسانی زندگی کے اس بے باک پہلو پر کھل کر روشنی ڈالی ہے۔ دراصل یہ نظم ان کے گہرے مشاہدے کی عکاس ہے۔ 'گھوڑے کی آرزو' نظم میں شاعر کے قلم نے تیزی اور روانی کی فضا تو پیدا کی ہے مگر اس کے باوجود اس نے انسان اور حیوان کی زندگی میں ایک خواہش کو بھی بیدار کیا ہے۔ عام طور پر جانوروں کی ان خواہشات پر اس طرح کبھی خامہ فرسائی نہیں کی گئی۔ اکبر الہ آبادی کی منظومات میں بے حد تنوع ہے۔ مزاحیہ شعرا نے بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر خضر تمیمی نے گھوڑے کے ذریعے آزاد فضا اور آزاد ماحول کے فضائل و خواہشات کو عمدگی سے سپرد قلم کیا ہے۔ جانوروں میں بھی ایک فطری کشش ہوتی ہے۔ وہ بھی آپس میں چاہت کے رشتوں کو مضبوط کرتے رہتے ہیں۔ 'قصابوں کا قومی ترانہ' ان کی ایک نہایت عمدہ نظم ہے جس میں انہوں نے اپنے آبائی پیشے کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ انہیں اس بات کا مکمل ادراک ہے کہ قصاب کا ایک ایسا پیشہ ہے جس سے ہر شخص کو کسی نہ کسی طریقے سے واسطہ رہتا ہے۔ اس نے ایک قصاب کی زندگی کو اس لیے بھی بیان کیا ہے کہ انہیں یہ پیشہ اختیار کرنے پر کوئی ندامت نہیں ہے۔ 'ک ر ی' چنیوٹ کا ایک معروف قبیلہ ہے۔ ان کے مقابلے میں قصاب سماجی حیثیت میں کم تر شمار کئے جاتے ہیں۔ خضر تمیمی نے ان کے مد مقابل آکر بڑی جرات کا اظہار کیا ہے۔ 'نعرہ ء جہاد، نذر مجاہدین پاکستان' کے جو اشعار

پڑھے جا سکے ہیں وہ جذبہ حب الوطنی پیدا کرنے کے لیے نہایت اہم ہیں۔ مجاہدین کی جرات، بے باکی اور دلیری کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ایمانی عقیدت کی وضاحت بھی کر جاتے ہیں۔ وہ آل نبی ﷺ، اصحاب نبی ﷺ اور اولیائے کاملین سے اپنی الفت، محبت اور عقیدت کو پوشیدہ نہیں رکھتے بلکہ بیان کرتے ہوئے سراپا نیاز مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ 'ازار بند' اور 'متفرقات' کا لہجہ دھیما اور حریت فکر کا مظہر ہے۔ یہ ان کی مشہور نظمیں ہیں جو ان کے قادر الکلام ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

کلام کا فکری و فنی جائزہ

خضر تمیمی کے کلام سے تصنع اور خودنمائی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے محسوسات کو خلوص اور سچائی کے الفاظ میں ڈھال کر زیب قرطاس کیا ہے۔ انہوں نے بیشتر نظمیں مثنوی کی طرز پر لکھی ہیں۔ کئی نظموں میں مخمس اور مسدس ترکیب بند کی ہیئت اختیار کی ہے۔ ایک نظم میں ہیئت کا نیا تجربہ بھی کیا ہے۔ یوں تو خضر تمیمی زندگی سے بہت کچھ چاہتے تھے۔ وہ سمندر طلب تھے مگر قطرۂ شبنم سے زیادہ حاصل نہ کر سکے۔ مخصوص خاندانی پس منظر، غربت، تنگدستی جیسے عوامل نے مزاج کی حلاوت کو تلخیوں میں بدلنے کی کوشش کی لیکن خضر تمیمی ان اثرات سے صاف بچ کر نکل گئے۔ ان کی خوش فکری اور نرم گفتاری ہمیشہ جذبے کی شدت پر غالب رہی۔ اسی لیے فنکاری اور ندرت احساس کے حسین امتزاج نے کلام میں تاثیر اور معنویت پیدا کر دی۔ ان کی شاعری فلسفہ و تصوف کے دقیق معاملات کی بجائے لطیف جذبات اور غنائیت سے لبریز ہے۔ وہ شروع تا دم آخر نظم کہنے کی طرف ہی مائل رہے۔ انہوں نے شاعری کے جدید اسلوب کو اپنایا۔ پیروڈی اور مناظرہ نگاری کو اپنے عہد کا نمائندہ بنا دیا۔ جس میں غم عشق کی بجائے غم روزگار ہی ان کی نظموں کا موضوع بنا رہا۔ اس لئے ان کی شاعری سحر کاری کی بجائے پختہ کاری کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں خاص طور پر ان مسائل کا ذکر کیا ہے جن سے معاشرہ دوچار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فن کی بجائے مقصد کو ترجیح دی۔ خضر تمیمی نے معاشرتی بے اعتدالیوں اور ثقافت کی شکست و ریخت پر اپنے فطری مزاج کے مطابق ردعمل کا اظہار کیا۔ دراصل ان کی پہچان کا سبب یہی مزاحیہ شاعری اور تحریفات بنیں۔ اسی لئے وہ اپنے عہد کے ترجمان بنے اور اس روایت کے علمبردار ثابت ہوئے جو قوم کو اپنی مٹی سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔

عہد ساز شعرا کے اثرات

خضر تمیمی مغرب کے اثرات بد سے سخت نالاں تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے کہیں کہیں اکبر الہ آبادی کے اسلوب کو بھی اپنایا ہے۔ ان کے مزاجی رویوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مناظراتی طرز سے جن حقائق کو آشکارا کیا انہیں وہ رنگ اور اسلوب بھی پسند آیا۔ اکبر الہ آبادی کے برعکس اپنی نظموں میں طنز کی

گہری چھاپ سے تو صاف صاف بچ نکلے مگر ان کے طرز ادا کو اپنا کر مزاحیہ رنگ پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔ خضر تمیمی نے مناظروں میں استدلالی طریق کار کو اپناتے ہوئے مشرقیت کی برتری کو فطرت کے مقاصد کے مطابق ثابت کیا۔ علامہ اقبال کی تین نظموں کی پیروڈی سے اپنے مقصد کے حصول کا کام لیا۔ مرزا رفیع سودا کی زمین بھی انہیں پسند آئی۔ اس زمین میں پیروڈی کر کے طبع آزمائی کی۔ اس لئے ان عہد ساز شعرا کے اثرات ان کے کلام میں واضح دکھائی دیتے ہیں۔

سادگی وسلاست

خضر تمیمی کا سارا کلام سادگی وسلاست کا ایک نادر نمونہ ہے۔ انہوں نے دوراز کار تشبیہات، محاورہ بندی اور لفظی آرائش سے اجتناب کیا ہے۔ ان کے کلام میں آمد اور آورد دنوں کیفیات موجود ہیں تاہم الفاظ اور بیان کی سادگی طبیعت کو ناگوار نہیں گزرتی بلکہ شگفتگی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ ان کا مزاحیہ رنگ خوش مذاقی کے مترادف ہے۔ بعض موضوعات دلچسپی کا سبب نہیں بنتے مگر خضر تمیمی نے زبان اور انداز بیان سے دلچسپ بنادیا ہے۔ اس طرح ان کی زندہ دلی نے اسلوب کو بے کیف ہونے سے بچالیا ہے۔ وہ ضرورت سے زائد الفاظ بالخصوص آرائشی جملوں سے کام نہیں لیتے۔ ان کی منظومات میں قہقہے نہیں ہیں بلکہ تبسم زیرلب کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے موزوں استعمال پر انہیں عبور حاصل ہے۔ ان کی گرفت کہیں بھی ڈھیلی دکھائی نہیں دیتی۔ الفاظ کی سادگی اور بیان کی روانی کا ایک نمونہ ان کی نظم ''اچھے شہری'' میں دیکھئے:

انہیں کہنے سننے کی حاجت نہیں — بتانے کی ان کو ضرورت نہیں
سمجھتے ہیں وہ خوب احوال کو — بچا کر نہیں رکھتے اموال کو
انہیں یاد ہے ظلم کی انتہا! — نہیں فتح میں ان کو کچھ شک ذرا

رموز موسیقی سے واقفیت

خضر تمیمی طبلہ نواز تھے۔ انہوں نے ماہر اساتذہ سے یہ فن سیکھا اور شاعری میں اس فن کا اظہار کیا۔ موسیقی کو روح کا رقص قرار دیا جائے تو اس رقص کا اظہار انگ انگ سے ہونا چاہیے۔ خضر تمیمی اس فن کی باریکیوں سے اس لئے واقف تھے کہ انہوں نے باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ 'سارنگی اور طبلہ' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں رموز موسیقی پوری طرح عیاں ہوجاتے ہیں بلکہ ان

کی سارنگی کی تال اور طبلے کی تھاپ اشعار میں گونجتی نظر آتی ہے۔' سارنگی اور طبلہ' سے آخری شعر ملاحظہ ہو۔

القصہ بچھڑے دوست ملے، نَے جھگڑا تھا، نَے شکوہ تھا
نَے تن تنا تن تن تن تھی' نَے تا کڑ تا کڑ دھیا تھا

تراکیب اور تکرار لفظی کا خوب صورت استعمال

خضر تمیمی بعید از فہم تراکیب استعمال نہیں کرتے۔ ان کے ہاں تراکیب تاثیر لئے ہوئے ہیں جو نہ تو کلام کو بوجھل بناتی ہیں اور نہ ہی قاری کے لئے کوئی دقت پیدا کرتی ہیں۔ ترکیب کے استعمال سے شعر کی موسیقیت، صوتی آہنگ اور روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہوں نے نئی تراکیب تو نہیں تراشیں مگر پرانی تراکیب کو خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ ان کی استعمال کردہ تراکیب خوش ذوقی کا پتہ دیتی ہیں۔ گلدستہ ءنسرین وسمن، عندلیبان گلستان، کلاہ عزت نشان، بستان جنت، دادِ خوشگامی، کرمکِ شب تاب، طالب سیلاب نور، خمار نخوت اسکندر و کئے، یہ تمام ترکیبیں غیر محسوس طریقے سے جزو کلام بن گئی ہیں۔ ان کے کلام میں تکرار لفظی سے جو صوتی آہنگ پیدا ہوتا ہے اس سے موسیقیت جنم لیتی ہے۔ انسانی جذبات کو متاثر کرنے میں موسیقی ایک معجزانہ اثر رکھتی ہے۔ الفاظ کا تناسب کسی بھی جگہ سے ڈھیلا پڑ جائے یا کوئی جھول آ جائے تو لطافت کی بجائے ثقالت بڑھ جاتی ہے جو طبع نازک پر ناگوار گزرتی ہے۔ مگر خضر تمیمی ان باریکیوں سے شناسا تھے اس لئے انہوں نے تکرار لفظی سے شعر کے حسن کو دوبالا کیا ہے:

ہیں تیرے دم قدم سے رونقیں گلزار ہستی میں
یہاں کا باغباں تو ، آب تو، بادصبا تو ہے

ب: زیور علم سب کا گہنا' لباس قانون سب نے پہنا
کمال سب کا درست سننا' درست لکھنا' درست کہنا

خضر تمیمی منافقانہ رویوں کو پسند نہیں کرتے۔ وہ ایک سچے اور کھرے انسان ہیں۔ انسان کے علاوہ مسلمان بھی ہیں۔ اس لئے قول و عمل میں سچائی کے قائل ہیں اور یہی درس عام کرتے ہیں۔ نظم 'مسلمان' کے اشعار چھوٹی بحر میں ہیں جو جامعیت اور معانی کی تاثیر سے پُر ہیں۔

باطن مسلمان ، ظاہر مسلمان   اول مسلمان ، آخر مسلمان

انگریزی اور فارسی الفاظ کا استعمال

خضر تمیمی نے اکبر الہ آبادی کی تقلید کرتے ہوئے انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ان الفاظ کے استعمال سے کلام ثقیل نہیں ہوا بلکہ ان میں تازگی پیدا ہوگئی ہے۔دیسی اور بدیسی زبان کے الفاظ کا استعمال بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فاصلے سمٹ رہے ہیں۔جدید ٹیکنالوجی کی کشش اور اثرات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔جدید تعلیم میں انگریزی مرکزی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔مہذب کہلانے کے شوق میں انگریزی الفاظ کا استعمال بتدریج بڑھ رہا ہے۔خضر تمیمی بھی موازنہ کرتے ہوئے کرداروں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ان مناظروں میں انگریزی اور فارسی الفاظ کے علاوہ ضرب الامثال بھی موجود ہیں جو ان کے کرداروں کی ضرورت ہے۔وہ اس بات کا مکمل شعور رکھتے ہیں کہ کردار کو کس طرح کی زبان وادا میں موقف پیش کرنا چاہیے۔

تھی یہاں غنچہ صفت بارشِ الطاف وکرم   اور وہاں صورت گل صاف صدائے ویلکم
ایک بیگم سے مخاطب ہوئی یوں جوش سے میم   اس زمانے میں بھی وہ پہلے خیالات ہیں شیم
وہ تو خیر اپنا وطن ہی ہے دیارلندن   پھر بھی میں دیکھ چکی پیرس و روم ولزبن
تجھ کو سرمایۂ عشرت ہے یہ چرخ کا دبال   اور مجھے ٹینس و ٹی و ڈنر و میوزک وبال
تیری قسمت میں ہے گلقند وعرق وشکر   میرا حصہ کوئی ٹانک یا برانڈی و بیئر

تضمین

خضر تمیمی نے معروف شعرا کے کلام کی پیروڈی دلآویز لب و لہجے کے ساتھ کی ہے۔ پیروڈی کے علاوہ سنجیدہ نظموں میں اشعار اور ضرب الامثال کو تضمین کے تحت ندرت خیال عطا کی ہے۔تضمین کے استعمال سے اثر ولطف میں اضافہ کر کے کلام کو فصیح بنادیا ہے۔تضمین سے شرح و تفسیر کے مقاصد پورے ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات تضمین کا مقصد اصل تحریر کی وضاحت کرنا ہوتا ہے تاکہ مفہوم جامعیت کے ساتھ با آسانی سمجھ آسکے۔ان کی کامیاب ترین مثالیں متعدد شعرا کے کلام میں ملتی ہیں۔اسی طرح ان مناظروں میں تضمین کے نمونے ان کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ تضمین میں کہیں کہیں تصرف کر جاتے ہیں۔نعت میں ٹیپ کے تمام فارسی اشعار امیر خسرو کی غزل

سے لئے گئے ہیں۔انہوں نے دیگر نظموں میں کہیں ایک مصرع اور کہیں پورا شعر بھی لکھا ہے۔
یہی آواز پھر گونجی اندھیرے اور اجالے میں 'خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں'
میں یوں شکر سے پیار رکھوں کس لئے روا 'آمیز شے کجا گہر پاک او کجا'
خراب اک بار ہو جائے تو بنتی ہے مہینوں میں 'یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں'
غالب دہلی کا انداز مقال اچھا ہے 'کام وہ اچھا ہے جس کا کہ مآل اچھا ہے'
بعض جگہوں پر خضر تمیمی نے پورا شعر بھی استعمال کیا ہے۔
'حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد'
خضر تمیمی نے تضمین کے استعمال سے موقف کو مضبوط کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کے استعمال سے وہ سوسائٹی کے نکتہ چیں کی حیثیت سے مغربی تہذیب و ثقافت کا پردہ چاک کر دیتے ہیں۔

مناظرہ نگاری

خضر تمیمی نے مناظروں میں ظریفانہ اسلوب کو استعمال کر کے اسے بھاری پن سے بچالیا ہے۔مناظروں کی کامیابی فنی و فکری عناصر کے علاوہ استدلال کی بنیاد پر ہوتی ہے۔یہ انداز ان کے وکیل ہونے کے سبب پیدا ہوا ہے۔وہ فریقین کو مدلل گفتگو کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ جنگ و جدل کی بجائے گفت و شنید اور مذاکرات کے ذریعے پر امن طریقے سے مسئلے کا منطقی حل تلاش کرتے ہیں۔ان کی خوبی یہ ہے کہ فنی پہلو کو کہیں کمزور نہیں پڑنے دیا۔وہ معاملے کو منطقی انجام تک پہنچا کر چھوڑتے ہیں۔مناظروں کی طرف بہت کم شعرا نے توجہ دی ہے لیکن خضر تمیمی نے عمدہ مناظرے پیش کئے ہیں۔'چائے اور لسی کا مناظرہ' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔
ٹھنڈک سے میں ہٹاتی ہوں گرمی کے راج کو اور سردیوں میں گرم میں کر دوں مزاج کو
مکی یا باجرے کی ہے روٹی سے تیرا میل ہے میرے ساتھ کیک مٹھائی کی ریل پیل
گرنے لگی جو بھاپ کے گولوں سے چائے پر لسی زبان حال سے بولی الہی خیر

صنائع بدائع کا استعمال

صنائع بدائع کو سلیقے سے استعمال کیا جائے تو حسن شعر میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔اس طرح کلام میں دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے۔انہیں شعر کی جان بھی کہا جاتا ہے۔صنائع بدائع کے استعمال سے شاعری کا کوئی بھی دور خالی نظر نہیں آتا۔اردو شعراء میں میر،

سودا، غالب، ذوق، آتش، ناسخ، داغ، اقبال، فیض، حفیظ، جوش غرضیکہ ہر شاعر کے ہاں اس کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ خضر تمیمی بھی صنائع بدائع کے رموز اور ان کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں اور اس صنعت سے انہوں نے کلام کو مزین کیا ہے۔ انہوں نے ارادی طور پر یہ کام نہیں کیا لیکن شعری حسن کو واضح کرنے اور کلام کو خوش آہنگ بنانے کے لئے تشبیہ، استعارہ، تلمیح، رعایت لفظی، مراۃ النظیر وغیرہ کو استعمال کیا ہے۔ کلام خضر میں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

آب دینے کو اسے موج چناب آئی ہے　　خلد چنیوٹ سے آیا ہے، سخن کا سہرا
عندلیبان گلستاں کی نوا خوب سہی　　اور ہی رنگ کا ہے اہل وطن کا سہرا

شاعر نے چناب اور چنیوٹ کا تعلق پیدا کر کے رعایت لفظی سے کام لیا ہے۔ اس شعر میں آب، موج اور چناب مختصر مراۃ النظیر کی مثالیں ہیں۔ عندلیبان گلستاں استعارہ کی عمدہ مثال ہے۔ اس سے مراد وہ شعرا ہیں جو خضر تمیمی سے تعلق دار ہیں۔

چرخ دہلی میں ہیں فرحاں تو میں چنیوٹ میں شاد
ایک ہی مئے سے ہیں سرشار چناب اور جمن

اس شعر میں دہلی اور جمن (دریائے جمنا)، چنیوٹ اور چناب رعایت لفظی کی مثالیں ہیں۔ تشبیہ اور تلمیح کے عناصر اس شعر میں ملاحظہ فرمائیں۔

خانہ مُور میں جس طرح سلیماں آئے　　اس طرح لوگ کہیں خضر کے مہماں آئے

اس شعر میں تشبیہ اور استعارہ کا تعلق واضح کرنے کے علاوہ مُور اور سلیمان تلمیح کے طور پر استعمال ہوئے ہیں جس کی بدولت معنی کی تاثیر میں اضافہ ہو گیا ہے۔

باغ عزیز اثری، پھولے پھلے ہمیشہ
یہ نونہال جس کی زینت بڑھا رہا ہے

نونہال سے مراد اثری کا بیٹا فرخ عزیز اثری ہے۔ یہ استعارہ ہے جو خضر تمیمی نے نہایت دلکش انداز میں استعمال کیا ہے۔

بگل دے کر لگی کہنے یہ موٹر باولی گاڑی
خداوند یسوع نے عقل تری کس طرح ماری

اس شعر کی تقطیع کے دوران یسوع کی 'ع' گرادی گئی ہے۔ لیکن شعر کی روانی متاثر نہیں ہوئی۔ اس شعر میں خداوند یسوع کو موٹر کے موافق استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں انہوں نے صنعت تلمیح استعمال کر کے شعر

کواور زیادہ دلکش بنادیا ہے۔اس ضمن میں ان کے ہاں جدت اور انفرادیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

جزئیات نگاری

دیگر اصناف کی نسبت مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ میں جزئیات نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔خضر تمیمی نے واقعاتی بیان میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں ہونے دیا بلکہ پورے منظر کو جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔جزئیات نگاری میں سراپا نگاری کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے۔اس لئے مضمون کی شوخی، زبان کی صفائی، طرز ادا کی نزاکت اور مکالماتی انداز ان کے کلام میں موجود ہے۔غیر ضروری طوالت سے اجتناب کرتے ہوئے کوئی بھی بھرتی کا شعر شامل نہیں کیا۔سارا عمل خلوص و صداقت کے پیش نظر مکمل ہوا ہے۔ان کے تمام مناظروں میں جو کہ مثنوی کی ہیئت میں لکھے گئے ہیں یہ پہلو منفرد نظر آتا ہے۔جزئیات نگاری میں خضر تمیمی کی اس پہلو پر گرفت مضبوط ہے۔'ہیٹ اور پگڑی کا مناظرہ' سے چند اشعار دیکھئے۔

پہلے تو انہیں سنتے ہی شرماگئی پگڑی　　پھر غصے سے بپھری، کئی بل کھاگئی پگڑی
اس غیظ کی حالت میں جوتھراگیا طرّہ　　پنکھے کی طرح مور کے،لہراگیا طرّہ
کھنکھار کے گویا ہوئی' کیا شان خدا ہے　　آمادۂ پیکار یہاں شہ سے گدا ہے
تو ، اور میرے سامنے یوں ہرزہ سرائی　　قسمت نے مجھے ساعتِ بد یہ دکھائی

اس طرح کے نمونے خضر تمیمی کے کلام میں مختلف جگہوں پر نظر آتے ہیں جو ان کی گہری بصیرت اور مزاجی رویوں کو واضح کرتے ہیں۔

ہیئت کا تجربہ

تاریخی لحاظ سے 1857ء تا 1968ء کا زمانہ اردو شاعری میں بالخصوص ہیئت اور آہنگ کے تجربوں کا زمانہ ہے۔فنی اعتبار سے ہیئت اظہار کی خارجی صورت کا نام ہے۔ہر ادب پارہ کسی نہ کسی ہیئت کے تابع ہوتا ہے۔مگر ادب صرف ہیئت کا نام نہیں بلکہ مواد کا ہونا بھی اہم ہوتا ہے۔مواد اور ہئیت میں ہم آہنگی، خوش اسلوبی اور خوش ذوقی سے تاثیریت پیدا ہوتی ہے۔اچھے ادب کی پرکھ کے لیے ہیئت اور مواد دونوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔اس طرح آہنگ سے مراد اجزا کا تناسب ہے۔پوری کائنات ایک آہنگ میں قائم ہے۔کہیں بھی بے اعتدالی پیدا ہو جائے تو ٹکراؤ کا عمل شروع ہوسکتا ہے۔شعر و ادب میں آہنگ کا وجود اس کے حسن کو قائم رکھتا ہے۔ہیئت

اور آہنگ کے رنگ کو دیکھا جائے تو سید انشاء نے فارسی کے عوامی گیتوں کی ہیئت سے متاثر ہو کر مستزاد کو رواج دینے کی کوشش کی۔ شروع میں مستزاد بیک وقت، ہیئت اور آہنگ کا تجربہ تھی۔ حالی، شرر، اسمٰعیل میرٹھی نے بلینک ورس کو اردو میں رائج کرنے پر زور دیا اور بعض ابتدائی کوششیں بھی ظہور پذیر ہوئی۔ عظمت اللہ خان نے ہیئت، آہنگ اور اوزان کے تجربات کئے۔ جس میں عربی نظام عروض کی جگہ پنگل نظام عروض کو رائج کرتے رہے۔ لیکن ان میں موسیقیت اور غنائی اصول اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ حفیظ جالندھری نے اردو اوزان کو گیت کے اوزان میں ڈھالا۔ دو بحور کو یک جان کرنے کا تجربہ بھی کیا۔ حفیظ کی طرح قیوم نظر کے گیت بھی اردو زبان کے غنائی امکانات کے مظہر ہیں۔ اوزان کے تجربوں میں قیوم نظر کا حصہ نمایاں ہے۔ آزاد نظم میں ن۔م۔راشد، تصدق حسین خالد، میرا جی اور مجید امجد نے کئی تجربے کئے۔ ان تجربات کے نتیجے میں موسیقیت، غنائیت اور جمالیات نے اپنی جگہ بنالی۔ خضر تمیمی نے شاعری میں بالعموم روایتی ہیئت ہی برتی ہے انہوں نے ایک نظم میں ہیئت کا جو تجربہ کیا ہے وہ پہلے کسی کے ہاں دکھائی نہیں دیتا۔ ہیئت کے اس تجربے میں فعلن فعلن کی بحر کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس نظم کا عنوان ''مجھ کو تینوں یکساں ہیں'' ہے۔ اس کا پہلا مصرع چار رکنی ہے۔ پھر تین مصرعے دو رکنی ہیں اور ٹیپ کا مصرع ساڑھے تین رکنی ہے۔ ہیئت کے اس نادر تجربے میں بھی ظریفانہ اسلوب پایا جاتا ہے۔ الفاظ کی موزونیت، شعر کی دلکشی اور قافیے کی موسیقیت نے رواں بحروں میں اضافہ کر دیا ہے۔ ان اشعار میں صنعت حسن تعلیل کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس نظم کا نمونہ دیکھئے۔

عشق میں جب بے تاب ہو جاؤں
گرم، دوشالا ---- پھولوں کی مالا ------- یا جوتوں کا ہار
مجکو تینوں یکساں ہیں

جب وہ دلبر پاس ہو میرے
رنگین لیلےٰ ----- نمکین عذرا -------- یا فتو لوہار
مجکو تینوں یکساں ہیں

جب میں اس دنیا سے جاؤں
ٹیکسی لاری ---- اونٹ سوار -------- یا کوئی موٹر کار
مجکو تینوں یکساں ہیں

ظرافت نگاری

خضر تیمی کی خوش طبعی اور ظرافت کا رنگ ان کے ابتدائی کلام سے ملتا ہے مگر جوں جوں ناہمواریاں اور بے اعتدالیاں ان کے تجربات اور مشاہدات کا حصہ بنتی رہیں وہ اس کے اظہار کے لئے قدرت پیدا کرتے گئے ہیں ۔ اس طرح ان کے لئے نئے راستے بھی کھل گئے ہیں جہاں انہوں نے اپنا خاص رنگ پیدا کر لیا۔ خضر تیمی کا ظریفانہ کلام مجموعی طور پر سماجی موضوعات لئے ہوئے ہے۔ ان کے مزاح میں ایک پیغام موجود ہے جس کی ترسیل کے لئے وہ بیتاب نظر آتے ہیں ۔ خضر تیمی نے مزاح کا سارا مواد اپنے گرد و پیش سے حاصل کیا ہے جو حقیقی زندگی اور زندہ تہذیبی مظاہر کی نشان دہی کرتا ہے۔ بصیرت اور مسرت کے حامل یہی جذبے ان کو منفرد بناتے ہیں ۔ان کی شاعری میں اصلاح کا پہلو اجاگر ہوا ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ اس موقف کی پوری تائید کرتا ہے۔ 'موٹر اور بیل گاڑی کا مناظرہ' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اری تو مال پر جائے اور ایسی سخت سردی میں
بتا تیرا نہ ہو چالان کیوں آوارہ گردی میں
نہ ٹھہری ، اور نہ جھجکی ،رکی کچھ اور کچھ ڈولی
دہان زخم پنجر سے مگر کی آہ ، اور بولی
مرا وہ رنگ و روغن سینکڑوں کا جس پہ دل آئے
خرام ناز سے میرے پری کا دل دہل جائے

'قصابوں کا قومی ترانہ' سے ایک شعر دیکھئے جس میں شوخی کا خوب صورت نمونہ موجود ہے۔ اس میں نفسیاتی برتری کو انہوں نے عمدگی سے واضح کیا ہے۔

چیلیں ہوا میں 'نگراں' کتے ہیں گھر کے درباں
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

'گھوڑے کی آرزو' سے ایک شعر ملاحظہ کیجئے۔ یہاں شاعر نے حسن تعلیل کو مزاح کے لبادے میں پیش کیا ہے۔

ہر اسپ باد پا کو گانا میرا سنادے اس کے اثر سے شاید رسا کوئی تڑادے

شوخی اور نفاست

خضر تمیمی نے بالخصوص مناظروں میں شوخی کے رنگ کو خوبصورتی سے ابھارا ہے۔ جس کی وجہ سے مناظرے کا رنگ اور زیادہ نکھر گیا ہے۔ شوخی کا یہ انداز نفاست لئے ہوئے ہے جو خضر تمیمی کے کلام کی ایک نمایاں خوبی ہے۔ وہ مکالمہ میں وہی زبان اور لہجہ اختیار کرتے ہیں جو کلام کرنے والے کو زیب دیتا ہے۔ اس میں بناوٹ کا پہلو نظر نہیں آتا۔ ان کے چند اشعار 'سارنگی اور طبلہ' کے مناظرہ سے ملاحظہ کیجئے۔

آواز تمہاری کوے سی اور شکل چھلاوے سی تیری
ان میٹھی میٹھی تانوں کے تم رنگ میں بھنگ ملاتے ہو
میں راج دلاری ،البیلی ناری ہوں، پریم کنھیا ہوں
تم مونڈی کاٹے مردک ہوں، ہر جا پر دھکے کھاتے ہو
نازوں سے پلی شہزادی ہوں میں ناری محلوں والی ہوں
تم حبس دوام کے قیدی ہو صندوقوں میں ڈٹ جاتے ہو
میں زنجبار کا شہزادہ میدان میں آکر ضیغم سا
جب ایک دہاڑ لگاتا ہوں تم پردوں میں ڈر جاتی ہو

زنجبار میں 'ن' کا اعلان نہیں کیا گیا بلکہ تقطیع سے گرادیا گیا ہے۔ جس سے تنافر صوتی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مصرع کے لفظ 'دہاڑ' کی درست املا 'دھاڑ' ہے۔ 'ہیٹ اور پگڑی کا مناظرہ' سے ایک شعر دیکھئے جس میں شوخی اور برتری کا احساس پایا جاتا ہے۔ خضر تمیمی کی یہ خوبی ہے کہ وہ مناظروں میں وہی لہجہ اور زبان استعمال کرتے ہیں جو اس علامت یا کردار کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ اس طرح تصنع اور خانہ پُری کا احساس نہیں ہوتا۔

بیٹی ہوں فلالین کی قاقم کی بھتیجی جاگیر میں مجھ کو ملے یوگنڈا و فیجی

تحریف نگاری

خضر تمیمی کو اصل شہرت پیروڈی لکھنے کی وجہ سے حاصل ہوئی اور یہی ان کی پہچان بن گئی۔ خضر تمیمی کے علاوہ بھی اردو شاعری میں عمدہ پیروڈیوں کے نمونے ملتے ہیں۔ راجہ مہدی علی خان نے مرزا غالب کی، کنھیالال کپور نے فیض احمد فیض کی، عاشق محمد غوری نے ڈاکٹر تاثیر کی غزلوں اور نظموں

کی عمدہ پیروڈیاں لکھی ہیں۔ مرزا محمود سرحدی بھی تحریف نگاری میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ پیروڈی کسی تصنیف یا تخلیق کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ دراصل پیروڈی دو فنکاروں کی دست نگر ہوتی ہے۔ ایک تو وہ جو پہلے کوئی نظم و نثر لکھتا ہے دوسرا وہ جو اسی کی پیروڈی کرتا ہے۔ اگر تیسرے فنکار کا اضافہ کریں تو وہ قارئین ہیں جو اس پیروڈی کو مقبول عام بناتے ہیں۔ خضر تمیمی نے نہ صرف پیروڈی کی روایت کو برقرار رکھا بلکہ اس فن کو زندگی اور قوت بھی عطا کی۔ خضر تمیمی نے مرزا رفیع سودا کے قصیدہ شہر آشوب کی پیروڈی 'کال کا سال' کے عنوان سے لکھی جس کے ہر شعر نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ان کے ہاں پیروڈی کے تینوں مروجہ طریقے یعنی لفظی پیروڈی، طرزی پیروڈی اور موضوعاتی پیروڈی پائے جاتے ہیں۔۔

'چلم کا مرثیہ' سے پیروڈی کا ایک بند دیکھئے جو علامہ اقبال کی نظم ''شکوہ'' کے جواب میں لکھی گئی ہے۔

خود دھواں لے گیا بیرونِ چلم رازِ چلم　　کیا قیامت ہے محقق ہوئے غمازِ چلم
گڑگڑاہٹ گئی جب ٹوٹ گیا سازِ چلم　　اٹھ گئے کرسیوں سے زمزمہ پردازِ چلم

کچھ محقق ہیں کہ ہیں محوِ فغان و زاری
بے چلم حقہ پئے جاتے ہیں باری باری

اس طرح کا ایک نمونہ اختر شیرانی کی نظم ''یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی'' کی پیروڈی ''جہاں رمضان رہتا تھا'' میں موجود ہے جس میں اختر شیرانی کے طرز تحریر کو مزاحیہ موضوع میں بیان کیا گیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

اسی چھپر تلے دن رات اس کی چارپائی تھی
یہی دو چار کپڑے تھے اور اک میلی رضائی تھی
وہ اس دنیا کا مالک تھا یہی اس کی خدائی تھی
اور اس کوچہ کے پنواڑی سے اس کی آشنائی تھی
کبھی وہ اور کبھی یہ اس کے گھر مہمان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

اکبرالہ آبادی کی نظم 'آب لوڈور' کی پیروڈی 'ہاتھ کی روانی' کے عنوان سے لکھی اور اس میں کمال فن حاصل کیا اور یہی تحریف انہیں کمال اوج پر لے گئی۔ الفاظ کا جس خوب صورتی سے مضحکہ اڑایا ہے یہ رنگ اور ملکہ کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ اسے لفظی مزاح کا جوبن کہا

جائے تو بالکل درست ہوگا۔اس پیروڈی میں بھی شاعر کی انفرادیت قائم ہے۔کلام کا نمونہ دیکھئے۔

وہ چمچے سے چُلّو بناتا ہوا — وہ آلو کو اُلّو بناتا ہوا
سویوں پہ سو جاں سے مرتا ہوا — ادھر لاڈ لڈو سے کرتا ہوا
سموسے میں خود کو سموتا ہوا — یہاں کھوئے کے ہوش کھوتا ہوا
سمجھ کر میرے گھر کو جائے وفا — نہ ہلّد نہ تلّد نہ جنبد زجا

اس پیروڈی میں غنایت اور رعایت لفظی کا کتنا عمدہ امتزاج ہے۔یہ ملکہ صرف انہی کو حاصل ہے جو لفظوں کی بناوٹ میں تبدیلی کر کے مانوس الفاظ سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔خوشی محمد ناظر کی نظم 'جوگی اور ناظر' کی پیروڈی 'سارنگی اور طبلہ' کے عنوان سے کی۔اس میں مناظرہ کی کیفیت موجود ہے۔یہاں فریقین کے وزنی دلائل کی بنیاد پر بحث کو برابری کی بنیاد پر ختم کیا گیا ہے۔اس میں فنی اور فکری پہلوؤں کا خوب صورت احاطہ موجود ہے۔اس کے علاوہ علامہ اقبال کی نظم 'ایک آرزو' کی پیروڈی 'گھوڑے کی آرزو' اور 'ترانہ ملی' کی پیروڈی 'قصابوں کا قومی ترانہ' کے عنوان سے لکھی۔اس پیروڈی میں اپنے خاندانی پس منظر اور نسبت کو دلیری سے بیان کیا ہے۔یہ جرات بے باکی کا درجہ اختیار کرتے ہوئے کھرے پن پر منتج ہوتی ہے۔'قصابوں کا قومی ترانہ' میں اپنے خاندانی پیشے کا بغیر حیل وحجت اظہار کرتے ہیں۔انہیں اس بات کا قلق نہیں کہ معاشرہ کیا کہے گا بلکہ وہ ہر لفظ کو سچائی کے ساتھ پیش کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔اس معاملے میں کسی سماجی اونچ نیچ سے مرعوب نہیں ہوتے۔وہ جانتے ہیں کہ انسان کے مرتبہ کا تعین زر و مال سے نہیں بلکہ اس کے اعمال و کردار سے ہوتا ہے۔انہوں نے ان اشعار میں حقیقت پر مبنی نقشہ کھینچا ہے جو ان کے لئے شرمندگی کا باعث نہیں ہے۔

چین و عرب ہمارا ' ہندوستاں ہمارا
قصاب ہیں ' وطن ہے سارا جہاں ہمارا
چھریوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے
خنجر ہلال کا ہے ' قومی نشاں ہمارا

تحریف نگار کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ موزوں طبع ہو اور اس کے ساتھ ساتھ لطافت پسند اور سنجیدہ مزاج ہو۔تحریروں سے یہ محسوس نہ ہو کہ وہ صرف ہنسنے اور ہنسانے تک ہی محدود ہے کیونکہ اصل تحریر اور پیروڈی میں گہری نسبت سے ہی جو ہر خاص سامنے آتا ہے۔خضر تمیمی کے جنون، اور

جو ہر میں چولی دامن کا تعلق ہے۔ان کا طرز تخیل منطقی لحاظ اور واقعاتی اعتبار سے معیاری ہے۔
انہوں نے مفروضوں کی بجائے حقیقت سے کام لیا ہے۔

خضر تمیمی کی شاعری میں حسن وعشق کا موضوع نہیں ملتا اور نہ ہی کوئی ان کا روایتی محبوب نظر آتا ہے۔محبوب غزل کا ایک پر تاثیر اور پرکشش کردار ہے اور خضر تمیمی غزل کے نہیں نظم کے شاعر ہیں۔ان کی پوری شاعری میں روایتی حسن پرستی کا رجحان موجود نہیں ہے۔وہ عملی زندگی میں بھی اس مشغلے سے دور رہے۔ان کے کلام میں کسی تصوراتی یا ماورائی محبت کا ذکر نہیں ملتا۔اس لیے ان کی شاعری تصوف اور روایتی عشق کی ترجمان نہیں ہے بلکہ ان کے موضوعات سماج سے متعلق ہیں۔اس طرح کی منظومات میں ان کے جذبات کی سچائی اور انسان دوستی بالکل عیاں ہے۔ان کے موضوعات ہنگامی نوعیت کے مسائل سے متعلق نہیں بلکہ آفاقی ہیں۔ان کے ہاں فلسفیانہ رنگ اور امکانات کی شاعری نہیں پائی جاتی۔ابتذال اور اخلاقی قدروں کے منافی کوئی بات نہیں ملتی۔
انہوں نے کلام کو گھٹیا پن اور نچلی سطح سے بچائے رکھا ہے۔ان کی شاعری میں حکمت وفلسفہ کی باتیں نہیں پائی جاتیں تاہم چلتی پھرتی انسانی زندگی ضرور نظر آتی ہے۔یہ اچھے لفظوں کے جوہری ہیں۔اس لئے لفظ کی افادیت' اہمیت اور معنویت کو فراموش نہیں کرتے۔
خضر تمیمی نے کسی ایک بحر میں نظمیں نہیں لکھیں بلکہ مختلف بحروں کے استعمال سے انہیں مزین کیا ہے۔ان کے مخصوص طرز تحریر سے بعض الفاظ کو پڑھنے میں خاصی دقت محسوس ہوئی ہے۔کئی مقامات پر قیاسی تصحیح سے کام لینا پڑا ہے۔فن موسیقی اور فن عروض کے قاعدوں میں مماثلت نے ان کے فن کو نکھارا ہے تاہم عروضی اور لسانی لحاظ سے کلام میں کچھ خامیاں پائی جاتی ہیں۔لفظ کی املا میں بے پروائی بھی دکھائی دیتی ہے۔صحت املا کی طرف مکمل توجہ نہیں دی گئی۔مناظروں میں مشرقیت کی برتری ثابت کر کے اپنی تہذیب واقدار سے فطری محبت کا ثبوت دیا ہے۔ان کے مناظرے پڑھنے کے قابل ہیں۔خضر تمیمی کے ہاں اچھے تحریف نگار کی متعدد خصوصیات ملتی ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ ان سے بڑھ کر کسی اور شاعر نے مناظرہ نگاری میں اتنا بلند مقام حاصل نہیں کیا۔انہوں نے ظریفانہ شاعری اور تحریف نگاری کی روایت کو معتبر انداز میں آگے بڑھایا ہے۔اس روایت کے تسلسل میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔بلکہ مناظروں سے اس رجحان کو تقویت ملی ہے۔ان میں منطقی پہلو کو خوش اسلوبی سے اجاگر کیا گیا ہے۔وہ خوش فکر شاعر تھے اس لئے ان کے کلام میں یاسیت نہیں پائی جاتی۔

ظریفانہ شاعری میں سید ضمیر جعفری، دلاور فگار، سرفراز شاہد، انور مسعود اور انعام الحق جاوید معتبر نام ہیں۔ خضر تیمی اپنے عہد کے مزاح نگاروں کے علاوہ کسی طور ان سے کم درجے کے نظر نہیں آتے۔ ان کی صاف گوئی اور تعمیری فکر عیاں ہے کہ وہ مجبوریوں اور وقتی مصلحتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اکبرالہ آبادی کی طرح سخت ردعمل کا اظہار نہیں کرتے بلکہ دھیمے لہجے میں بات کرتے ہیں اور کہیں کہیں نسوانی لہجہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ انہوں نے مزاحیہ شاعری کو ہیجانی وقت کے لئے محدود نہیں رکھا بلکہ ایسے حقائق بیان کئے ہیں جن کے اثرات انسان کے سماجی رویوں پر تا دیر قائم رہیں گے۔ وہ معاشرہ کو ان کا چہرہ تو دکھاتے ہیں مگر ان کو شرمسار نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ اپنے اندر تعمیری و اصلاحی تبدیلیاں پیدا کریں۔ اتنی ساری خوبیوں کا یوں ایک شخص میں جمع ہو جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سنجیدہ شاعری کی نسبت مزاحیہ شاعری نہایت مشکل کام ہے مگر خضر تیمی اپنی خداداد صلاحیتوں اور ذہن رسا کی وجہ سے اپنا مقام خود پیدا کرتے چلے گئے ہیں۔ اس طرز کے شاعر کا ہونا کسی خاص نعمت سے کم نہیں ہوتا کیونکہ صحیح معنوں میں ایسے ہی شاعر معاشرے کے نباض ہوتے ہیں۔ پھر خضر تیمی تو اپنے اسلوب شعر کی انفرادیت اور موضوع کی تازگی کی وجہ سے ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مقصد کے لیے جو مواد جمع کیا اور جس طرح اپنے تخیل اور قوت مشاہدہ کو پرواز عطا کی ایسا مقام و مرتبہ ہر کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ یہ کہنا بجا ہے کہ اردو مزاحیہ شاعری کی تاریخ اور ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے کوئی بھی مورخ، محقق یا نقاد ان کی ادبی کاوش سے صرف نظر نہیں کر سکے گا بلکہ انہیں ہمیشہ اہم مقام پر فائز کرے گا۔

☆☆☆
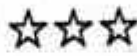
حواشی وحوالہ جات
(نام ونسب تا وفات)

1. نقل رجسٹر پیدائش چنیوٹ میں نام والا خانہ خالی ہے۔ جب کہ تاریخ پیدائش، ولدیت، قوم اور دیگر کوائف موجود ہیں۔ یہ اندراجات 12 مارچ 1909ء کو کرائے گئے۔ اس وقت تک نومولود کا نام طے نہیں پایا تھا۔ میٹرک کی سند پر ان کا نام 'چوہدری مولا بخش' درج ہے۔ ایف۔اے کی سند پر 'میاں مولا بخش خضر تمیمی' ہے۔ بی اے آنرز، ایل۔ایل بی اور ایم۔اے کی ڈگریوں پر 'مولا بخش خضر تمیمی' ہے اس نام کے بارے میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید 'وے صورتیں الٰہی' صفحہ 147 پر لکھتے ہیں 'اصل نام مولا بخش تھا لیکن خضر تمیمی اتنا مقبول ہوا کہ مولا بخش پسپا ہو گیا'۔ راقم کے نزدیک یہی بیان درست ہے۔ 'خضر' ان کا تخلص تھا جو ایف۔اے کی سند میں نام کا حصہ بن گیا اور 'تمیمی' ان کے خاندانی نسبت کی وجہ سے شامل ہوا۔

2. نقل رجسٹر پیدائش قصبہ چنیوٹ، تحصیل چنیوٹ، نمبر رجسٹر سالنامہ 169، مورخہ 12 مارچ 1909ء کے مطابق خانہ نمبر 2 میں تاریخ پیدائش 11 مارچ 1909ء ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد امجد ثاقب، شہر لب دریا، صفحہ 166 پر، سرفراز شاہد، اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 87، ماہنامہ قانونگو شیخ لاہور، شمارہ مارچ 1982ء، صفحہ 20، خضر تمیمی کے پاسپورٹ نمبر 51383 مجریہ یکم جون 1954ء صفحہ 2، مسٹر جسٹس ولیم۔او۔ڈگلس، جسٹس سپریم کورٹ امریکہ کے نام خط محررہ 22 جون 1966ء اور اپنی قلمی تحریر محررہ 16 ستمبر 1966ء مملوکہ منظور نسیم تمیمی پر 11 مارچ 1909ء درج ہے۔ بلال زبیری، تاریخ جھنگ، صفحہ 480 پر 1896ء ڈاکٹر علی محمد خان، لاہور کا دبستان شاعری، صفحہ 533 پر 1908ء خضر تمیمی کے دیرینہ دوست کیپٹن ممتاز ملک نے روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور، شمارہ 13 فروری 1974ء کی اشاعت میں خضر تمیمی مرحوم کے عنوان سے اپنے آرٹیکل میں یکم جنوری 1908ء شعرائے پنجاب (عصر حاضر)، مرتبین نسیم رضوانی اور ملک محمد باقر، ''خضر'' صفحہ 249 پر یکم جنوری 1908ء لکھی ہے۔ خضر تمیمی نے اپنی قلمی تحریر محررہ 16 ستمبر 1966ء میں دیگر کوائف کے علاوہ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ میٹرک کے

سرٹیفکیٹ پر تاریخ پیدائش یکم جنوری 1908ء ہے۔ یہ اندراج درست نہیں ہے۔ راقم کے نزدیک درست تاریخ پیدائش 11 مارچ 1909ء ہے۔ اس کی ایک وجہ تو خضر تمیمی کا اپنا بیان ہے اور دوسری وجہ نقل رجسٹر پیدائش کا پہلا اندراج ہے۔ یہ دونوں حوالے اس ضمن میں مستند ہیں۔

3. نقل رجسٹر پیدائش میں خانہ نمبر 7 پر 'وڈ قصاب' درج ہے۔ 'شعرائے پنجاب' کے مرتبین نے خضر کے اپنے الفاظ صفحہ 249 پر یوں درج کئے ہیں۔ ''رونق دود مان قصابیم''۔ اس بات کی تائید خضر تمیمی کی نظم 'قصابوں کا قومی ترانہ' سے بھی ہوتی ہے جو کہ متن میں شامل ہے۔ خضر تمیمی نے لوکل کمشنر چنیوٹ کی اسامی پر تقرر کے لئے ڈسٹرکٹ جج جھنگ بمقام سرگودھا کے نام درخواست محررہ 31 اکتوبر 1939 میں اپنی ذات 'جٹ تھہیم' لکھی ہے۔

4. تعلیمی ریکارڈ کے مطابق خضر تمیمی نے میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ سے 1925ء میں رول نمبر 13640 کے تحت یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور سے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ان کے مضامین انگریزی، اردو، ریاضی، سائنس اور فارسی تھے۔ ایف۔ اے کا امتحان 1927ء ضمنی، رول نمبر 3065 کے تحت سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور مضمون انگریزی، فلسفہ، تاریخ، اردو اور فارسی تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے 1929ء میں رول نمبر 1622 کے تحت بی۔ اے آنرز کا امتحان تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا اور مضمون انگریزی، معاشیات، اردو (آپشنل) اور فارسی (آنرز) تھے۔ 32-1931ء سیشن میں FEL اور 33-1932ء سیشن میں رول نمبر 167 کے تحت لاء کالج لاہور سے درجہ دوم میں ایل۔ ایل بی کیا۔ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے 1936ء میں ایم۔ اے۔ فارسی کا امتحان زیر رول نمبر 171 درجہ سوم میں پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔

5. جعفر طاہر (سید) ''اختتامیہ'' غبار کارواں، محمد حیات خان سیال، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1979ء صفحہ 118 پر یہ الفاظ درج ہیں۔ ''پھر اس کالج کے ایک اور گوہر کہ آج مجید امجد کی طرح تہہ خاک پنہاں ہیں۔ حضرت خضر تمیمی تھے''۔ اس کتاب میں مرتب نے ان لوگوں کے حالات اور کلام کو شائع کیا ہے جو گورنمنٹ کالج جھنگ میں زیر تعلیم رہے۔ یہاں جعفر طاہر نے خضر تمیمی کو اس ادارہ کا طالب علم قرار دیا ہے۔ خضر تمیمی کے سرٹیفکیٹ اس دعویٰ کی تردید کرتے ہیں۔ تارا سنگھ، پرنسپل، گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) نے 23 ستمبر 1927ء کو خضر تمیمی کے لئے ایک سرٹیفکیٹ لکھا جو مملوکہ منظور نسیم تمیمی ہے۔

"Maula Bakhsh was a student of the intermediate classes here for two years. He appeared to the F.A. Examination on this year and placed in the compartment"

خضر تمیمی ''یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا'' کریسنٹ، لاہور، اسلامیہ کالج، شمارہ فروری۔ اپریل 1951ء صفحہ 62 پر لکھتے ہیں۔ ''اسے محض ایک حادثہ سمجھئے کہ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج سے ایف۔اے کا کورس ختم کرنے کے بعد 1927ء میں ہمارے ''جرم ہائے سیاہ'' کو اسلامیہ کالج لاہور کے دامن عفو میں پناہ ملی''۔ ان دو وجوہ کی بنا پر سید جعفر طاہر کا بیان حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ خضر تمیمی نے چنیوٹ سے میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج لائل پور ہی میں داخلہ لیا۔ وہ گورنمنٹ کالج جھنگ کے طالب علم کبھی نہیں رہے۔

6. چرخ چنیوٹی، حسن نظر، دیباچہ از خضر تمیمی، دہلی، دلی پرنٹنگ ورکس، 15 اگست 1967ء صفحہ نمبر 3 تا 4

7. ایضاً صفحہ 4

8. خضر تمیمی کے بیٹے نسیم منظور نسیم تمیمی سے راقم کی ملاقات لاہور میں ان کے گھر ہوئی۔ مورخہ 6 جون 2001ء کو اس ملاقات میں انہوں نے مزید بتایا کہ سال 2000ء ان پر بہت بھاری رہا۔ 27 فروری 2000ء کو ساجد نعیم تمیمی کا انتقال ہوا۔ پسماندگان میں فیض بتول بیوہ اور دو سالہ بیٹی درنایاب ہیں۔ 17 اپریل 2000ء کو نوشاد بخت تمیمی انتقال کر گئے۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ صرف ایک بیوہ رہ گئی۔ ان دو صدموں کا بوڑھی والدہ پر گہرا اثر ہوا۔ عائشہ بی بی بیوہ خضر تمیمی مرحوم بھی 13 نومبر 2000ء کو عالم بقا کو سدھاریں۔ یہ تمام مرحومین آبائی قبرستان باقر والی چنیوٹ میں دفن ہیں۔ منظور نسیم تمیمی کی ازدواجی زندگی بھی کامیاب نہ رہی۔ ان کی شادی وٹہ سٹہ کی تھی۔ نباہ نہ ہونے کی وجہ سے بیوی کو ایک طلاق دے دی۔ باقی دو کا حق محفوظ رکھا ہوا ہے۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جو والدہ کے ہمراہ میکے میں رہتے ہیں منظور نسیم تمیمی کی بہن بھی نباہ نہ ہونے کی وجہ سے ناراضی کی حالت میں اپنے بھائی کے پاس رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ساجد نعیم تمیمی کی بیوہ مسماۃ فیض بتول اور منظور نسیم تمیمی کے مابین ساجد نعیم تمیمی کے واجبات کی وصولی اور بچی کے تحفظات کے بارے میں مقدمہ بازی جاری رہی اس طرح خضر تمیمی کا یہ گھرانہ اموات اور خانگی مسائل کی وجہ سے بکھر چکا ہے۔

9. خضر تمیمی نے خلیل احمد ملک کے ایم۔اے پنجابی کے مقالہ کا، تعارف پنجابی زبان میں اس بیعت کے بارے میں لکھا جو اردو الفاظ میں یوں ہے۔''میری خوش بختی تھی کہ مرحوم چودھری محمد افضل ایم۔ایس سی، فزکس ڈیپارٹمنٹ، صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کی رسمی سفارش سے قبلہ حافظ صاحب کی خدمت بابرکت میں 1943ء میں پہنچا۔اس کے بعد وصال تک یعنی 1963ء تک متواتر حاضر خدمت رہا''۔

10. جعفر قاسمی (مولانا) ''خضر تمیمی'' لاہور، روزنامہ 'ندا' 21 مارچ 1990ء

11. یہ واقعہ راقم کو منظور نسیم تمیمی نے لاہور میں اپنے گھر ملاقات مورخہ 5 فروری 2001ء کے دوران سنایا۔

12. محمد امجد ثاقب (ڈاکٹر)، شہرلب دریا، صفحہ 184

13. نسیم رضوانی، ملک محمد باقر ''خضر'' شعرائے پنجاب، گجرات، پرنٹنگ پریس، 1937ء صفحہ 249۔اس بیان میں لفظ 'طیاریاں' لکھا ہوا ہے۔اس لفظ کی درست املا 'تیاریاں' ہے جو کہ متن میں شامل ہے۔

14. ہفت روزہ 'یادخدا' چنیوٹ، جلد نمبر 4، شمارہ 19، 26 جولائی 1940ء صفحہ 5

15. ایضاً 5 فروری 1941ء صفحہ 4

16. قمر تسکین ''خضر تمیمی۔ایک باکمال مزاح نگار اور شاعر'' روزنامہ، امروز، لاہور، 20 فروری 1977ء صفحہ 2

17. ایضاً صفحہ 3

18. خضر تمیمی کو فری میسن تحریک کے گرینڈ سیکرٹری کے دستخطوں سے 15 مئی 1952ء کو ماسٹر میسن Master Mason کا سرٹیفکیٹ ملا۔ رائل آرک میسن انگلینڈ کے گرینڈ سپرنٹنڈنٹ نے ''رائل آرک میسن'' کا سرٹیفکیٹ 17 نومبر 1954ء کو جاری کیا۔ ڈسٹرکٹ گرینڈ رجسٹرار نے 29 مارچ 1958ء کو ''ڈسٹرکٹ گرینڈ انر گارڈ'' کا سرٹیفکیٹ دیا۔ گرینڈ سبسکرائب نے 20 دسمبر 1958ء کو 'رائل آرک مین' بنایا۔ گرینڈ لارج آف سکاٹ لینڈ کے گرینڈ سیکرٹری نے 15 مئی 1968ء کو ''انسٹالڈ ماسٹر'' کا سرٹیفکیٹ جاری کیا۔ ڈسٹرکٹ گرینڈ لاج کی طرف سے ڈسٹرکٹ گرینڈ ماسٹر نے 14 مارچ 1969ء کو ''مارک ماسٹر مین آف پاکستان'' کا سرٹیفکیٹ جاری کیا۔

19. محمد امجد ثاقب (ڈاکٹر) 'شہرلب دریا' صفحہ نمبر 132

20. سفرِ عراق پر جانے والے قافلے میں سات افراد شامل تھے۔ حافظ برکت علی قادری سالار قافلہ تھے۔ دیگر افراد میں صاحبزادہ محمد اشفاق، حاجی فیض محمد، مستری محمد تقی، پہلوان معراج دین، شیخ محمد بشیر اور خضر تمیمی تھے۔ یہ معلومات خضر تمیمی کی قلمی تحریر سے حاصل ہوئی ہیں۔

21. بلال زبیری، تاریخ جھنگ، صفحہ 480

22. محمد امجد ثاقب (ڈاکٹر)، شہرلب دریا، صفحہ 110

23. راقم نے معلومات جمع کرنے کے لئے چنیوٹ کا سفر کیا۔ وہاں خضر تمیمی کے برادر محمد دریام تمیمی سے 25 اپریل 2001ء کو ان کے گھر میں ملاقات کی۔ یہ شعر انہوں نے راقم کو سنایا جسے لکھ لیا گیا۔

24. تارا سنگھ، پرنسپل گورنمنٹ انٹر میڈیٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) نے 23 ستمبر 1937ء کو یہ قلمی سرٹیفکیٹ دیا۔

25. ایم۔ڈی۔تاثیر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ انگریزی، اسلامیہ کالج لاہور نے قلمی سرٹیفکیٹ دیا جو مملوکہ منظور نسیم تمیمی ہے اور محررہ 25 اکتوبر 1931ء ہے۔

26. میرزا ادیب، مٹی کا دیا، لاہور، مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ، 2000، صفحہ 263

27. ایم۔ڈی۔تاثیر کا جاری کردہ قلمی سرٹیفکیٹ محررہ 6 دسمبر 1936ء

28. یہ قلمی سرٹیفکیٹ حافظ محمود شیرانی، لیکچرار، پنجاب یونیورسٹی لاہور نے خضر تمیمی کے لئے 6 ستمبر 1936ء کو لکھا۔ مملوکہ منظور نسیم تمیمی سے راقم نے یہ اقتباس نقل کیا۔

29. ہفت روزہ 'جہاں نما' کا پہلا شمارہ 5 دسمبر 1937ء بمطابق یکم شوال المکرم 1356ھ کو چنیوٹ سے جاری ہوا۔ محمد دریام خان اس کے ایڈیٹر، پرنٹر، اور پبلشر تھے۔ خضر تمیمی اس ہفت روزہ کے مشیر و نگران تھے۔ بعد کے شماروں میں پالیسی ساز کی حیثیت سے اضافی ذمہ داری ادا کرتے رہے۔ یہ ہفت روزہ کارونیشن الیکٹرک پریس لائل پور (فیصل آباد) سے چھپتا رہا۔ پہلے شمارہ کے ٹائٹل صفحہ پر حضرت ابوالخیال جبروتی نامی شاعر کی ''جہاں نما'' کے موضوع پر ایک نظم بھی شائع ہوئی جس میں خضر تمیمی کی اس کاوش کو سراہا گیا ہے۔ اس نظم میں آٹھ اشعار ہیں۔

جمشید کے تو پاس تھا ساغر ''جہاں نما''   لیکن یہاں ہے خضر کا جوہر ''جہاں نما''

نکلا ہے آسمان صحافت کا آفتاب جس کی ہے ہر شعاع منور" جہاں نما"
کرتے ہیں جس سے اہل نظر نور اقتباس ان کی ہے دیدہ ریزی کا مظہر" جہاں نما"
دونو جہاں کا اس میں مرقع ہے دیکھیے جام جہاں نما سے ہے بڑھ کر" جہاں نما"
فکر ونظر کے واسطے ہے مصدر فیوض اور ظل لطف خالق اکبر "جہاں نما "
ہر روز لطف تازہ مضامین سے لوٹئے ہے اہل دل کو قندمکرر "جہاں نما"
پیتے ہیں جس کو اہل نظر آنکھ سے مدام ہے اس شراب ناب کا ساغر" جہاں نما"
سو گند عمر خضر تمیمی کہ آج ہے
بے تاج بادشاہوں کا افسر" جہاں نما"

چوتھے شعر کے پہلے مصرع میں 'دیکھیے' کی درست املا 'دیکھیے' ہے شاعر نے آخری شعر کے دوسرے مصرع میں بے تاج بادشاہوں' سے مراد اخبار نویس لکھا ہے۔

30. قمر تسکین" خضر تمیمی ایک باکمال مزاح نگار اور شاعر" ایضاً صفحہ 2
31. ممتاز ملک (کیپٹن)" خضر تمیمی مرحوم" روز نامہ نوائے وقت، لاہور، شمارہ 13 فروری 1974ء
32. خضر تمیمی (مترجم)" بنیادی انسانی حقوق کا مسئلہ" طبع اول، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، 1965ء
33. راقم کی خضر تمیمی کے بھائی محمد وریام تمیمی سے ان کے گھر چنیوٹ میں 18 جولائی 2001ء کو ملاقات ہوئی۔ یہ بات انہوں نے سنائی۔
34. ممتاز ملک (کیپٹن)" خضر تمیمی مرحوم" ایضاً شمارہ 13 فروری 1974ء
35. مولانا جعفر قاسمی" خضر تمیمی" روز نامہ، ندا، لاہور، شمارہ، 21 مارچ 1990ء
36. سیّد منیر علی شاہ اس وقت گورنمنٹ ایلیمنٹری سکول، برکت آباد جھنگ صدر میں E.S.T ہیں۔ راقم نے ان سے 10 جون 2001ء کو ملاقات کی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ 1970-71ء کے سیشن میں ایف۔ای۔ایل میں خضر تمیمی مرحوم کے طالب علم تھے۔ ان دنوں حمایت اسلام لاء کالج لاہور میں شام کی شفٹ میں پڑھاتے تھے۔ اس طرح کے جملے طلباء کے ساتھ اکثر بولتے تھے۔
37. چرخ چنیوٹی 'حسن نظر' ایضاً صفحہ 4
38. مکتوب غلام جیلانی اصغر، کلب روڈ، سرگودھا، بنام راقم محررہ 15 دسمبر 2000ء
39. مکتوب تقی الدین انجم، ظہور آفریدی روڈ لاہور کینٹ بنام راقم محررہ 3 جنوری

2001ء مملوکہ راقم۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ خضر تمیمی اور مجید امجد ہم جماعت نہیں تھے بلکہ خضر تمیمی 1932ء میں لاء کالج لاہور میں LLB کے طالب علم تھے جبکہ مجید امجد اسلامیہ کالج لاہور میں سال سوم (بی۔اے) کے طالب علم تھے۔ خضر تمیمی اسلامیہ کالج کے سابق طالب علم ہونے کی وجہ سے آتے جاتے رہتے تھے اور مجید امجد سے گہری شناسائی تھی۔

40. نسیم رضوانی، ملک محمد باقر، ''خضر'' شعرائے پنجاب، ایضاً صفحہ 250

41. قمر تسکین، '' خضر تمیمی ایک باکمال مزاح نگار اور شاعر'' ایضاً صفحہ 2

42. جعفر طاہر (سید) ''اختتامیہ'' غبار کارواں، محمد حیات خان سیال، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1979ء، صفحہ 118

43. راقم نے خضر تمیمی کے بڑے بیٹے منظور نسیم تمیمی سے ان کے گھر واقع لاہور میں مورخہ 6 جون 2001ء کو ملاقات کی جس میں انہوں نے یہ تفصیلات بتائیں۔

44. منو بھائی، گریبان، روزنامہ، امروز، لاہور، شمارہ 23 جون 1974ء

45. مکتوب چرخ چنیوٹی، دہلی بنام منظور نسیم تمیمی، محررہ یکم اکتوبر 1977ء مملوکہ منظور نسیم تمیمی ہے۔

46. محمد امجد ثاقب (ڈاکٹر) 'شہر لب دریا' ایضاً صفحہ 165

☆☆☆

حواشی وحوالہ جات
(منظومات)

1. یہ حمد ہفت روزہ، چنیوٹ، 22 جون 1946ء شمارہ 9، جلد 10 صفحہ 2 پر شائع ہوئی۔ شعر نمبر 9 کے پہلے مصرع میں 'آنکہوں میں' لکھا ہے جب کہ اس لفظ کی درست املا 'آنکھوں میں' ہے۔اس لئے متن میں تصحیح کی گئی ہے۔

2. اس نعت کی قلمی تحریر خضر تمیمی کے کاغذات سے دستیاب ہوئی ہے۔ یہ مخمس ترکیب بند کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ ہر بند کے آخری دو مصرعے تضمین ہیں۔ جو امیر خسرو کی فارسی غزل سے لئے گئے ہیں۔ صحت متن اور موازنے کے لئے ''انتخاب کلام۔امیر خسروؒ'' صوفی تبسم، لاہور، پیکیجز لمیٹڈ، 1975ء صفحہ 110 پیش نظر رکھا گیا ہے۔

3. (ترجمہ):۔اے حسین چہرے والے تو بتان آزری کے لئے باعث رشک ہے۔ ہر چند میں تیری تعریف کروں، تُو تو سب سے بڑھ کر ہے۔اس ''انتخاب کلام'' میں دوسرا مصرع یوں ہے: ہر چند وصفت می کُنم در حسن از آں زیبا تری۔ یہ بھی وزن کے لحاظ سے درست ہے۔ تاہم قلمی تحریر کا مصرع متن میں شامل ہے۔

4. (ترجمہ):۔ میں دنیا گھوما ہوں، حسینوں سے محبت کی ہے۔ بہت سے حسین دیکھے لیکن تو سب سے منفرد ہے۔اس انتخاب کلام میں 'آفاقہا' کی بجائے 'آفاق را' ہے۔ مفہوم کے لحاظ سے موزوں لفظ 'آفاقہا' متن میں شامل ہے۔

5. (ترجمہ):۔تو شیر سے زیادہ چست و چالاک اور ہوشیار ہے اور پھول کی پتی سے زیادہ نازک ہے۔ میں جو بھی کہوں تُو اس سے بہتر ہے، تُو عجیب و حیرت انگیز دلبر ہے۔

6. (ترجمہ):۔خسرو اپنے وطن سے دور ایک گدا ہے جو تمہارے شہر میں آیا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کے لیے ان وطن سے دور رہنے والوں کی طرف ایک نظر ڈالو۔

7. یہ نظم روزنامہ 'عوام' لائل پور کے شمارہ 26 نومبر 1973ء میں شائع ہوئی۔اس مطبوعہ نظم کے آخر پر نیاز مند قدیمی ۔۔۔خضر تمیمی لکھا ہے اور 25 نومبر 1973ء درج ہے۔ عنوان کا

ترجمہ ہے: اے رسول اللہ ﷺ، خدا کے واسطے میری امداد فرمایئے۔

8. خلیق قریشی، مدیر مسئول، روزنامہ 'عوام' لائل پور خضر تمیمی کے قریبی دوست تھے۔ خلیق قریشی کو دل کا عارضہ لاحق ہوا تو ان کی صحت یابی کے لئے یہ مناجات لکھی۔

9. یہ شعر بالعموم صوفیا کی محافل میں شجرہ طریقت پیش کرتے ہوئے پڑھا جاتا ہے۔

(ترجمہ): ۔اے اللہ، حضور پاک ﷺ کے صدقے میری مدد فرما۔ اے رسول پاک ﷺ، خدا کے واسطے میری دستگیری فرمایئے۔

10. خضر تمیمی کے بیٹے منظور نسیم تمیمی نے ایک رسالہ سے یہ نظم خود نقل کی تھی۔ کم علمی کے باعث وہ حوالہ نقل نہ کر سکے۔ تلاش بسیار کے باوجود یہ رسالہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ اور نہ ہی اس رسالے کے نام کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکا۔ یہ نظم چونکہ خضر تمیمی کے اسلوب شعر سے گہری مطابقت رکھتی ہے اس لئے اسے خضر تمیمی کی نظم تسلیم کرتے ہوئے متن میں شامل کیا گیا ہے۔

11. یہ نظم ہفت روزہ، جہاں نما، چنیوٹ، شمارہ 21 فروری 1938ء کے سرورق پر شائع ہوئی۔ اس مطبوعہ نظم کے تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں 'سلیمان' لکھا ہے جو کہ قافیہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ لفظ 'سلیماں' درست ہے۔ یہ کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح مقطع میں 'خوان' لکھا ہے جو کہ 'خواں' ہے۔ خضر تمیمی نے ساتویں شعر کے پہلے مصرع میں 'آنکھوں' ضرورت شعری کے تحت لکھا ہے۔ اس کی درست املا 'آنکھوں' ہے۔ اسی طرح آٹھویں شعر کے پہلے مصرع میں 'لکہا' بھی ضرورت شعری کے تحت ہے۔ اس کی درست املا 'لکھا' ہے۔

12. مسٹر جسٹس دین محمد، جج، لاہور ہائی کورٹ کی طرف اشارہ ہے۔

13. مسٹر جسٹس دین محمد 17 فروری 1938ء کو عدالت دیوانی چنیوٹ کے معائنے کی غرض سے یہاں آئے۔ اس روز ملک بھگوان داس ہائی سکول چنیوٹ میں شہریوں نے استقبالیہ تقریب منعقد کی جس میں شہر بھر کے عمائدین اور معززین نے شرکت کی۔ بحوالہ ہفت روزہ 'جہاں نما' چنیوٹ، شمارہ 21 فروری 1938ء، صفحہ 3۔

14. یہ نظم ہفت روزہ 'یادِ خدا' چنیوٹ، شمارہ 26 جولائی 1940ء صفحہ 4 پر شائع ہوئی۔

15. یہ نظم 27 اکتوبر 1965ء کو یوم انقلاب کے موقع پر ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی۔ کالم نگار احسان بی۔ اے نے روزنامہ، مشرق، لاہور کے اداریہ میں لکھا کہ سامعین نے شاعر کو ہُوٹ (Hoot) کرنے کی بجائے شاعر نے سامعین کو ہوٹ کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خضر تمیمی مشاعرہ

کے موضوع سے ہٹ کر یہ نظم پڑھنے لگے تو سامعین نے جملہ بازی شروع کر دی۔ خضر تمیمی باواز بلند مکمل نظم پڑھنے کے بعد سٹیج سے اترے تو سامعین سے مخاطب ہو کر پنجابی زبان میں کہا 'پڑھیا کہ ناں پڑھیا' یعنی ہوٹ کرنے کے باوجود میں نے نظم پڑھی ہے کہ نہیں۔ یہ جملہ بول کر شاعر نے اپنی فتح ظاہر کی۔ یہ نظم خضر تمیمی کے کاغذات سے قلمی تحریر کی صورت میں دستیاب ہوئی ہے جس پر 27 اکتوبر 1965ء کی تاریخ درج ہے اور ان کے دستخط اس طرح موجود ہیں 'مولا بخش خضر تمیمی (ایڈووکیٹ) 4 مزنگ روڈ۔ لاہور'

16. پی۔آئی۔اے بوئنگ 707 کی افتتاحی پرواز لاہور سے قاہرہ روانہ ہوئی تو اس میں خضر تمیمی کے دوست عرفان چغتائی اور عبدالحمید مکی بھی سوار تھے۔ راستہ میں فنی خرابی کی وجہ سے طیارہ کو آگ لگ گئی جس سے کافی جانی نقصان ہوا۔ اس حادثہ میں عبدالحمید مکی بچ گئے۔

17. دو بہادر سے مراد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان اور چو۔این۔لائی وزیر اعظم چین ہیں۔

18. اس آخری شعر کے دوسرے مصرعے کو ''بسکہ اس کے سر ہے'' لکھا ہے جو وزن میں نہیں آتا۔ راقم کے خیال میں (ہے) کی جگہ 'پہ' موضوع ہے۔ یہ قیاسی تصحیح کی گئی ہے۔

19. یہ نظم قلمی تحریر کی صورت میں خضر تمیمی کے کاغذات سے دستیاب ہوئی ہے۔ اس پر 20 اگست 1967ء کی تاریخ درج ہے اور خضر تمیمی کے اس طرح دستخط ثبت ہیں (نیاز مند قدیمی۔ خضر تمیمی)۔ نظم کا یہ عنوان حافظ شیرازی کے ایک شعر کا دوسرا مصرع ہے۔ پورا شعر بحوالہ حافظ شیرازی، دیوان حافظ، مولانا قاضی سجاد حسین (مترجم)، بار اول، لاہور، مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ، 1987ء صفحہ 185 یوں ہے۔

شہر خالیست زعشاق مگر کز طرفے   مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

ترجمہ: عاشقوں سے شہر خالی ہے شاید ایسا ہو کہ کسی کنارے سے کوئی مرد/ہاتھ غیب سے برآمد ہو اور کوئی کام انجام دے۔ مگر دیوان خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی، چاپ اول، ساز مان انتشارات جاویدان، زمستان یک ہزار و سیصد و شصت و سہ کے صفحہ 222 پر پہلے مصرع میں 'مگر' کی بجائے 'بود' اور دوسرے مصرع میں 'مرد ے' کی بجائے 'دستی' لکھا ہے۔ چاپ کے معنی 'چھپائی' اور انتشار کے معنی 'شائع ہونا' کے درج ہیں۔ نظم کے آخری شعر کے پہلے مصرع میں 'تجکو' لکھا ہے جب کہ اس لفظ کی درست املا 'تجھ کو' ہے۔ یہ ضرورت شعری کے تحت ہے۔

20. اس سے مراد مغلیہ سلطنت کے بانی اور مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر ہیں۔

21. یہ نظم خضر تمیمی کے کاغذات سے قلمی تحریر کی صورت میں دستیاب ہے۔ اس نظم میں ترمیم و تنسیخ کرنے سے قبل کی تحریر بھی دستیاب ہوئی ہے۔ خضر تمیمی نے اپنے بیٹے ساجد نعیم تمیمی کے ایک دوست محمد طارق کی ہمشیرہ تسنیم اختر (جو گورنمنٹ گرلز ہائی سکول چوبر جی گارڈن لاہور میں جماعت دہم کی طالبہ تھی) کے لئے لکھی۔ مقطع میں بھی تسنیم اختر کا ہی نام لکھا۔ انہوں نے اپنے سکول کی الوداعی تقریب میں یہ نظم پڑھی۔

22. یہ نظم منظور نسیم تمیمی کے قلم سے تحریر شدہ ہے۔ انہوں نے راقم کو بتایا کہ یہ کسی رسالہ میں شائع ہوئی تھی۔ جب اس رسالہ سے نقل کی تو اس کا حوالہ کم علمی کی وجہ سے لکھ نہ سکا۔ یہ رسالہ اور اس کا نام راقم کو دستیاب نہیں ہو سکا۔ تاہم شواہد و قرائن سے یہ نظم خضر تمیمی کی لگی ہے۔ اس لیے اسے متن میں شامل کیا گیا ہے۔

23. یہ نظم خضر تمیمی کے کاغذات سے قلمی تحریر کی صورت میں دستیاب ہوئی ہے۔ خضر تمیمی نے یہ نظم اپنے سب سے چھوٹے بیٹے ساجد نعیم تمیمی کے لئے لکھی جس کو انھوں نے ایک سکاؤٹ کیمپ میں پڑھا۔ اس نظم کے شعر نمبر 15،4 کے مصرع اول میں 'سکاؤٹ' کو ضرورت شعری کے تحت [سکاٹ] باندھا گیا ہے اور شعر نمبر 14 کے مصرع اول میں اس لفظ کی 'ؤ' گرتی ہے۔ شعر نمبر 18 کے مصرع ثانی میں قلمی تحریر میں 'دلآزاری' میں مد [ٓ] زائد ہے۔ اس لئے متن میں شامل نہیں کیا گیا۔

24. یہ سہرا خضر تمیمی نے اپنے بے حد قریبی دوست ایشر داس چرخ چنیوٹی (جو قیام پاکستان کے بعد چنیوٹ سے نقل مکانی کر کے دہلی چلے گئے تھے) کے چھوٹے بھائی مدن لعل کپور کی شادی کے لئے لکھا۔ جنوری 1956ء میں شادی میں شریک ہونے کے لئے دہلی گئے اور وہاں جا کر یہ سہرا پڑھا۔ یہ قلمی تحریر دستیاب ہوئی ہے۔ ایشر داس چنیوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تخلص چرخ تھا۔ وہ قیام پاکستان کے بعد چنیوٹ کو چھوڑ گئے مگر اپنے تخلص کے ساتھ چنیوٹی شروع سے لکھتے تھے۔ اس نسبت کو تادم آخر برقرار رکھا۔ خضر تمیمی کے ہاں بطور منشی کام کرتے تھے۔ نہایت قریبی اور بااعتماد ہونے کی وجہ سے خضر تمیمی کے مہمانوں کی مہمان داری کرتے۔ اختر شیرانی جب کبھی خضر تمیمی سے چنیوٹ میں ملنے کے لئے آتے تو چرخ چنیوٹی بطور خاص ان کی خدمت کرتے۔ چرخ چنیوٹی اردو زبان کے باکمال شاعر تھے ان کا پہلا شعری مجموعہ 'آہیں' 1941ء میں چنیوٹ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد جلوۂ انجم، حسن نظر، حسن ادب، اور حسن سخن منظر عام پر آئے۔ 'حسن نظر' کا

انتساب خضر تمیمی کے نام کیا اور خضر تمیمی نے اس شعری مجموعہ کا دیباچہ بھی لکھا۔ 'آ ئین' کے علاوہ باقی چاروں شعری مجموعے دہلی میں شائع ہوئے۔

25. جگدیش، چرخ چنیوٹی کا بیٹا اور بلونت کور، ان کی بیٹی ہے۔

26. خضر تمیمی کے دوست محمد رفیع مگوں چنیوٹ میں رہتے تھے۔ بعد میں کاروباری سلسلہ کی وجہ سے کراچی منتقل ہو گئے۔ محمد رفیع مگوں کے بیٹے امتیاز رفیع مگوں کی شادی میں شرکت کے لئے کراچی گئے تو یہ سہرا لکھ کر ساتھ لے گئے۔ 21 ستمبر 1967ء کو اس شادی میں خضر تمیمی نے یہ سہرا پڑھا۔ اس نظم کی قلمی تحریر دستیاب ہوئی ہے۔

27. مظہر، امتیاز، پرویز، شوکت، امجد، محمد رفیع کے بیٹے ہیں۔ اس سہرا کے چوتھے شعر کے دوسرے مصرع میں ارکان کی کمی ہے۔ قیاسی تصحیح کرنے سے وزن اور مفہوم درست ہوتا ہے۔ اس لئے [جو آج] کا اضافہ کیا گیا ہے۔

28. یہ انگریزی زبان کا لفظ SOBER ہے جس کا مطلب سنجیدہ یا متین ہے۔ 'سوبر' کا تلفظ وزن میں نہیں آتا۔ اس لفظ کو 'سو ءبر' کے تلفظ سے پڑھا جائے تو وزن درست ہو جاتا ہے۔

29. قلمی تحریر، خضر تمیمی کے کاغذات سے دستیاب ہوئی ہے۔ ایشر داس چرخ چنیوٹی کے بیٹے ستیش کمار کی شادی 17 جنوری 1971ء کو شانتی نگر دہلی میں ہوئی۔ خضر تمیمی خود نا معلوم وجہ سے وہاں نہ جا سکے اور یہ سہرا بذریعہ ڈاک ارسال کر دیا۔ اس نظم کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں قلمی تحریر میں دولہا اور دلہن ہے جبکہ درست املا دلھا اور دلھن ہے۔ اس املا اور تلفظ سے وزن قائم رہتا ہے۔

30. چناب اور جمن سے مراد دریائے چناب اور دریائے جمنا ہے۔ 'شہر لب دریا' کے مصنف ڈاکٹر محمد امجد ثاقب نے صفحہ 132 پر اس مصرے کو یوں لکھا ہے۔ ع ایک ہی مے سے ہیں سرشار چناب اور چمن۔ اس مصرع میں چمن کا لفظ درست نہیں ہے کیونکہ چناب ایک دریا کا نام ہے اور اس کو خضر تمیمی نے اپنی نسبت سے لکھا ہے۔ چنیوٹ شہر دریائے چناب کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ اور 'جمن' کی نسبت چرخ چنیوٹی سے ہے جس سے مراد دریائے جمنا ہے جو بھارت میں بہتا ہے۔ صحیح مفہوم لفظ جمن سے ہے جسے متن میں لکھا گیا ہے۔

31. یہ انگریزی زبان کا لفظ 'TIFFEN' ہے جو اردو میں بھی 'ٹفن' ہی مستعمل ہے۔

32. یہ اشعار خضر تمیمی کی قلمی تحریر سے لئے گئے ہیں۔ پہلے چار اشعار دعوتی کارڈ پر چھپوائے

گئے تھے۔ خضر تمیمی کے بیٹے منظور نسیم تمیمی کی شادی 24 اکتوبر 1967ء بمطابق 19 رجب 1387ھ بروز سہ شنبہ ہوئی۔ 27 اکتوبر 1967ء بمطابق 22 رجب 1387ھ بروز جمعۃ المبارک خضر تمیمی کی بیٹی شمیم فاخرہ تمیمی کا نکاح ہمراہ مقبول احمد تمیمی اکاؤنٹنٹ منگمری بسکٹ فیکٹری ساہیوال ہوا۔ ان دونوں بہن بھائیوں کے لئے مشترکہ دعوت نامہ چھپوایا گیا۔ شادی کارڈ پر تحریر پہلے چار اشعار 'شہر لب دریا' کے صفحہ 184 تا 185 پر درج ہیں۔ ان اشعار کا عنوان راقم نے خود تجویز کیا ہے۔

33. شادی کارڈ پر یہ مصرع اس طرح ہے: ع شکر ہے، آئی ہیں پھر ساعتیں، بابرکت وسعد۔

34. شعر نمبر 5 اور 6 شادی کارڈ پر درج نہیں ہیں۔ راقم نے منظور نسیم تمیمی سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ والد صاحب نے یہ کارڈ خود چھپوائے تھے اور یہ دونوں اشعار اپنی مرضی سے خارج کر دیئے تھے۔ اس مصرعے میں 'فرزند' کو 'فرزندوں' اور 'مجکو' کی بجائے 'مجھکو' کے الفاظ شادی کارڈ پر چھپے ہیں جب کہ روانی کے لحاظ سے 'فرزند' اور 'مجکو' درست ہیں۔

35. خضر تمیمی کے چھوٹے بیٹے ساجد نعیم تمیمی کے ایک دوست عزیز اثری تھے۔ ساجد نعیم تمیمی نے عزیز اثری کے بیٹے فرخ عزیز اثری کی دوسری سالگرہ کے موقع پر اپنے والد سے یہ نظم لکھوائی۔ جسے سالگرہ کے موقع پر ساجد نعیم تمیمی نے پڑھا۔ اسی لئے مقطع میں ساجد نعیم کا نام شامل ہے۔

36. حاجی میاں سلطان محمود، ناظم انجمن اسلامیہ چنیوٹ، خضر تمیمی کے دوست تھے جو 22 جولائی 1929ء کو 11 بجے دن انتقال کر گئے۔ ان کی وفات پر خضر تمیمی نے یہ تعزیتی نظم لکھی۔ جسے حافظ خدا بخش صغیر (جو چنیوٹ کی ایک معروف ادبی شخصیت تھے) نے 1930ء میں 'حیات ناظم و وفات ناظم' کے عنوان سے بروشر مرتب کیا اور اس میں تعزیتی نظم شائع کی۔

37. اپنے ایک قطعہ میں اکبر الٰہ آبادی نے سر سید احمد خان کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ خضر تمیمی نے اس قطعہ کا چوتھا مصرع بطور تضمین استعمال کیا ہے۔ مکمل اشعار یوں ہیں۔

سر سید بڑے کام کرنے والے تھے

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا ہے — نہ بھولو فرق، جو ہے کہنے والے، کرنے والے میں

کہے جو چاہے کوئی، میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر — ''خدا بخشے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں''

38. یہ تعزیتی نظم پنجاب کی معروف سیاسی شخصیت 'سر فضل حسین' کی وفات پر لکھی گئی۔ جو تحصیل لالیاں کے رسالہ، اتحاد زمینداراں، چنیوٹ شمارہ جون/جولائی 1936ء صفحہ 4 پر شائع

ہوئی۔ اس نظم کے پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں 'مثل' کو قافیہ میں غلط تلفظ سے باندھا گیا ہے۔ اصل تلفظ مثل ہے مگر شاعر نے مثَل باندھا ہے۔ دسویں شعر کے دوسرے مصرعے میں قلمی تحریر میں 'مدعی ہزار ہو' لکھا ہے جبکہ یہاں 'ہوں' ہونا چاہیے۔ متن میں یہ قیاسی تصحیح کی گئی ہے۔

39. انصاری اور شفیع دونوں خضر تمیمی کے قریبی دوست تھے یہ ان کی وفات پر غمزدہ رہتے تھے۔

40. ترجمہ:۔ زمانہ ہر لحہ ایک نیا داغ جگر رکھتا ہے یعنی غم واندوہ سے دوچار کرتا ہے۔ ایک زخم اچھا نہیں ہوتا کہ دوسرا زخم دے دیتا ہے۔ یعنی پے در پے رنج و غم سے دوچار کرتا ہے۔

41. یہ تعزیتی نظم خضر تمیمی کے کاغذات سے قلمی تحریر کی صورت میں دستیاب ہوئی۔ فرخ محمود لودھی پاک آرمی میں لیفٹینینٹ تھے۔ جو 8 دسمبر 1948ء کو پیدا ہوئے اور 8 دسمبر 1971ء کو پاک بھارت جنگ میں پونچھ سیکٹر پر جام شہادت نوش کیا۔ ان کے والد کا نام رفیق احمد خان لودھی تھا۔ یہ خضر تمیمی کے چھوٹے بیٹے ساجد نعیم تمیمی کے دوست تھے جو آؤٹ فال روڈ لاہور میں رہائش پذیر تھے۔ ساجد نعیم تمیمی نے اپنے دوست کی وفات پر اپنے والد سے یہ نظم لکھوائی۔ اسی لیے مقطع میں ساجد لکھا گیا ہے۔ دوسرے شعر کا پہلا لفظ 'اجر' کا تلفظ غلط باندھا گیا ہے۔ چوتھے شعر کے دوسرے مصرع میں 'نہیں اکثر کہیں ہوتا' غلط باندھا گیا ہے۔ راقم کے خیال میں درست ترتیب 'کہیں اکثر نہیں ہوتا' ہے۔ اسی ترتیب کو متن کا حصہ بنایا گیا ہے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے قافیے کی مجبوری کی وجہ سے ایسا کیا ہے ورنہ مفہوم کے لحاظ سے 'کہیں' کی جگہ 'نہیں' آنا چاہیے۔ اس طرح مصرع کی روانی بڑھ جاتی ہے۔

42. خضر تمیمی کے اس مناظرہ کی قلمی تحریر راقم کو جھنگ کی ادبی شخصیت حکمت ادیب سے دستیاب ہوئی۔ یہاں 139 اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ یہ مناظرہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے ادبی مجلہ 'کریسنٹ' کے سالنامہ 1930ء صفحہ 96 تا 98 پر شائع ہوا۔ یہاں 149 اشعار ہیں۔ راقم نے زیادہ تعداد اور مطبوعہ صورت کے پیش نظر متن میں 'کریسنٹ' میں شائع شدہ اشعار کو شامل کیا ہے۔ غالب گمان ہے کہ اس رسالہ میں یہ مناظرہ بھجواتے وقت خضر تمیمی نے مزید دس اشعار شامل کر دیئے تھے۔

43. یہ مصرع قلمی تحریر میں یوں لکھا ہوا ہے ع کہاں ٹھنڈی سڑک لاہور کے لائیں گے نظارے۔ یہ مصرع شعر میں روانی پیدا نہیں کرتا

44. قلمی تحریر میں 'بانہوں میں بانہیں' لکھا ہے۔ قافیہ کی مناسبت سے یہ املا درست نہیں ہے۔

45. قلمی تحریر میں 'رک رک' کی بجائے 'رہ رہ' لکھا ہوا ہے۔ وزن کے اعتبار سے یہ دونوں مساوی ہیں مگر 'رک رک' رواں ہے۔ قیاس ہے کہ خضر تمیمی نے ان الفاظ کو خود تبدیل کیا ہے۔

46. قلمی تحریر میں یہ شعر ترتیب کے لحاظ سے نویں نمبر پر ہے اور پہلے مصرعے میں قافیہ کے بعد 'تھا' ردیف نہیں ہے۔ گمان ہے کہ ان سے سہو ارہ گیا ہے لیکن متن میں تصحیح کی گئی ہے۔

47. یہ شعر قلمی تحریر میں شامل نہیں ہے۔

48. قلمی تحریر میں یہ مصرع یوں ہے ۔ ع نہایت تیز ادھر سے آ رہی تھی مست اک موٹر 'کریسنٹ' میں شامل مصرع نسبتاً فصیح معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ سے متن میں تبدیلی نہیں کی گئی۔

49. یہ شعر قلمی تحریر میں شامل نہیں ہے۔

50. قلمی تحریر میں 'باؤلی' کی بجائے 'بانوری' ہے۔ مفہوم کے لحاظ سے 'باؤلی' موزوں محسوس ہوتا ہے۔ اس شعر کی تقطیع کے دوران 'یسوع' کی ع گرادی گئی ہے۔

51. اس شعر کا دوسرا مصرع قلمی تحریر میں یوں ہے۔ ع بتا تیرا نہ کیوں چالان ہو آوارہ گردی میں۔ وزن کے لحاظ سے یہ بھی درست ہے مگر متن میں شامل مصرع میں زیادہ روانی پائی جاتی ہے۔

52. قلمی تحریر میں 'نیچر' کی بجائے 'پنچر' ہے۔ اس مصرع کا مفہوم لفظ 'پنچر' سے واضح ہوتا ہے۔ اس لئے اس لفظ کو درست مان کر متن میں شامل کیا گیا ہے۔

53. قلمی تحریر کے مطابق اس مصرع میں 'پہ' کی بجائے 'پر' لکھا ہے۔ راقم کے خیال میں وزن کے لحاظ سے 'پہ' درست ہے۔

54. قلمی تحریر میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔ کریسنٹ میں اس شعر کے دوسرے مصرعے میں 'صدقہ' ہے جبکہ لفظ 'صدقے' سے معنی واضح ہوتے ہیں۔ یہ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے۔

55. یہ فارسی ضرب المثل ہے۔ علمی اردو لغت (جامع) میں وارث سرہندی نے صفحہ نمبر 1595 پر اس ضرب المثل کو 'ہمیں چوگاں' ہمیں میداں' ہمیں گو' لکھا ہے۔ اسی کے ساتھ 'ہمیں گو، ہمیں چوگاں' بھی درج ہے۔ اس سے مراد ہے: یہی مقابلے کی جگہ ہے۔ یہیں آزمائش ہو جائے۔ شاعر نے معمولی تحریف کر کے مصرع میں سمویا ہے۔ قلمی تحریر میں یوں ہے۔ ''ہمیں چوگاں ہمیں گو'' آ تو ان کی گرد تو پالے۔

56. یہ مکمل شعر قلمی تحریر میں یوں درج ہے۔

حقیقت میں یہ بیٹا سائیکل بچہ ہے گوکل کا　　چچا لیکن ہے تیزی میں یہ پرواز تخیل کا

57. قلمی تحریر میں 'ہیز' کی بجائے 'چیز' ہے جو کہ مفہوم کے مطابق نہیں ہے۔ یہ شاعر کی املا کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

58. اس فارسی عبارت کا ترجمہ ہے: میں اپنے راستے کا چراغ خود جلاتا ہوں۔

59. اس شعر کے دوسرے مصرعے کے لفظ 'پستی' کو قلمی تحریر میں 'سُستی' لکھا ہے۔ مفہوم اور تجنیس کے لحاظ سے 'سُستی' درست ہے اس لئے متن میں شامل کیا گیا ہے۔ نیز یہ شعر ترتیب کے لحاظ سے اگلے شعر کے بعد لکھا گیا ہے۔

60. قلمی تحریر میں یہ شعر اوپر والے شعر سے پہلے لکھا گیا ہے۔ پہلے مصرع میں موجود لفظ قلمی تحریر میں 'کھنکھارا' ہے جو کہ املا میں درست ہے مگر وزن میں کھٹکتا ہے۔

61. 'کریسنٹ' میں فارسی مصرع اس طرح ہے: ثنائے خود بخود گفتن نزیبدم ودانارا۔ اس مصرع سے کوئی بامعنی مفہوم متعین نہیں ہوتا۔ راقم کے نزدیک یہ کتابت کی غلطی ہے۔ قلمی تحریر میں یہ فارسی مصرع اس طرح ہے: ثنائے خود بخود گفتن نزیبد مرد دانا را۔ جو کہ درست ہے اس لئے یہ متن میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ ہے: خودستائی عقل مند آدمی کو زیب نہیں دیتی۔

62. قلمی تحریر میں یہ مصرع یوں ہے۔ سمجھتی ہوں کہ تو اب کے ہوئی ہے فیل ایف۔ اے میں۔

63. قلمی تحریر میں اس لفظ کی املا 'مجکو' ہے مگر وزن کے لحاظ سے 'مجھ کو' درست ہے۔ اس لئے اسے متن میں شامل کیا گیا۔ ہے۔

64. یہ شعر قلمی تحریر میں شامل نہیں ہے۔

65. فیلسوفونگی سے مراد 'فلسفیوں' کی ہے۔ یہ مکمل شعر قلمی تحریر میں شامل نہیں ہے۔

66. یہ شعر قلمی تحریر میں شامل نہیں ہے۔

67. ایضاً

68. ایضاً۔ یہ علامہ اقبال کا شعر ہے جو 'بانگ درا' کی ایک غزل میں شامل ہے۔ بحوالہ 'کلیاتِ اقبال' (اردو)، پورا شعر اسی طرح ہے۔

محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

69. یہ شعر قلمی تحریر میں شامل نہیں ہے۔

70. ایضاً

71. قلمی تحریر میں دوسرا مصرع یوں ہے: ع وہ تھا شوخ کہ خواہاں تھا، ملے یاں آسرا کوئی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے بعد میں اس مصرع میں خود ردوبدل کیا ہے۔

72. قلمی تحریر کے مطابق دوسرے مصرعے میں 'چارہ' قافیہ ہے جو کہ درست ہے کیونکہ چارہ کے معنی 'فرہنگ فارسی' صفحہ 267، فرہنگ عامرہ، صفحہ 200 اور فرہنگ تلفظ، صفحہ 397 پر 'تدبیر، علاج' کے ہیں جو مصرع کے معنی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ فرہنگ تلفظ، صفحہ 397 پر 'چارا' کے معنی گھاس یا چری کے ہیں جو مویشیوں کو کھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ یہ لفظ مصرع میں معنویت پیدا نہیں کرتا۔ اس لفظ کی یہ املا غلط ہے جس سے معنی میں ابہام پیدا ہوا ہے۔ یہاں شاعر نے 'بے' دن کے معنی میں استعمال کیا ہے

73. قلمی تحریر میں دوسرے مصرع میں 'بیلوں کو پھر ہانکا' کی بجائے 'بیلوں کو دے ہانکا' ہے۔ یہ درست ہے اس سے مصرع رواں ہو جاتا ہے۔

74. قلمی تحریر میں دوسرا مصرع اس طرح ہے: پکڑ کر لائے جو چوٹی سے نافرمان دختر کو۔

75. اس مناظرہ کے 66 اشعار، اسلامیہ کالج لاہور کے ادبی مجلّہ 'کریسنٹ' کے شمارہ نومبر 1931ء صفحہ 16 تا 19 پر شائع ہوئے ہیں۔ اور اس کا عنوان ''مناظرہ حقہ وسگرٹ'' لکھا ہے۔ ''شعرائے پنجاب'' مرتبہ نسیم رضوانی و ملک محمد باقر میں 66 اشعار صفحہ 251 تا 256 شائع ہوئے۔ انہوں نے اس کا عنوان ''مناظرہ حقہ وسگرٹ'' ہی لکھا ہے۔ ''اردو کی ظریفانہ شاعری'' مرتبہ فرح علی میں 65 اشعار صفحہ 70 تا 72 شائع ہوئے۔ انہوں نے اس کا عنوان ''حقہ اور سگرٹ کا مناظرہ'' لکھا ہے۔ ہفت روزہ ''شیرازہ'' لاہور شمارہ 23 ستمبر 1936ء میں اشعار کی تعداد 66 ہے۔ راقم کو خضر تمیمی کی یہ قلمی تحریر حکمت ادیب سے دستیاب ہوئی۔ یہاں اشعار کی تعداد 58 ہے اور عنوان ''حقے اور سگرٹ کا مناظرہ'' تحریر ہے۔ متن میں قلمی تحریر کے عنوان کو درست تسلیم کر کے شامل کیا گیا ہے۔ تاہم زمانی ترتیب اور زیادہ اشعار کے پیش نظر 'شیرازہ' میں شامل اشعار کو متن کا حصہ بنایا گیا ہے۔

76. ''شعرائے پنجاب'' اور ''کریسنٹ'' شمارہ نومبر 1931ء میں یہ مصرع یوں ہے۔ ع بہر سو خوف تھا خاموشیوں میں۔ قلمی تحریر میں اس طرح لکھا گیا ہے:

عجیب کچھ خوف تھا خاموشیوں میں

77. دوسرے مصرے کے لفظ 'اٹھا' کو قلمی تحریر اور کریسنٹ، شمارہ نومبر 1931ء میں 'ہٹا' لکھا گیا ہے یہی لفظ موزوں ہے کیونکہ قافیہ سے مطابقت رکھتا ہے۔

78. پہلے مصرعے کے لفظ 'حقہ' کو قلمی تحریر میں 'حقے' لکھا گیا ہے۔ یہ مصرع میں بوجھل محسوس ہوتا ہے۔ قلمی تحریر میں اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح ہے: مری اولاد ہو قربان تجھ پر۔ لیکن 'کریسنٹ' میں باقی مصرع متن کے مطابق ہے جبکہ 'تم' کو 'تجھ' لکھا ہوا ہے۔ 'تجھ' کا لفظ ثقیل ہے اس لئے 'تم' بہتر ہے۔

79. 'اردو کی ظریفانہ شاعری' میں پہلے مصرعے کا لفظ 'کو' کی بجائے 'تو' ہے۔ یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مصرع میں یہ لفظ کسی مفہوم کو واضح نہیں کرتا۔

80. شعرائے پنجاب، کریسنٹ، اردو کی ظریفانہ شاعری اور قلمی تحریر میں 'نشستہ' کی بجائے فروزاں لکھا ہے۔

81. مصرع ثانی میں قلمی تحریر کے مطابق 'کیسی' کی بجائے 'کتنی' ہے جو کہ درست ہے اس لئے مطلع میں 'کتنی' لکھا گیا ہے۔

82. یہ فارسی شعر تضمین کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ 'اردو کی ظریفانہ شاعری' میں یہ مکمل شعر موجود نہیں ہے جبکہ شعرائے پنجاب، کریسنٹ اور قلمی تحریر میں 'سرو بیئیت' کی بجائے 'رخ و بیئیت' ہے: ترجمہ۔ تو اس قابل بھی نہیں کہ شریف آدمی تجھ پر قربان کیا جائے۔ دونوں مرکبات بامعنی ہیں مگر متن میں شامل نسبتاً موزوں ہے۔

83. پہلے مصرع میں قلمی تحریر کے مطابق 'تناسب' اور 'دیکھنا' کے درمیان لفظ 'کا' ہے یعنی تناسب کا دیکھنا اعضا کا میرے۔ اس میں 'کا' زائد معلوم ہوتا ہے۔

84. کریسنٹ اور شعرائے پنجاب میں 'تمہا کو' کو 'تما کو' لکھا گیا ہے۔ یہ وزن کے لحاظ سے درست ہے اس لئے متن میں 'تما کو' لکھا گیا ہے۔ دوسرے مصرع میں شعرائے پنجاب اور قلمی تحریر میں ''کہیں'' کی بجائے ''نہاں'' لکھا گیا ہے۔ جبکہ میرے خیال میں موزوں لفظ ''کہیں'' ہے۔

85. قلمی تحریر میں یہ شعر ترتیب کے لحاظ سے متن کے شعر نمبر 20 کے بعد شامل کیا گیا ہے۔

86. یہ فارسی شعر بطور تضمین شامل ہے۔ قلمی تحریر میں دوسرا مصرع 'بروکایں نو بہ مایاں ست اکنوں' ہے جبکہ راقم کے خیال میں بروکہ ایں بہ مایاں است اکنوں۔ درست ہے اس شعر کا ترجمہ ہے: مجنوں کی تگ و دو کا زمانہ گزر گیا۔ جا کہ اب ہماری باری ہے۔

87. قلمی تحریر میں 'حقہ' کی بجائے 'حقے' لکھا ہوا ہے۔ یہ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے۔

88. قلمی تحریر میں اس شعر کی ترتیب یوں ہے:

عجب دلکش ادا سے مسکرایا عجب دلکش نوا سے گڑگڑایا

اس شعر میں 'صدا' اور 'گڑگڑانا' کی آپس میں نسبت ہے۔ اس لئے 'صدا' کا لفظ ہی موزوں ہے۔

89. قلمی تحریر میں اس یہ شعر اس طرح ہے:

لگا کہنے وہ سگرٹ سے کہ منے بھلا دیکھو ہیں منہ میں دانت کتنے

مفہوم اور قافیہ کے اعتبار سے 'کتنے' درست ہے۔ 'شیرازہ' میں 'گئے' لکھا ہے جو موزوں نہیں ہے۔

90. یہ شعر قلمی تحریر میں شامل نہیں ہے۔

91. ایضاً۔

92. ایضاً۔

93. اس شعر کے بعد قلمی تحریر میں یہ شعر شامل ہے

ستارہ صبح کا تُو، مہر ہوں میں تُو اک ناچیز قطرہ، بحر ہوں میں

اس شعر کو متن میں شامل کیا گیا ہے۔

94. قلمی تحریر میں اس شعر کے پہلے مصرعے میں 'تمہیں' کی بجائے 'تجھی' ہے۔ وزن اور روانی کے مطابق 'تمہیں' درست ہے۔

95. قلمی تحریر میں 'فروزاں' کی بجائے 'درخشاں' ہے چاند اور ستاروں کے لئے 'فروزاں' صنعت تجنیس کے موافق ہے۔

96. قلمی تحریر میں پہلے مصرعے کی لفظی ترتیب یوں ہے: گلے میں ہار یہ میرے نہیں ہیں۔ یہ مصرع درست اور رواں ہے۔ دوسرے مصرع میں قافیہ 'نگاہ' لکھا گیا ہے۔ اس شعر میں 'نہیں' اور 'نگاہ' کا قافیہ نہیں بنتا۔ اس کی بجائے 'تارنگیں' درست ہے۔ یہ راقم کی قیاسی تصحیح ہے۔ اس شعر کے بعد قلمی تحریر میں فارسی شعر درج ہے۔ جسے متن میں شامل کیا گیا ہے۔

چوں سرو ناز من افراخت قامت جہاں پر شد ز غوغائے قیامت

97. ترجمہ: اس حسینہ کے ہاتھ میں کالی چوڑی یوں محسوس ہوتی تھی جیسے صندل کی ٹہنی کے گرد سانپ لپٹا ہو۔

98. یہ شعر قلمی تحریر میں شامل نہیں ہے۔

99. ایضاً۔

100. اس دوسرے مصرعے کی قلمی تحریر میں لفظی ترتیب اسی طرح ہے: کبھی پیتے تمباکو ان کو تم سے

101. دوسرے مصرعے میں قلمی تحریر کے مطابق اسے کی بجائے 'اسے' ہے۔ راقم کے خیال میں یہ کتابت کی غلطی ہے۔

102. یہ شعر قلمی تحریر میں شامل نہیں ہے۔

103. قلمی تحریر کے مطابق اس شعر کے پہلے مصرعے میں 'دل' کی بجائے 'لَو' ہے۔ دونوں کا وزن اور روانی یکساں ہے۔ دوسرے مصرعے میں 'مراسم' کی بجائے 'نمائش' کا لفظ لکھا ہوا ہے جو کہ مفہوم کے مطابق درست نہیں ہے۔ صحیح لفظ 'مراسم' کو متن میں شامل کیا گیا ہے۔

104. یہ شعر قلمی تحریر میں شامل نہیں ہے۔

105. ایضاً۔

106. ایضاً۔

107. قلمی تحریر کے مطابق پہلے مصرعے میں 'جان بابا' کی بجائے 'جان ماموں' ہے۔

108. اس مناظرہ کے ماہنامہ 'رومان' لاہور، شمارہ فروری 1937ء میں 65 اشعار شائع ہوئے۔ قلمی تحریر میں اشعار کی تعداد 55 ہے۔ اس تعدادی اختلاف کی وجہ سے 'رومان' میں شامل اشعار کو متن میں لکھا گیا ہے۔

109. اس سے مراد نذر محمد راشد ہیں جو شعر و ادب کی دنیا میں ن۔م۔ راشد کے نام سے معروف ہوئے۔

110. قلمی تحریر کے مطابق پہلے مصرع میں 'مکئی' کی بجائے 'مکی' لکھا گیا ہے یہ شاعر کا تصرف معلوم ہوتا ہے جب کہ مفہوم کے لحاظ سے اس لفظ کی درست املا 'مکئی' ہے۔

111. اسی نظم میں ع صد جلوہ روبرو ہو، جو مژگاں اٹھائیے۔ یہ غالب کے شعر کا مصرع ہے جو معمولی تحریف کے بعد تضمین کے طور پر شاعر نے استعمال کیا ہے۔ مکمل شعر یوں ہے:

صد جلوہ رُوبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

112. اس مصرع میں 'گرنے لگی جو بھاپ کے گولوں سے چائے' 'فیر میں' 'کرنے' لگانے سے مفہوم پورا ہو جاتا ہے۔ راقم نے قیاسی تصحیح کرتے ہوئے اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ 'فیر' دراصل انگریزی لفظ FIRE ہے جس کے معنی فائر کرنا، گولی مارنا کے ہیں۔

113. دوسرے مصرعے میں 'پاک من' ہے جبکہ صحیح لفظ 'پاک اُو' ہے۔ یہ مکمل شعر علامہ اقبال کا ہے جو 'کلیات اقبال' (فارسی)، پیام مشرق، لاہور اقبال اکادمی پاکستان، صفحہ 335 پر یوں ہے۔

آمیزشے کجا گہر پاک او کجا　　　ازتاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

دوسرے مصرعے کو شاعر نے تضمین کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ترجمہ: کہاں زندگی کا پاک گہر اور کہاں اس میں کسی شے کی آمیزش۔ میں تو انگور کی بیل سے (راست) شراب لیتا ہوں اور پیالے میں ڈالتا ہوں۔

114. مصرع میں 'یوں' کی بجائے [جونہی] کی قیاسی تصحیح سے مصرع کا وزن درست ہو جاتا ہے اور شعر کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ع جلتا ہے تیل جن سے یوں آپ کا چراغ

اس مصرع کے الفاظ کی ترتیب میں گڑبڑ ہے اور مفہوم بھی غیر واضح ہے۔ قیاسی تصحیح کرتے ہوئے مصرع متن میں شامل کیا گیا ہے۔

115. یہ مناظرہ ماہنامہ 'رومان' لاہور، شمارہ مئی 1937ء، صفحہ 84 تا 86 پر شائع ہوا۔

116. Lara، Dora یہ انگریز عورتوں کے فرضی اور Billie (بلّی) انگلستان میں مردوں کا عام نام ہے۔ یہ وضاحت ماہنامہ 'رومان' لاہور، صفحہ 84 پر دی گئی ہے۔

117. علامہ اقبال کے شعر کا مصرع ہے۔ پورا شعر یوں ہے جو شعری مجموعہ ''بانگ درا'' کی نظم 'شکوہ' میں شامل ہے۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

118. Punch۔ لندن کا قدیم مزاحیہ اخبار ہے جو 17 جولائی 1841ء کو جاری ہوا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر کا نام Mark Lemon تھا۔ بحوالہ ڈاکٹر فوزیہ چودھری 'اردو کی مزاحیہ صحافت' صفحہ 80۔

119. Miss Menu۔ کھانے کی فہرست کو Menu کہتے ہیں۔ خضر تیمی نے مزاح پیدا کرنے کے لیے مونث بنا کر مشخص کیا ہے۔ شعر میں اس کا تلفظ (منو) پڑھا جائے گا۔ تو اس طرح وزن پورا ہوگا۔

120. یہ مصرع تضمین کے تحت استعمال ہوا ہے جو علامہ اقبال کے شعری مجموعہ ''بانگ درا'' کی نظم 'شکوہ' سے لیا گیا ہے۔ مکمل شعر اس طرح ہے

عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن　　　اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

121. ترجمہ: مرنے مارنے کا شور نہ دل سے اٹھا۔

122. ترجمہ: افسوس کہ پلک جھپکنے میں صحبت یار ختم ہو گئی۔ہم نے جی بھر کر پھول کا چہرہ بھی نہ دیکھا کہ بہار ختم ہو گئی۔

123. یہ مناظرہ ماہنامہ'رومان'لاہور،شمارہ ستمبر 1937ء صفحہ 76 تا 80 پر شائع ہوا۔اشعار کی تعداد 43 ہے۔راقم کو حکمت ادیب سے خضر تمیمی کی یہ قلمی تحریر دستیاب ہوئی۔اس میں بھی اشعار کی تعداد 43 ہے۔متن میں قلمی تحریر کو ترجیح دی گئی ہے۔قلمی تحریر میں لفظ'حیث' لکھا ہوا ہے۔جب کہ درست املا'ہیٹ' ہے جو متن میں شامل ہے۔

124. قلمی تحریر میں پہلا مصرع اسی طرح ہے:احباب !جو آنکھوں نے مری دیکھا تماشا۔ ماہنامہ'رومان'میں شامل مصرع رواں ہے اسے متن میں شامل کیا گیا ہے۔

125. 'رومان' نے مصرع اول میں'بچاتی' کو'چھڑاتی' لکھا ہے جو کہ درست ہے اس لئے متن میں درج کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس شعر میں دفعہ چونتیس کی وضاحت انعام الحق (میاں)،مجموعہ تعزیرات پاکستان،باراول،لاہور،منصور بک ہاؤس،1991،صفحہ 24 میں یوں کی گئی ہے:''مشترک ارادہ کی تکمیل میں بہت سے اشخاص کی طرف سے سرزد کردہ افعال یعنی جب بہت سے اشخاص نے،سب کے مشترک ارادہ کی تکمیل میں کوئی مجرمانہ فعل کیا ہو تو ایسے اشخاص سے ہر ایک اسی طرح اس فعل کا مستوجب ہوگا گویا کہ صرف اس نے اسے سرزد کیا ہے''۔

126. ''رومان''میں یہ شعر صفحہ 77 پر اس طرح شائع ہوا ہے:

گر پاس نہ ہو کوڑی پہ دولت بھی ہو درکار — اور نوکری تجکو کوئی دیتی نہ ہو سرکار
دھر،سر پہ مجھے،اور نہ بن صورتِ درویش — لے نام خدا،ٹانگا منگا کر،نہ پس و پیش

127. دوسرے مصرعے کے شروع میں'تُو' کا لفظ'رومان'میں نہیں ہے۔

128. خضر تمیمی نے خوشی محمد ناظر کی نظم'جوگی اور ناظر' کی پیروڈی لکھی ہے جو نقوش،طنز و مزاح نمبر 1959ء،صفحہ 829 تا 832 پر 30 اشعار،روزنامہ امروز،لاہور،شمارہ 20 فروری 1977ء صفحہ 3 پر 14 اشعار،اردو مزاحیہ شاعری مرتبہ سرفراز شاہد،1991ء صفحہ 88 تا 89 پر 21 اشعار۔شہرلب دریا از ڈاکٹر محمد امجد ثاقب،1993ء صفحہ 175 تا 177 پر 19 اشعار بعنوان'سارنگی اور طبلہ'شائع ہوئے۔اردو کی ظریفانہ شاعری مرتبہ فرح علی،1996ء صفحہ 67 تا 70 پر 30 اشعار بعنوان'مناظرہ ء سارنگی و طبلہ' شامل ہوئے۔غبار کارواں مرتبہ پروفیسر محمد حیات خان سیال،

1979ء صفحہ 14 تا 17 پر 30 اشعار بعنوان 'طبلہ اور سارنگی' شامل ہیں۔ زیادہ اشعار اور زمانی ترتیب کے پیشِ نظر نقوش میں شامل اشعار کو متن میں لکھا گیا ہے۔ باقی کو اختلاف متن کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ یہاں عنوان کے تحت اختلاف کی وضاحت ضروری ہے۔ اس مناظرہ میں مضمون کے اعتبار سے سارنگی کا مکالمہ پہلے اور طبلہ کا بعد میں ہے۔ اس لئے درست عنوان 'سارنگی اور طبلہ' ہے اردو کی ظریفانہ شاعری' مرتبہ فرح علی نے مضمون کی نوعیت کے پیشِ نظر لفظ 'مناظرہ' کا خود اضافہ کیا ہے۔

129. اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ 67 پر مصرع ثانی میں 'گھبرائی' کی جگہ 'رنگ لائی' لکھا ہے۔

130. اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ 67 پر مصرع اول میں 'اشکوں' کی بجائے 'شکوے' ہے۔ اردو مزاحیہ شاعری، میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔

131. اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ 67 پر مصرع اول کے لفظ 'پھواریں' کو 'پھہاریں' لکھا گیا ہے جبکہ لفظ کی درست املا اور استعمال 'پھواریں' ہے۔ بحوالہ فرہنگ تلفظ، صفحہ 266۔

132. اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 88 پر پہلے مصرعے کے لفظ 'تھی' کو 'تھیں' لکھا گیا ہے۔ 'اردو کی ظریفانہ شاعری' صفحہ 67 پر دوسرے مصرعے کو یوں لکھا گیا ہے۔

ع اس حال میں بیچ میں دونوں کے جا بیٹھا شاعر مستانہ

جبکہ یہ مکمل شعر روزنامہ امروز میں نہیں ہے۔

133. دوسرے مصرع میں 'طبلے' کا لفظ 'غبار کارواں' میں شامل نہیں ہے۔

134. 'غبار کارواں' صفحہ 15 پر پہلے مصرع میں 'کوے سے' کو 'کوے جیسی' لکھا گیا ہے۔ اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 88 پر دوسرے مصرع میں 'کے' کو 'سے' تحریر کیا گیا ہے۔

135. اردو کی ظریفانہ شاعری، میں دوسرا مصرع یوں درج ہے:

ع میں گودوں بیٹھی پلتی ہوں، تم سر اپنا پٹواتے ہو

136. 'شہرِ لب دریا' صفحہ 176 پر پہلے مصرع میں 'خام' کی بجائے 'کام' اور دوسرے مصرع میں 'یاں' کی بجائے 'یا' لکھا ہوا ہے۔ یہ مکمل شعر اردو مزاحیہ شاعری اور روزنامہ امروز لاہور میں شامل نہیں ہے۔

137. روزنامہ 'امروز' لاہور، شمارہ 20 فروری 1977ء صفحہ 3 پر پہلے مصرع میں شامل لفظ 'کنھیا' کو 'کینا' لکھا ہے۔ دوسرے مصرع میں 'مردک' کی بجائے 'مردکہ' لکھا ہے۔ اردو مزاحیہ

شاعری میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔ درست الفاظ 'کھیا' اور 'مردک' ہیں۔ 'کھیا' سے مراد خوب صورت، حسین کے ہیں اور 'مردک' فاری کا لفظ ہے۔ اس سے مراد حقیر اور ذلیل آدمی کے ہیں۔ جبکہ 'مونڈی کاٹے' سے مراد واجب القتل اور سر کٹا کے ہیں۔

138. اردو کی ظریفانہ شاعری، میں پہلے مصرع میں شامل لفظ 'کہیں' کی بجائے 'ترا' ہے۔ امروز اور اردو مزاحیہ شاعری میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔ اس مصرع میں 'کہیں' درست ہے۔ دوسرے مصرع میں 'سے' کے بعد 'باہر' کا لفظ موزوں ہے۔ آپے سے باہر ہونا، محاورہ ہے اور محاورے کے الفاظ اہل زبان کے مطابق تبدیل نہیں کئے جا سکتے۔ اصل تحریر میں 'کیوں' سے پہلے 'باہر' ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

139. اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 88 پر پہلا مصرع یوں ہے:

ع ناز وں سے پلی شہزادی ہوں، ناری ہوں، محلوں والی ہوں۔ یہ پورا شعر روز نامہ امروز لاہور میں شائع نہیں ہوا۔

140. اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 88 پر پہلے مصرعے میں لفظ 'کا' کو 'سے' لکھا ہے۔ غبار کارواں، صفحہ 16 پر دوسرے مصرعے میں 'بھابھی' کو 'بھابی' لکھا ہے۔ فرہنگ تلفظ مرتبہ شان الحق حقی نے صفحہ 196 پر اس لفظ کی املا 'بھابی' لکھا ہے۔ یہی املا درست ہے۔

141. مصرع اول میں لفظ 'پر' کی بجائے غبار کارواں' صفحہ 16 پر 'پہ' لکھا ہے۔

142. اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ 69 پر مصرع اول اس طرح ہے:

ع عشق سے یوں منہ پھیرا کیوں، پھر تو نے ہمیں آ گھیرا کیوں

لکھا ہے اردو مزاحیہ شاعری، اور روز نامہ امروز، لاہور میں یہ شعر نہیں ہے۔

143. روز نامہ امروز لاہور، شمارہ 20 فروری 1977 میں یہ شعر درج نہیں ہے۔ اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 88 پر اور اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ 69 پر پہلے مصرع کے لفظ 'زنجبار' کی بجائے 'زنجیبار' لکھا ہے دوسرے مصرعے میں 'دہاڑ' کی املا 'دھاڑ' لکھا ہے۔ راقم کے خیال میں میں زنجبار یا زنجیبار دونوں درست ہیں کیونکہ یہ کسی ملک قدیم کا نام ہے اور نام میں معمولی ردوبدل کو اس حد تک درست تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ اصل معنی تبدیل نہ ہوں۔ تاہم شعری ضرورت کے تحت بھی معمولی تصرف کر لیا جاتا ہے مگر دوسرے مصرع میں لفظ 'دھاڑ' درست ہے کونکہ 'دھ' کو حرف تسلیم کیا جاتا ہے۔ فرہنگ تلفظ، صفحہ 540 پر بھی درست املا 'دھاڑ' ہی ہے۔ 'دہاڑ' کو صرف تصرف کہا جا سکتا

ہے اور ضرورت شعری کے تحت یہ درست ہے۔

144. اردو مزاحیہ شاعری، میں ~~شعر یوں~~ یوں ہے اسے متن میں شامل کیا گیا ہے۔

تو پریم کنہیا، محفل میں کس بے باکی سے گاتی ہو

گویا یوں تم بھولی بھالی ہو، کچھ کہتے بھی شرماتی ہو

145. روز نامہ امروز، لاہور، شمارہ 20 فروری 1977، صفحہ 3 پر دوسرا مصرع یوں درج ہے:

ع ہم راہ پہ تجھ کو لاتے ہیں، لے سے جھنک سی جاتی ہو

یہ مکمل شعر اردو کی ظریفانہ شاعری، میں شامل نہیں ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرع بھی ناموزوں ہے۔

146. اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ 69 پر مصرع ثانی یوں لکھا گیا ہے:

ع طاؤس کو، طنبورے کو، تجھے دن میں تارے دکھلاتا ہوں

اردو مزاحیہ شاعری اور روز نامہ امروز، لاہور، شمارہ 20 فروری 1977 میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔ اس مصرع میں 'تجکو' کی درست املا 'تجھ کو' ہے۔

147. اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 89 پر پہلے مصرع کے لفظ 'مبادا' کو 'مبادہ' لکھا گیا ہے۔ راقم کے خیال میں سہو کاتب ہے۔ اس لفظ کی درست املا فرہنگ تلفظ، صفحہ 833 پر 'مُبادا' ہے۔ اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ 70 پر دوسرے مصرع کے لفظ 'تڑپا' کی بجائے 'سسکتا' لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ 'یاں' کی بجائے 'اور' ہے۔ روز نامہ امروز میں یہ شعر نہیں ہے۔

148. اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ 70 پر سہو کاتب کی وجہ سے 'چکار کے' کو 'چکارے' لکھا گیا ہے اور دوسرے مصرع میں 'انجانوں' کی بجائے 'گنواروں' لکھا ہے۔ روز نامہ امروز لاہور میں یہ شعر درج نہیں ہے۔

149. اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ 70 پر دوسرے مصرع کا لفظ 'لہروں' کی بجائے 'نہروں' لکھا گیا ہے۔ راقم کے خیال کے مطابق یہ سہو کاتب ہے۔ روز نامہ امروز لاہور کے شمارہ 20 فروری 1977 میں یہ شعر نہیں ہے۔

150. اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ 70 پر دوسرا مصرع یوں ہے: گر شہزادوں کی ایسی بولی ٹھولی ہو۔ شہر لب دریا، اور روز نامہ امروز، لاہور میں یہ شعر نہیں ہے۔

151. غبار کارواں، صفحہ 17 پر دوسرے مصرع میں 'زباں اپنی' کی بجائے 'اپنی زباں' لکھا ہے۔ اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 89 اور شہر لب دریا، صفحہ 177 پر دوسرا مصرع یوں ہے:

ع یوں جیسے کسی نے زباں اپنی کوثر کے آب میں دھولی ہو

اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ نمبر 70 پر یہ مصرع یوں ہے:

یوں جیسے کسی زباں اپنی کوثر کے آب میں دھولی ہو

152. روزنامہ امروز، لاہور، شمارہ 20 فروری 1977ء صفحہ 3 پر دونوں مصرعوں میں شامل 'نے' کے لفظ کو 'نہ' لکھا ہے۔ اردو کی ظریفانہ شاعری، صفحہ 70 پر دوسرے مصرعے میں دونوں جگہ 'نے' کو 'نہ' لکھا ہے۔ غبار کارواں، صفحہ 17 پر دوسرا مصرع یوں درج ہے:

ع نے تن تا تن تن تن تن تھی تے تا کڑ تا کڑ دھیا تھا۔ اس مصرع میں تین کی بجائے چار دفعہ متواتر 'تن' لکھا گیا ہے اور 'تے' راقم کی نظر میں 'نے' ہی ہے جو کہ سہو کاتب ہے۔

153. یہ فکاہی نظم ماہنامہ 'رومان' لاہور، شمارہ فروری 1936ء صفحہ 84 تا 85 پر شائع ہوئی۔

154. خضر تمیمی کی یہ قلمی تحریر حکمت ادیب سے دستیاب ہوئی۔ شاعر نے اس نظم میں ہیئت کا نیا تجربہ کیا ہے۔

155. یہ نظم مرزا رفیع سودا کے قصیدہ 'شہر آشوب' کی پیروڈی ہے۔ اس کا پہلا شعر 'کلیات سودا' صفحہ 344 پر یوں ہے۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیرو جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

شاعر نے اس پیروڈی کو 'کال کا سماں' عنوان دیا ہے۔ یہ نظم نقوش، طنز و مزاح نمبر 1959ء صفحہ 826 تا 829 پر شائع ہوئی جو مسدس ترکیب بند کی ہیئت میں ہے۔ اردو مزاحیہ شاعری مرتبہ سرفراز شاہد، صفحہ 91 پر تین بند شائع ہوئے۔ ماہنامہ خیالستان، شمارہ فروری 1930ء میں چار بند شائع ہوئے۔ زمانی ترتیب کے پیش نظر 'خیالستان' کے اشعار کو متن میں شامل کیا گیا ہے۔ یہاں اختلاف متن کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

156. ''اردو مزاحیہ شاعری'' میں متن میں شامل دوسرے بند کو تیسرے اور تیسرے بند کو دوسرے بند کی جگہ لکھا گیا ہے۔

157. ''اردو مزاحیہ شاعری'' میں یہ بند شامل نہیں ہے۔

158. خضر تمیمی نے علامہ اقبال کی معروف نظم ''شکوہ'' کی پیروڈی لکھی ہے۔ یہ پیروڈی مسدس ترکیب بند کی ہیئت میں ہے۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے ادبی مجلہ 'کریسنٹ

'شمارہ دسمبر 1930ء صفحہ 44 پر 'مرثیہ ءچلم' کے عنوان سے شائع ہوئی ۔ ماہنامہ 'رومان' لاہور، شمارہ مئی 1936ء صفحہ 92 تا 93 پر 'چلم کا مرثیہ' کے عنوان سے چھپی ۔ شہر لب دریا، صفحہ 187 تا 188 پر قلمی تحریر کا عکس شائع ہوا جس پر 9 مئی 1969ء کی تاریخ درج ہے ۔ راقم کو اس پیروڈی کی خضر تمیمی کی دستخط شدہ قلمی تحریر منظور نسیم تمیمی سے دستیاب ہوئی ہے ۔ اس پر 'چلم کا مرثیہ' عنوان دیا گیا ہے ۔ اس لئے قلمی تحریر کو متن میں شامل کیا گیا ہے ۔

159. ''کریسنٹ'' میں پہلا مصرع یوں ہے: بے پئے آج ہیں کالج میں بھٹکتے پھرتے
'قلیان' فارسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے 'حقے کا نیچا' ۔ 'کریسنٹ' صفحہ 44 پر یہ لفظ 'کلیاں' ہے جو کہ اپنے مفہوم اور مطلب کے لحاظ سے اس شعر میں موزوں نہیں ہے ۔

160. اس بند میں شاعر نے محقق کو 'حقہ پینے والے' کہا ہے ۔ کریسنٹ میں 'کرسیوں' کی بجائے 'ڈالیوں' لکھا ہوا ہے ۔ راقم کے خیال میں 'کرسیوں' موزوں لفظ ہے ۔ ماہنامہ 'رومان' لاہور میں ''اڑ گئے کرسیوں سے'' لکھا ہے ۔ کریسنٹ میں 'فغان وزاری' کی بجائے 'بکاوزاری' ہے ۔ دونوں ہم معنی مرکبات ہیں ۔

161. کریسنٹ میں 'عشاق چلم' کی بجائے 'عشاق سبھی' ہے راقم کے خیال میں 'عشاق چلم' موزوں ہے ۔ ماہنامہ 'رومان' لاہور، شمارہ مئی 1936ء صفحہ 92 پر چوتھا مصرع یوں ہے:

ع کھا گئی جس کی نظر تجکو اسے بھانپ گئے

کریسنٹ کے شمارہ 1930ء میں اس مصرع میں 'تجکو' کی بجائے معمولی تحریف کے ساتھ 'تجھکو' لکھا گیا ہے ۔ راقم کے نزدیک اس لفظ کی درست املا 'تجھ کو' ہے مگر مصرع میں 'تجکو' موزوں ہے ۔ اس بند کا پانچواں مصرع کریسنٹ، شمارہ 1930ء صفحہ 44 پر یوں ہے:

ع روڈ رولر ترے منہال سے دیدے پھوڑوں

متن میں منہال کی بجائے ہمنال ہے اس طرح کریسنٹ میں منہال اور رومان میں مہ نال ہے جبکہ اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے درست املا مہنال ہے ۔ علمی اردو لغت کے مولف وارث سرہندی نے صفحہ 1463 پر اس کے معنی ''وہ پیتل، چاندی یا جست کی نلی جو حقے کی نے کے آگے لگاتے ہیں'' لکھے ہیں ۔ فرہنگ تلفظ مرتبہ شان الحق حقی بھی صفحہ 915 پر مہنال لکھتے ہیں اور اس کے معنی ''حقے کی نے کے دہانے پر کش لینے کے لئے چڑھائی جانے والی دھات کی نکی'' بیان کیا ہے ۔ فیروز اللغات کے صفحہ 659 پر اس لفظ کو منہ نال لکھا ہے اور اس کے معنی ''دھات وغیرہ کی

نلکی جسے حقہ پینے کی جگہ لگاتے ہیں'' لکھے ہیں۔ یہ لفظ ہندی زبان کا ہے مفہوم اور معانی کے لحاظ سے درست املا 'مہنال' ہے۔ دوسرے مصرع میں لفظ 'دست پناہ' کے معنی 'چمٹا' یعنی جس سے کوئی چیز پکڑی جائے، کے ہیں۔ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔

162. 'منہ نال' سے مراد نلی یا نلکی ہے جو حقہ کے کش لگاتے وقت منہ کے ساتھ لگتی ہے۔ 'کریسنٹ' صفحہ 44 پر پانچواں مصرع یوں ہے: رونق بزم کی ہے گویا نشانی باقی۔ یہ مصرع بھی رواں ہے۔

163. پہلے مصرع کے لفظ 'تجکو' کریسنٹ اور رومان میں 'تجھکو' لکھا گیا ہے۔ راقم کے مطابق درست املا 'تجھ کو' ہے مصرع میں 'تجکو' مناسب ہے۔ اس بند کا تیسرا مصرع 'کریسنٹ' میں یوں ہے: آہ کس شان سے حقے پہ سجایا تجھکو۔ رومان، شمارہ مئی 1936ء میں مکمل شعر اس طرح ہے:

راکھ کا ڈھیر مرے شوق کا ہے زندہ ثبوت
حقہ شاہد ہے کہ کل پیتا تھا کس پیار سے میں

فارسی زبان کے کا شعر کا ترجمہ: افسوس کہ پلک جھپکنے میں صحبت یار ختم ہوگئی ہم نے جی بھر کر پھول کا چہرہ بھی نہ دیکھا تھا کہ بہار ختم ہوگئی۔ اس شعر کے پہلے مصرع میں صحبت یار کے لفظ کو 'رومان' شمارہ مئی 1936ء میں 'صحبت باز' لکھا ہے جو کہ راقم کے نزدیک کتابت کی غلطی ہے۔

164. اس بند کا مصرع مرزا غالب کے ایک مصرع کی تضمین ہے۔ دیوان غالب (نسخہ خواجہ)، صفحہ 81 پر مکمل شعر یوں ہے۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر تمیمی نے قلمی تحریر میں 'کام وہ اچھا ہے جس کا کہ مآل اچھا ہے' لکھا ہے۔ متن میں درست مصرع لکھ دیا گیا ہے۔ تیسرا شعر بھی تضمین ہے ماہنامہ 'رومان' لاہور، شمارہ مئی 1936، صفحہ 93 پر 'ساغر جم' کو 'جام جم' لکھا گیا ہے۔ جو کہ غلط ہے بحوالہ دیوان غالب (نسخہ خواجہ) صفحہ 81۔ اس بند کا آخری تضمین ہے۔ مکمل شعر یوں ہے:

تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی — تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

165. خضر تمیمی نے اختر شیرانی کی نظم 'یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی' کی پیروڈی 'جہاں رمضان رہتا تھا' کے عنوان سے کی۔ اس نظم کو قلمبند کرنے کی وضاحت 'نقوش' طنزو

مزاح نمبر 1959ء صفحہ 422 پر مولانا چراغ حسن حسرت (سندباد جہازی) نے یوں کی ہے۔
''ایک صحبت میں مولانا کے تین عقیدت مند یعنی جناب خضر تمیمی، عزیزم عطاءاللہ سجاد اور راقم الحروف جمع ہو گئے اور باتوں باتوں میں اس نظم کا ذکر آ گیا۔ مولوی خضر تمیمی کی جان پہچان کے لوگوں میں میاں رمضان ایک بزرگوار تھے۔'ریحانہ' کے تذکرہ میں انہیں بے اختیار وہ یاد آ گئے اور چند منٹوں میں یہ ساجھے کی نظم لکھ ڈالی گئی''۔ یہ نظم مسدس ترکیب بند کی ہیئت میں ہے۔ ہفت روزہ 'شیرازہ' لاہور، شمارہ 16 دسمبر 1936ء صفحہ 22 تا 23 پر چار بند شائع ہوئے۔ اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 28 تا 29 پر دو بند شائع ہوئے۔ اردو کی مزاحیہ صحافت، صفحہ 306 تا 307 ایک بند شائع ہوا۔ شہرلب دریا، صفحہ 172 تا 173 پر چار بند شائع ہوئے۔ زمانی ترتیب اور زیادہ بندوں کی تعداد کے پیش نظر 'شیرازہ' میں لکھی گئی نظم کو متن میں شامل کیا گیا ہے۔ باقی کو اختلاف متن کی صورت میں یہاں شامل کیا گیا ہے۔

166. 'اردو کی مزاحیہ صحافت' صفحہ 306 پر پہلے مصرع میں 'لمبردار' کو 'نمبردار' لکھا ہے۔ 'لمبردار' پنجابی زبان کا لفظ ہے۔ ان دونوں الفاظ کا مطلب یکساں ہے۔ اس بند کے چوتھے مصرع کو اردو کی مزاحیہ صحافت، صفحہ 306 پر یوں لکھا گیا ہے: جو اس کو یاد رکھتا تھا، وہ اس کو یاد رکھتا تھا پانچویں مصرع میں رحمان، کو رمضان، لکھا ہے جو کہ غلط ہے کیونکہ رمضان اور رحمان دو مختلف اشخاص ہیں اس پورے شعر کو پڑھ کر اس بات کی وضاحت خود بخود ہو جاتی ہے۔

167. 'اردو مزاحیہ شاعری' صفحہ 28 پر اس مصرع کے لفظ 'کو چہ' کو 'کوچے' لکھا گیا ہے۔

168. شہرلب دریا، صفحہ 173 پر اس لفظ کی املا 'راہوار' ہے۔

169. اکبرالہ آبادی نے ایک انگریز شاعر 'سودے' کی نظم کی پیروڈی 'آب لوڈور' کے عنوان سے کی۔ خضر تمیمی نے 'آب لوڈور' کی پیروڈی 'ہاتھ کی روانی' کے عنوان سے کی۔ ماہنامہ 'رومان' لاہور، شمارہ مارچ 1937ء صفحہ 83 تا 84 میں اس پیروڈی کے 34 اشعار۔ روزنامہ 'امروز' لاہور، 20 فروری 1977ء صفحہ 3 پر 9 اشعار۔ ماہنامہ 'قانونگو شیخ' لاہور، شمارہ مارچ 1982ء صفحہ 20 تا 21 پر 30 اشعار۔ اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 90 پر 20 اشعار، نوادرات سخن، صفحہ 179 تا 180 پر 17 اشعار درج ہیں۔ ان کے علاوہ احمد ندیم قاسمی نے راقم کو اپنے خط مرقومہ 17 دسمبر 2000ء میں اپنی یادداشت کے مطابق خضر تمیمی کی زبانی سنے ہوئے اس نظم کے پانچ مصرعے لکھ بھیجے۔ زمانی ترتیب اور زیادہ اشعار کی دستیابی کے پیش نظر ماہنامہ 'رومان' میں موجود

اشعار متن میں درج ہیں۔ باقی کو اختلاف متن کی صورت میں شامل کیا گیا ہے۔

170. نقوش، طنز و مزاح نمبر 1959ء صفحہ 827۔ روز نامہ امروز لاہور، صفحہ 3 اور ماہنامہ قانونگو شیخ، لاہور، صفحہ 20 پر اس لفظ کی املا 'مہماں' ہے۔ جب کہ مصرع میں وزن کے مطابق 'میہماں' درست ہے بقول محمد دریام تمیمی اک مہربان سے مرادنی۔ ۔ م۔ راشد ہیں۔

171. نقوش، طنز و مزاح نمبر 1959ء صفحہ 827 اور ماہنامہ قانونگو شیخ، لاہور، صفحہ 20 پر 'کھانے' کی بجائے 'کھانوں' ہے اردو مزاحیہ شاعری اور نوادرات سخن میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔

172. 'دز نظر' سے مراد فاطمہ دز نظر ہے جو کہ خضر تمیمی کی بیٹی ہیں۔ 'اردو مزاحیہ شاعری' اور 'نوادرات سخن' میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔

173. نقوش، اردو مزاحیہ شاعری، روز نامہ امروز، اور قانونگو شیخ میں اس شعر کے دونوں مصرعوں کے قافیے متن کے برعکس ہیں یعنی پہلے مصرع میں 'رنگ' کی بجائے 'ڈھنگ' اور دوسرے مصرع میں 'ڈھنگ' کی بجائے 'رنگ' ہے۔ شعر کے مفہوم کے مطابق یہ ترتیب قریب الفہم معلوم ہوتی ہے۔

174. یہ شعر 'اردو مزاحیہ شاعری' میں شامل نہیں ہے۔

175. نقوش، طنز و مزاح نمبر 1959ء صفحہ 827، ماہنامہ قانونگو شیخ، لاہور، صفحہ 20 اور نوادرات سخن، صفحہ 179 میں اس شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے:

ع اور ہڈی سمجھ کر چبا ہی نہ جائیں۔ اردو مزاحیہ شاعری میں یہ شعر درج ہی نہیں ہے۔

176. اردو مزاحیہ شاعری میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔

177. ایضاً

178. اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 90 روز نامہ امروز، صفحہ 3' ماہنامہ قانونگو شیخ، صفحہ 20 اور نوادرات سخن، صفحہ 179 پر دوسرے مصرع میں ''پہ'' کی بجائے ''سے'' ہے جبکہ نقوش طنز و مزاح نمبر 1959، صفحہ 827 پر دوسرا مصرع یوں ہے: ع وہ پیچھے سے چمچا لڑاتا ہوا۔

179. نوادرات سخن، صفحہ 179 پر دوسرے مصرع کا قافیہ 'رچاتا' کی بجائے 'مچاتا' ہے۔

180. نقوش، طنز و مزاح نمبر 1959ء صفحہ 1827۔ ماہنامہ قانونگو شیخ، لاہور، صفحہ 20' روز نامہ امروز، لاہور، صفحہ 3، نوادرات سخن، صفحہ 179 اور اردو مزاحیہ شاعری، صفحہ 90 پر دونوں مصرعوں کے قافیے برعکس لکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ روز نامہ امروز، لاہور اور ماہنامہ قانونگو شیخ، لاہور میں پہلے مصرع میں موجود لفظ 'سے' کی بجائے 'پر' اور دوسرے مصرع میں ''پہ'' کی بجائے

'سے' لکھا ہوا ہے۔

181. ماہنامہ قانونگو شیخ، لاہور، صفحہ 20 دوسرا مصرع یوں ہے: ع مربے سے بچ کر چپکتا ہوا
روزنامہ امروز، لاہور، صفحہ 3 پر یہ مصرع اس طرح ہے: ع مربے سے جا کر چپکتا ہوا۔ یہ شعر نوادرات سخن، میں موجود نہیں ہے۔

182. نقوش' طنز و مزاح نمبر 1959ء، اردو مزاحیہ شاعری، نوادرات سخن اور ماہنامہ قانونگو شیخ میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔

183. ایضاً۔

184. ایضاً۔

185. یہ شعر نوادرات سخن میں موجود نہیں ہے۔

186. اس شعر کے بعد نقوش، طنز و مزاح 1959ء صفحہ 828 اور ماہنامہ قانونگو شیخ، لاہور، صفحہ 21 پر ترتیب کے لحاظ سے یہ شعر درج ہے۔

پسند اس پسندے کرتا ہوا ۔۔۔ تو چٹنی پہ چٹخارے بھرتا ہوا

نوادرات سخن میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔

187. نقوش، صفحہ 829، اردو مزاحیہ شاعری صفحہ 90 اور ماہنامہ قانونگو شیخ صفحہ 20 پر دوسرے مصرعے کا پہلا لفظ 'یہاں' کی بجائے 'ادھر' ہے۔ یہ شعر نوادرات سخن میں شامل نہیں ہے۔

188. نقوش، اردو مزاحیہ شاعری اور قانونگو شیخ، میں پہلے مصرع کا لفظ 'واں' 'کوئیاں' لکھا گیا ہے۔ اور اس شعر کا دوسرا مصرع یوں لکھا ہوا ہے۔ ع کٹورے کہیں کھنکھناتا ہوا
یہ شعر نوادرات سخن میں نہیں ہے۔

189. نقوش، اردو مزاحیہ شاعری اور قانونگو شیخ میں پہلے مصرع میں 'سرد' کی بجائے 'برف' لکھا ہوا ہے۔ دوسرے مصرع میں پہلا لفظ 'وہ' کی بجائے اردو مزاحیہ شاعری میں 'یہ' لکھا گیا ہے۔

190. نقوش، طنز و مزاح نمبر صفحہ 829، ماہنامہ قانونگو شیخ، لاہور صفحہ نمبر 21 اور نوادرات سخن کے صفحہ 180 پر یہ شعر اس طرح لکھا گیا ہے۔

پلاؤ پہ پل پل کے آتا ہوا ۔۔۔ تو پھرنی پہ پھر پھر کے آتا ہوا

اردو مزاحیہ شاعری میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعے میں 'پھرنی' سے مراد 'فرنی' ہے۔ شاعر نے یہاں تصرف کیا ہے۔

191. نقوش، قانونگو شیخ اور نوادرات سخن میں یہ شعر اس طرح لکھا گیا ہے۔

نوالے سے کشتی بناتا ہوا — اور حلوے کے گولے اڑاتا ہوا

نوادرات سخن میں دوسرے مصرعے میں 'اور' کی بجائے 'وہ' ہے۔ اردو مزاحیہ شاعری میں یہ شعر نہیں ہے۔ اس شعر کے بعد متن کی ترتیب کے برعکس یہ شعر 'نقوش' میں لکھا گیا ہے۔

وہ کھلتا ہوا اور جڑتا ہوا — وہ ہلتا ہوا اور مڑتا ہوا

192. یہ مکمل شعر نقوش، اردو مزاحیہ شاعری، قانونگو شیخ اور نوادرات سخن میں درج نہیں ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے ایک خط بنام راقم محررہ 17 دسمبر 2000ء میں اس شعر کو یوں لکھا ہے۔

اور اس منہ میں اس کو گراتا ہوا — جوتھا غار پر زہر کھاتا ہوا

193. یہ مکمل شعر نقوش، اردو مزاحیہ شاعری، قانونگو شیخ، اور نوادرات سخن میں شائع نہیں ہوا۔

194. اردو مزاحیہ شاعری صفحہ 90 پر پہلے مصرع کے لفظ 'میں' کی بجائے 'سے' لکھا ہے۔

195. اردو مزاحیہ شاعری اور نوادرات سخن میں یہ شعر شامل نہیں کیا گیا۔ نقوش کے صفحہ 829 اور ماہنامہ قانونگو شیخ، لاہور کے صفحہ 21 پر یہ شعر ایسے ہے:

وہ کلّوں سے ٹیلے بناتا ہوا — اور آنکھوں کو پیچھے چھپاتا ہوا

196. نقوش میں یہ شعر ترتیب کے لحاظ سے نمبر 209 کے بعد شامل کیا گیا ہے۔ یہ شعر نوادرات سخن میں نہیں ہے۔

197. نقوش، اردو مزاحیہ شاعری اور نوادرات سخن میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔

198. نقوش کے صفحہ 829 پر دوسرے مصرعے کو یوں لکھا گیا ہے: لپکتا' لہکتا، لٹکتا ادھر ماہنامہ قانونگو شیخ، لاہور صفحہ 21 پر دوسرے مصرع کی ترتیب یوں ہے: لپکتا، لہکتا، لٹکتا ہوا قانونگو شیخ، میں دونوں مصرعوں کی ردیف 'ہوا' ہے جو شعر کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتی۔ راقم کے نزدیک 'ادھر' درست ہے۔ اردو مزاحیہ شاعری اور نوادرات سخن میں یہ شعر شامل نہیں ہوا۔

199. نقوش، اردو مزاحیہ شاعری اور قانونگو شیخ میں اس شعر کے دوسرے مصرع کو پہلا مصرع اور دوسرے مصرعے کی جگہ اگلے شعر کے دوسرے مصرعے کو لکھا گیا ہے۔ اس طرح شعر کی ترتیب یوں بن گئی ہے۔

پکڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہوا — وہ غازی ہے یوں کھانا کھاتا ہوا

یہ شعر نوادرات سخن میں شامل نہیں ہے۔

200. نقوش طنز و مزاح نمبر 1959ء کے صفحہ 829 پر اس شعر کو یوں لکھا گیا ہے۔

لبوں پر زباں کو پھراتا ہوا لپٹتے ہوئے پھیل جاتا ہوا

نوادرات سخن میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔

201. روزنامہ 'امروز' لاہور شمارہ 20 فروری 1977ء صفحہ 3 پر املا کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ وہاں دوسرے مصرعے کو یوں لکھا گیا ہے: ع نہ ہلد، نہ ٹلد، نہ جنبد ز جا۔ یہ مکمل شعر اردو مزاحیہ شاعری میں شامل نہیں ہے۔ اس مصرعے میں خضر تمیمی نے خود مضحکہ خیز الفاظ شامل کئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے: اس جگہ سے نہ حرکت کی، نہ ٹل گیا اور نہ ہی یہاں سے گیا۔ اس شعر کے بعد نقوش، اردو مزاحیہ شاعری، روزنامہ امروز، قانونگو شیخ اور نوادرات سخن میں ترتیب کے لحاظ سے یہ شعر لکھا گیا ہے۔

غرض اس طرح ہیں مرے مہرباں بس اب دیکھ لیں شاعر نکتہ داں

202. اس شعر کے پہلے مصرعے میں انگریز شاعر کے نام 'سُو دے' کو اردو مزاحیہ شاعری، روزنامہ امروز، نقوش اور قانونگو شیخ میں 'سودا' لکھا گیا ہے۔ غالب امکان ہے کہ یہ اختلاف تلفظ کی وجہ سے ہے۔

203. خضر تمیمی نے علامہ اقبال کی نظم 'ایک آرزو' مشمولہ 'بانگ درا' کی پیروڈی "گھوڑے کی آرزو" کے عنوان سے لکھی۔ نظم 'ایک آرزو' کا پہلا شعر یوں ہے:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

خضر تمیمی کی اس نظم کی قلمی تحریر راقم کو حکمت ادیب سے دستیاب ہوئی۔ جو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم غبار کارواں، مرتبہ پروفیسر محمد حیات خان سیال، 1979ء، صفحہ 17 تا 18 اور چناب کالج جھنگ کے ادبی مجلّہ 'دی میوز' شمارہ 2000ء صفحہ 25 تا 26 شائع ہوئی۔ دونوں میں تیرہ تیرہ اشعار شامل ہیں۔ متن میں قلمی تحریر کے اشعار لکھے گئے ہیں۔ باقی کو اختلاف متن کے تحت واضح کیا گیا ہے۔ واوین میں بند مصرعے تضمین کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

204. 'دی میوز' 2000، صفحہ 25 پر دوسرے مصرعے میں 'یونہی جو' کی لفظی ترتیب کو 'جو یونہی' سے بدل دیا گیا ہے۔

205. 'دی میوز' میں پہلے مصرع کے لفظ 'ہے' کو 'تھا' لکھا گیا ہے۔

206. غبار کارواں، صفحہ 17 پر شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ 'دونو' کو 'دونوں' لکھا گیا ہے۔ یہ علامہ اقبال کے شعر کا ایک مصرع ہے۔ اس کی درست صورت کو متن میں شامل کیا گیا ہے۔

207. 'غبار کارواں' صفحہ 18 پر اس شعر کے مصرع اول میں 'مری سے' کی بجائے 'میری' اور دوسرے مصرع میں 'مجکو' کی املا 'مجھ کو' لکھا ہے۔ دوسرے مصرع کے اس لفظ کو 'دی میوز' صفحہ 25، پر 'مجھ کو' لکھا ہے۔ اس ترمیم کو شاعر کا تصرف کہا جا سکتا ہے۔

208. 'غبار کارواں' اور 'دی میوز' میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔ یہ علامہ اقبال کی نظم 'اک آرزو' کے شعر کا دوسرا مصرع ہے۔ قلمی تحریر میں 'مہندی' کو 'مینھدی' لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔

209. ایضاً۔ 'غبار کارواں' اور 'دی میوز' میں یہ شعر شامل نہیں ہے۔

210. خضر تمیمی نے علامہ اقبال کی نظم 'ترانہ ملی' مشمولہ 'بانگ درا' کی پیروڈی 'قصابوں کا قومی ترانہ' کے عنوان سے کی۔ اس زمین میں اکبرالہ آبادی نے بھی پیروڈی لکھی تھی۔ انہوں نے اس کو قومی رنگ میں استعمال کیا ہے۔ جبکہ خضر تمیمی نے مزاحیہ طور پر پیشہ ورانہ رنگ میں لیا ہے۔ 'ترانہ ملی' کا پہلا شعر یوں ہے:

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

منظور نسیم تمیمی نے بتایا کہ یہ نظم کسی رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ خضر تمیمی کی قلمی تحریر دستیاب ہوئی ہے۔ یہ رسالہ کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکا تاہم محمد وریام تمیمی اور منظور نسیم تمیمی کی تصدیق کے بعد اس نظم کو متن میں شامل کیا گیا ہے۔ خضر تمیمی کا مزاج اور اسلوب شعر سے بھی اس نظم کی تائید ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کی اس نظم کے کئی مصرعے تضمین کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور بعض میں معمولی تحریف بھی کی گئی ہے۔

211. خضر تمیمی کی ایک بوسیدہ قلمی تحریر ان کے کاغذات سے دستیاب ہوئی ہے۔ اس پر 10 دسمبر 1971ء کی تاریخ درج ہے۔ اس نظم کے یہی اشعار پڑھے جا سکے ہیں۔ کیونکہ خالی جگہیں، کرم خوردہ ہیں اپنی طرف سے پورا یا نصف مصرع شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

212. یہ اشعار بھی بوسیدہ قلمی تحریر کی صورت میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اس نظم کی خالی جگہیں اور عنوان والی جگہ کرم خوردہ ہے۔ راقم نے نظم کے مضمون کی مناسبت سے قیاس کرتے ہوئے اس کا عنوان ''ازار بند'' تجویز کر کے متن میں شامل کیا ہے۔ قلمی تحریر میں اس نظم کی ردیف 'آزار بند' لکھی گئی ہے۔ جو اشعار کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتی۔ آزار کے معنی دکھ، غم اور تکلیف کے ہیں۔ یہ شاعر کی املا کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی بجائے 'ازار بند' ہونا چاہیے۔ جس سے مراد ہے 'سوت ریشم کا ناڑا جو پاجامہ یا شلوار کے نیفے میں ڈالا جاتا ہے'۔ راقم کے نزدیک اس لفظ کی

درست املا اشعار کے مفہوم کی روشنی میں 'ازار بند' ہے۔ یہی ردیف متن میں شامل کی گئی ہے۔

213. متفرقات کے عنوان سے ایسے اشعار کو متن میں شامل کیا گیا ہے جو مکمل نظم کی صورت میں دستیاب نہیں ہوئے ہیں بلکہ مختلف جگہوں سے ملے ہیں۔

214. یہ دونوں اشعار خضر تمیمی نے اپنے دوست چرخ چنیوٹی کے شعری مجموعہ 'حسن نظر' کے دیباچہ میں صفحہ 5 پر لکھے۔ تیسرے مصرع کے پہلے لفظ دو (2) کو چوتھے مصرع کے اعداد 1969 میں سے تفریق کر کے 1967 لکھا ہے۔ اس طرح چوتھے مصرع سے کتاب لکھنے کا یہ سال نکالا ہے۔

215. خلیل احمد ملک، متعلم ایم۔اے پنجابی، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور نے 1973ء میں لاہور کے صوفی بزرگ اور خضر تمیمی کے مرشد حافظ برکت علی قادری کے حوالے سے '' حافظ برکت علی دی حیاتی تے اونہاں دی شاعری'' کے موضوع پر ایم۔اے پنجابی کا تحقیقی مقالہ خضر تمیمی کے زیر نگرانی لکھا۔ اس وقت خضر تمیمی، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔اے پنجابی کے اعزازی لیکچرار تھے۔ اس مقالہ کا تعارف خضر تمیمی نے لکھا۔ اس تعارف میں خضر تمیمی نے اپنے مرشد کی تاریخ وصال اس شعر کے ذریعے لکھی۔ دوسرے مصرع سے حروف ابجد کی اعداد شماری کے مطابق 1383ھ کا سال نکالا ہے جو حافظ برکت علی قادری کا سالِ وصال ہے۔

216. پروفیسر تقی الدین انجم، ریٹائرڈ پرنسپل، گورنمنٹ کالج جھنگ نے دفتر ہفت روزہ 'عروج' جھنگ میں خضر تمیمی کی زبانی یہ شعر سنا۔ راقم کو یہ بات پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم ضیا نے بتائی اور یہ شعر بھی سنایا۔ اس شعر میں سلو، تندور پر روٹیاں پکانے والی دائی کا نام ہے۔ اس عروج کے دفتر میں چوہدری غلام مرتضےٰ منشی تھے جو لنگڑے بھی تھے۔ یہ اس عورت کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اس عورت کے آنے جانے کا راستہ یہی تھا۔ خضر تمیمی نے منشی کو مذاق اڑاتے دیکھا تو یہ شعر کہا۔

217. اس شعر کے بارے میں محمد دریام تمیمی نے راقم کو بتایا کہ شیخ محمد امین گکوں ایڈووکیٹ، خضر تمیمی کے استاد تھے۔ خضر تمیمی نے ان کے زیر سایہ اپرنٹس شپ مکمل کی تھی۔ وہ عمدہ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ایک دفعہ شیخ محمد امین کے ڈیرہ پر چنیوٹ میں مشاعرہ ہوا جس میں سیماب اکبرآبادی آئے ہوئے تھے۔ اس مشاعرہ میں طرح مصرع تھا: ع صبح بہار آگئی نور و ضیا لئے ہوئے۔ خضر تمیمی نے فوراً گرہ لگائی: آ گیا قصاب بھی اپنا گدھا لئے ہوئے۔ راقم کے خیال میں اس مصرع سے قبل 'لو' کا لفظ شامل کیا جائے تو وزن پورا ہو جاتا ہے اور روانی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے

متن میں 'لو' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ غالب قیاس یہ ہے کہ محمد وریام تمیمی ضعیفی کی وجہ سے یہ لفظ خود بھول گئے ہیں۔

218. خضر تمیمی نے استاد بوٹے خاں گلزار کا حال' کے عنوان سے 'آب حیات' مصنفہ محمد حسین آزاد کے ایک باب کی نثر میں پیروڈی لکھی۔ یہ باب شیخ ابراہیم ذوق کے بارے میں ہے۔ یہ پیروڈی نقوش، طنز و مزاح نمبر 1959ء صفحہ 418 تا 421 شائع ہوئی۔ یہاں تین اشعار مختلف جگہوں پر درج ہیں جو متن میں شامل کئے گئے ہیں۔ پہلے شعر کا دوسرا مصرع تضمین کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اصل شعر میر تقی میر کا ہے جو یوں ہے:

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

219. الٰہی بخش چنیوٹ کے ایک متمول شیخ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈوگرہ فوج کے خلاف کشمیر میں مسلمانوں نے ایک احتجاجی جلسہ کیا جس میں الٰہی بخش شریک تھے۔ 13 جولائی 1931ء کو ڈوگرہ فوج کی فائرنگ سے الٰہی بخش شہید ہو گیا۔ اس وقت مجلس احرار نے کشمیر میں تحریک آزادی چلا رکھی تھی۔ بلال زبیری نے 'جھنگ کی لوک کہانیاں' صفحہ 128 پر اس وضاحت کے ساتھ انہیں تحریک آزادی کشمیر کا پہلا شہید لکھا ہے۔ اس شہادت پر خضر تمیمی نے ایک طویل پنجابی نظم لکھی جو تلاش بسیار کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکی۔ ان دو اشعار کو متن میں شامل کیا گیا ہے جو محولہ کتاب میں درج ہیں۔

☆☆
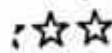
حواشی

(نثری تحریریں)

1. مطبوعہ ہفت روزہ 'یادخدا' چنیوٹ، 5 جولائی 1940ء صفحہ الف۔ اس مضمون کا پس منظر یہ ہے کہ جنگ عظیم اول کے دوران غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر لوگوں نے بینکوں اور ڈاکخانوں سے اپنی رقوم اور سرٹیفیکیٹس وغیرہ نکلوا کر اپنے پاس محفوظ کرنا شروع کر دیئے۔ اس معاملے کو دیکھتے ہوئے خضر تمیمی نے لوگوں سے کہا کہ حکومت برطانیہ کو اس موقع پر رقوم وغیرہ نکلوا کر کمزور نہ کیا جائے بلکہ اعتماد کرتے ہوئے سب کچھ بینکوں اور ڈاکخانوں میں رہنے دیا جائے اور مزید سرٹیفیکیٹس خریدے جائیں جس پر حکومت برطانیہ معقول منافع بھی دے گی۔
2. یہ فارسی مثل ہے جس کا مطلب ہے: تھوڑا تھوڑا جمع کرنے سے بہت بن جاتا ہے۔
3. 'گلگونہ' فارسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے: غازہ، ابٹن، سرخی۔
4. مطبوعہ ہفت روزہ 'یادخدا' چنیوٹ، 26 جولائی 1940ء صفحہ 5۔ اس مضمون میں خضر تمیمی نے حکومت برطانیہ کو قرضہ برائے جنگ دینے کے لیے عوام کو رغبت دلائی ہے۔
5. مطبوعہ پندرہ روزہ 'پنجاب' لاہور، 15 ستمبر 1954ء صفحہ 11 تا 16۔
6. اس فارسی شعر میں تحریف کرتے ہوئے لفظ 'چنیوٹ' کو شامل کیا گیا ہے۔ اس شعر کا ترجمہ ہے: چنیوٹ کو جان دے کر ہم نے خریدا ہے۔ جان دی اور دوسری جنت خرید کی۔ مضمون نگار نے اسے اپنے مضمون میں نواب سعداللہ خاں کا شعر لکھا ہے۔
7. یہ مضمون خضر تمیمی کی قلمی تحریری صورت میں ان کے کاغذات سے دستیاب ہوا ہے جس میں انہوں نے قائداعظم کے حسن کردار پر اظہار خیال کیا ہے۔
8. یہ شیخ سعدی کا شعر ہے۔ گلستان سعدی۔ بہ تحشیہ مولانا قاضی سجاد حسین، باب اول، ملتان، مکتبہ امدادیہ، جولائی 1952ء صفحہ 30 میں شامل ہے۔ اس کا ترجمہ ہے: اس کے سر پر عقل مندی کے باعث بلندی کا ستارہ چمک رہا تھا۔
9. یہ مصرع ابراہیم ذوق کا ہے۔ مکمل شعر یوں ہے:

کہتے ہیں کہ ذوق آج جہاں سے گزر گیا — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

10. خضر تمیمی'' اقبال کے ہاں'' ملفوظات اقبال، محمود نظامی، لاہور، اشاعت منزل بل روڈ، سن ندارد، صفحہ 266 تا 272۔ اس مضمون کے مندرجات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ 1933 میں لکھا گیا تھا۔

11. کلکتہ سے شائع ہونے والے ایک رسالہ کا نام ہے۔

12. یہ شعر علامہ اقبال کا ہے جو 'کلیات اقبال' (فارسی): ناشر پروفیسر شہرت بخاری، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، 1990ء صفحہ 667 پر 'جاوید نامہ' کے حصہ میں ایک نظم بعنوان 'خطاب بہ جاوید' میں یوں ہے:

آں زایراں بود و ایں ہندی نژاد   آں زحج بیگانہ وایں از جہاد

ترجمہ: وہ تو ایران سے تعلق رکھتا تھا اور یہ ہندی نسل کا ہے۔ وہ حج سے ناواقف ہے اور یہ جہاد سے۔

13. سورۃ المائدہ پارہ 6، رکوع 5، آیت 3۔ ترجمہ: آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔

14. یہ شعر اکبر الہ آبادی کا ہے جو کلیات اکبر، جلد اول میں شامل ہے۔

15. خضر تمیمی کی یہ قلمی تحریر ان کے کاغذات سے دستیاب ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے بغداد شریف (عراق) کے اپنے سفر کے بارے میں روداد لکھی ہے۔ راقم نے اس قلمی تحریر کا عنوان خود تجویز کیا ہے۔ خضر تمیمی سمیت سات افراد پر مشتمل قافلہ بغداد شریف کے مقدس مقامات کی زیارات کے لئے حافظ برکت علی قادری لاہوری کی قیادت میں روانہ ہوا۔ اس مضمون میں درخواست برائے زیارات کے عمل سے لے کر بحری جہاز میں سوار ہونے تک کی کہانی لکھی گئی ہے۔

16. عربی کلمہ ہے: جس کا ترجمہ ہے: پس اس (نعمت) پر اللہ کا شکر ہے۔

17. یہ مناجات کا شعر ہے جو بالعموم مختلف سلسلہ ہائے طریقت کی محافل میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کے شاعر کا نام نامعلوم ہے۔ اس فارسی شعر کا ترجمہ یوں ہے۔
اے اللہ! حضور پاکؐ کے صدقے میں میری مدد فرمایئے۔ اے رسول پاکؐ اللہ کے واسطے میری امداد فرمایئے۔

18. سورۃ البقرہ، پارہ 1 رکوع 1 آیت 5۔ ترجمہ: وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے

ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے۔

19. سورۃ الانبیا، پارہ 17، رکوع 7، آیت 107۔ ترجمہ: ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر عالمین کے لئے رحمت بنا کر۔

20. سورۃ الاحزاب، پارہ 22، رکوع 2، آیت 40۔ ترجمہ: محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، ہاں اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں میں پچھلے۔

21. سورۃ الاحزاب، پارہ 22، رکوع 3، آیت 56۔ ترجمہ: بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبیؐ پر، اے ایمان والو! ان پر درود اور سلام خوب بھیجو۔

22. یہ شعر مختلف سلسلہ ہائے طریقت کی محافل میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کے شاعر کا نام نامعلوم ہے۔

23. ایضاً

24. ایضاً

25. اس دعا کا ترجمہ ہے: اے اللہ! ہمیں اپنی محبت عطا فرما اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عطا فرما اور حضرت غوث العالمین کی محبت عطا فرما۔

26. یہ شعر حافظ لدھیانوی (فیصل آباد) کی ایک نعت کا مقطع ہے۔

27. یہ شعر صوفی بزرگ شاہ میراں (لاہور) کے کسی عقیدت مند نے کہا ہے۔ اس کا نام نامعلوم ہے۔ اس پنجابی شعر کا ترجمہ ہے: دونوں جہانوں پر شاہ میراں کا سایہ ہے جس سوالی نے جو مانگا اسے عطا کر دیا گیا۔

28. 'ریش و بُروت' فارسی مرکب ہے اس کا مطلب ہے: داڑھی اور مونچھ۔

29. یہ مولانا حسرت موہانی کا شعر ہے جو بالعموم صوفیا کی محافل ذکر میں پڑھا جاتا ہے۔

30. سورۃ العمران، پارہ 4، رکوع 1۔ آیت 97۔ ترجمہ: جو اس (خانہ کعبہ) میں داخل ہو گیا، امن میں ہو گیا۔

31. یہ انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ Immigration ترجمہ ہے: آبادکاری۔

32. بحری جہازوں کی ایک کمپنی کا نام ہے British India Steam Navigation

33. خضر تمیمی 'نئی نئی راہیں' ہفت روزہ شیرازہ، لاہور شمارہ 21، جلد پنجم، 16 جولائی

1941ء صفحہ 333تا336۔اس مطبوعہ مضمون کے آغاز میں ایڈیٹر نے یوں وضاحت کی ہے:
'نئی نئی راہیں' کے عنوان سے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے چند ایسی تقریروں کا سلسلہ جاری ہے جو عام طور پر رسماً ادا کی جاتی ہیں، جن کا مضمون نسبتاً یکساں ہی ہوتا ہے۔'کنووکیشن ایڈریس' خطبہ جلسہ تقسیم انعامات' ایسی تقریریں ہیں جنہیں ہم ان تقریبات پر ہمیشہ سنتے ہیں۔خضر تمیمی نے اسی سلسلے میں 'الوداعی خطبے پر تقریر' لکھی تھی جو ان کی غیر حاضری شملہ کی وجہ سے براڈ کاسٹ نہ ہو سکی۔اسے اب قارئین 'شیرازہ' کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔

34. اس فارسی مصرع کا مطلب ہے: جب تک بے وقوف دنیا میں موجود ہیں، کوئی مفلس نہیں رہے گا۔

35. یہ حافظ شیرازی کا شعر ہے جس میں خضر تمیمی نے تصرف کیا ہے۔دیوان حافظ، مولانا قاضی سجاد حسین مترجم صفحہ 39 پر یہ شعر یوں ہے۔

چوں با حبیب نشینی و بادہ پیمائی   بیاد آر حریفانِ باد پیمارا

اس شعر کو 'دیوان خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی' ناشر سازمان انتشارات جاویدان، صفحہ 12 پر یوں لکھا ہے:

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی   بیاد آر محبان باد پیمارا

اس شعر کا ترجمہ ہے: جب تو دوست کے ساتھ بیٹھے اور شراب نوشی کرے تو آوارہ دوستوں کو بھی یاد کر لیا کر۔

36. خضر تمیمی 'شریر لڑکے' ہفت روزہ، شیرازہ، لاہور، شمارہ 24، جلد پنجم، 8اگست 1941ء صفحہ 393تا395۔اس مطبوعہ مضمون کے آغاز میں ایڈیٹر نے یوں وضاحت کی ہے:
'عنوان بالا کے تحت کئی ایک احباب کے تجربے قارئین 'شیرازہ' کی نذر کئے جا چکے ہیں۔اسی سلسلے میں ذیل کا مضمون بھی لکھا گیا تھا جسے باجازت آل انڈیا ریڈیو لاہور شکریے کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے نام و مقام فرضی ہیں'۔

37. یہ فارسی مثل ہے جس کا ترجمہ ہے: صبر ناگوار ہے لیکن اس کا نتیجہ بہت اچھا ہوتا ہے۔

38. مضمون کا عنوان خواجہ حیدر علی آتش کے ایک شعر کا مصرع ہے۔
خضر تمیمی'' یہ قصہ ہے جب کہ آتش جواں تھا'' کریسنٹ، لاہور، اسلامیہ کالج، یادگار نمبر، فروری/اپریل 1951ء صفحہ 62تا69۔

39. یہ عربی مثل ہے جس کا ترجمہ ہے: نجد پر سلام ہو اور جو نجد میں اترا (باشندے) اس پر سلام ہو۔

40. یہ فارسی مثل ہے۔ اس موقع پر بولتے ہیں جب خریدار دیکھ بھال کر سودا نہ کرے اور نقصان اٹھائے۔

41. پاکستان کے فوجداری قوانین کی دفعہ 144 ہے جس کے تحت نظم و ضبط برقرار رکھنے اور امن و امان کی صورت حال کو قابو میں رکھنے کے لئے عوام الناس پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔

42. ترجمہ: ہوا کا رخ بتانے والے مرغ نما کی طرح اس پرندہ نے بھی مبارک پیغام دیا ہے۔

43. اس میں صنعت تلمیح کا استعمال ہوا ہے۔ وہ ہد ہد پرندہ جس نے حضرت سلیمانؑ کو تخت بلقیس کے بارے میں خبر دی تھی۔

44. اس سے مراد ہیلی کالج لاہور کا ہوسٹل ہے۔

45. ترجمہ: میرا شعر بھی سن۔

46. یہ شعر مرزا غالب کا ہے بحوالہ: دیوان غالب (نسخہ خواجہ)، ڈاکٹر معین الرحمٰن، لاہور مکتبہ اعجاز سمن آباد، 1998ء صفحہ 3

47. خضر تمیمی ''استاد بوٹے خاں گلزار کا حال'' نقوش، لاہور، طنز و مزاح نمبر، شمارہ 72، 71 جنوری، فروری 1959ء صفحہ 418 تا 421۔ خضر تمیمی نے محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' میں شامل شیخ ابراہیم ذوق کے باب کی پیروڈی اس عنوان سے لکھی ہے۔ اس بارے میں مزید وضاحت ایڈیٹر 'نقوش' نے صفحہ 418 پر یوں کی ہے: آل انڈیا ریڈیو نے کچھ عرصے سے اردو ادب کی مستند کتابوں پر پیروڈی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ خضر تمیمی نے آب حیات کی پیروڈی لکھی جو ڈائریکٹر آل انڈیا کی اجازت سے شائع کی جاتی ہے۔

48. یہ شعر مرزا رفیع سودا کا ہے۔ درست شعر یوں ہے جو ان کی غزل کا مطلع ہے:

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

49. یہ شعر علامہ اقبال کا ہے۔ بحوالہ کلیات اقبال، لاہور شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت دوم، جنوری 1975ء صفحہ 98

50. اس شعر کا پہلا مصرع خضر تمیمی کا ہے اور دوسرے مصرع میں تضمین کی ہے۔ جو میر تقی

میر کا ہے۔ مکمل شعر یوں ہے:

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے   اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آوے

بحوالہ کلیات میر، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1987ء صفحہ 166۔

51. یہ شعر خضر تمیمی کا ہے۔ اسے متن میں شامل کیا گیا ہے۔

52. ایضاً

53. تکیہ سے مراد 'فقیروں کے رہنے کی جگہ' ہے۔

54. ایشر داس چرخ چنیوٹی خضر تمیمی کے قریبی دوست تھے جو قیام پاکستان کے بعد دہلی منتقل ہو گئے۔ خضر تمیمی نے چرخ چنیوٹی کے شعری مجموعہ 'حسن نظر' کا دیباچہ لکھا۔ چرخ چنیوٹی نے اس کا انتساب خضر تمیمی کے نام کیا۔ بحوالہ خضر تمیمی، ''دیباچہ'' حسن نظر، چرخ چنیوٹی، دلی، بزم جمال اردو، شکتی نگر، 15 اگست 1967ء صفحہ 3 تا 5۔

55. یہ اشعار خضر تمیمی کے ہیں۔ چوتھے مصرعے کے اعداد حروف ابجد کے قاعدے سے نکالے گئے ہیں جو 1969ء بنتے ہیں پھر تیسرے مصرعے کے پہلے لفظ دو کو تفریق کر دیا ہے۔ اس طرح اشاعت 1967 نکالا گیا ہے۔

56. خضر تمیمی نے پنجابی زبان میں مذاکرہ ریڈیو پاکستان لاہور کے لئے ریکارڈ کرایا ہے جو ان کی وفات کے بعد 25 فروری 1974ء کو پنجابی پروگرام میں چھ بجکر دس منٹ پر نشر ہوا۔ یہ مذاکرہ خضر تمیمی کی قلمی تحریر کی صورت میں دستیاب ہوا ہے۔ اس پر خضر تمیمی کے دستخط ہیں اور ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کئے جانے کی تاریخ اور وقت بھی ان کی اپنی قلم سے لکھا ہوا ہے۔

57. شیخ سعدی کی تصنیف 'گلستان' باب اول، حکایت 1، صفحہ 20 پر یہ جملہ شامل ہے۔ اس کے درست الفاظ یوں ہیں: دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ ترجمہ: مصلحت والا جھوٹ فتنہ وفساد پیدا کرنے والے سچ سے اچھا ہے۔ یہ فارسی جملہ ضرب المثل بن چکا ہے۔ متن میں درست جملہ شامل کیا گیا ہے۔ خضر تمیمی نے قلمی تحریر میں یوں لکھا ہے جو کہ غلط ہے: دروغ مصلحت آمیز بہ راستی شر انگیز۔

اس مضمون میں خضر تمیمی نے دو جگہوں پر تعزیرات پاکستان کی دو دفعات کا ذکر کیا ہے جن کی وضاحت میاں انعام الحق، مجموعہ تعزیرات پاکستان، صفحہ 208 تا 211 پر مختلف پیراگرافوں میں یوں کی گئی ہے۔

دفعہ 193: (جھوٹی شہادت کی سزا) جو کوئی عدالتی کاروائی کے کسی مرحلہ میں ارادتاً جھوٹی گواہی دے یا اس غرض سے جھوٹی گواہی دے کہ وہ عدالتی کاروائی کے کسی مرحلہ میں کام میں لائی جائے تو اس کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد سات برس تک ہو سکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔ اور جو کوئی قصداً کسی اور کیس میں جھوٹی گواہی دے یا جھوٹی شہادت گھڑے تو اس کو دونوں قسموں میں کسی قسم کی قید کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد تین برس تک ہو سکتی ہے اور وہ جرمانے کا مستوجب بھی ہوگا۔

دفعہ 194: (سنگین جرم میں سزا یابی دلانے کی نیت سے جھوٹی شہادت دینا یا گھڑنا) جو کوئی اس نیت سے جھوٹی گواہی دے یا گھڑے کہ اس سے وہ کسی شخص کو ایسے جرم میں سزا یاب کرانے کا باعث ہوگا یا علم رکھتے ہوئے کہ اس سے اس کے باعث ہونے کا احتمال ہوگا جو کسی قانونی رائج الوقت کے مطابق سنگین ہے تو اس کو عمر قید یا قید سخت کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد دس برس تک ہو سکتی ہے۔ اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔ (اگر اس میں بے گناہ سزا یاب ہو کر پھانسی ہو جائے) اور اگر کوئی بے گناہ شخص اس جھوٹی گواہی کے سبب سے سزا یاب ہو کر پھانسی پا جائے تو اس شخص کو جس نے ایسی جھوٹی گواہی دی ہو یا تو سزائے موت دی جائے گی یا وہ سزا جو اس دفعہ میں پہلے بیان ہوئی ہے۔

58. یہ بند معروف صوفی شاعر وارث شاہ کا ہے۔

'ہیر وارث شاہ' مرتبہ محمد شریف صابر، وارث شاہ میموریل کمیٹی، لاہور، محکمہ اطلاعات و ثقافت و سیاحت، حکومت پنجاب، 1986ء صفحہ 75۔ خضر تمیمی نے اس بند کے پہلے مصرع میں، سیلھیاں، کو، سہلیاں، دوسرے مصرع میں 'روڑھ' کو 'روہڑ' تیرے مصرع میں 'موودھا' کو 'موہدا' چوتھے مصرع میں 'داڑھی پُٹ' کو 'داہڑی پٹّی' 'اکھڑ' 'اکھڑا' اور 'کھیٹو' کو، 'چٹیو' لکھا ہے۔ ان کے علاوہ محولہ کتاب میں ردیف 'نیں' ہے جبکہ خضر تمیمی نے 'نے' لکھا ہے۔ اس بند کی فرہنگ محولہ کتاب کے صفحہ 533 پر دی گئی ہے۔ اہم الفاظ کا اردو ترجمہ اس طرح ہے:

دَور: بھنگ کوٹنے والا بڑا کونڈا، مُودھا: جس کا منہ نیچے کی طرف ہو (الٹا)، کھڑل: گڑھا، لانگر: لنگوٹی کا وہ حصہ جو عضو مخصوص کو چھپاتا ہے، اکھڑا: جو سخت اتنا سخت ہو کہ کھودا نہ جا سکے، کھٹنا: ختم کرنا۔ سخت جگہ کھود کر خالی گڑھا بنانا۔

59. 'ہیر وارث شاہ' مرتبہ محمد شریف صابر، صفحہ 75۔ خضر تمیمی نے اس بند کے پہلے مصرع

میں 'پک' کو 'اک'، 'چھمکاں' کو 'چھمک'، 'تریئی' کو 'تری' تیسرے مصرع میں 'داڑھی' کو 'داہڑی'، 'ڈبر' کو 'بھتھاں' چوتھے مصرع میں 'سادھؤ' کو 'ساہدؤ' لکھا ہے۔ ان کے علاوہ اس بند کی ردیف 'ہے' کو 'اے' لکھا ہے۔ متن میں درست الفاظ شامل کئے گئے ہیں۔

60. خلیل احمد ملک، پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج، لاہور میں ایم۔اے پنجابی کے طالب علم تھے۔ ان دنوں خضر تمیمی یہاں اعزازی لیکچرار تھے۔ خلیل احمد ملک نے لاہور کے صوفی بزرگ اور خضر تمیمی کے مرشد حافظ برکت علی قادری کی زندگی اور شاعری کے موضوع پر پنجابی زبان میں ایم۔اے پنجابی کا مقالہ لکھا۔ مقالہ کے نگران خضر تمیمی تھے۔ نگران مقالہ نے 'تعارف' لکھا۔ ان کے دستخط ثبت ہیں اور تاریخ 20 اگست 1973ء درج ہے۔

61. یہ شعر خضر تمیمی کا ہے۔ حروف ابجد کے قاعدے سے دوسرے مصرے کے اعداد نکال کر اپنے مرشد کا سال وصال 1383ھ نکالا ہے۔

62. خضر تمیمی ''Terrae Incognitae'' کریسنٹ، لاہور، اسلامیہ کالج، مارچ/اپریل 1928ء صفحہ 45 تا 48۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا ترجمہ ہے: نامعلوم ملک یا خطہ، علاقہ یا زمین، کوئی مضمون یا علمی شعبہ جس کی تحقیق نہ ہوئی ہو۔ بحوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی (مرتب)، قومی انگریزی اردو لغت، طبع سوم، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، 1996ء صفحہ 2060۔ خضر تمیمی نے یہ مضمون اس وقت لکھا جب وہ اسلامیہ کالج، لاہور میں سال سوم کے طالب علم تھے اور ان کا رول نمبر 88 تھا۔ یہ وضاحت بھی اس مضمون کے آخر میں لکھی ہوئی ہے۔

63. لُون (نمک)، تیل، ادرک۔

64. سبحان تیری قدرت۔

65. یہ حافظ شیرازی کے ایک شعر کا مصرع ہے مکمل شعر ''دیوان خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی'' ناشر، سازمان انتشارات جاویدان، صفحہ 63 پر یوں درج ہے:

تو و طوبےٰ و ما و قامت یار　　فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اس کا ترجمہ ہے: تو ہے اور طوبےٰ، میں ہوں اور دوست کا قد۔ ہر انسان کی فکر اس کی ہمت کے مطابق ہے۔

66. یہ گیت کے بول ہیں: جیا مورا لہرائے ہے چڑھی ہے کالی گھٹا۔

67. دیوان غالب (نسخۂ خواجہ)، ڈاکٹر معین الرحمٰن، لاہور، مکتبہ اعجاز سمن آباد، 1998ء صفحہ 3۔

68. دیوان غالب (نسخہ خواجہ)، ڈاکٹر معین الرحمٰن، ایضاً صفحہ 104۔

69. پیا جائے پردیس۔

70. فارسی شعر کا ترجمہ ہے: کتنا اچھا ہے کہ ایک یا دو دلوں سے راز کی بات کھول دی جائے۔ پچھلی باتیں کرنا گلے شکوے کو بڑھانے والی بات ہوگی۔

71. فارسی شعر کا ترجمہ ہے: آزردہ جان کو تو نے آج رات جلا دیا۔ روز محشر کی طرف ہر گھڑی کو تو نے لمبا کر دیا۔

حواشی
(مکاتیب)

1. خضر تمیمی نے یہ خط ایڈیٹر'رومان'لاہور،اختر شیرانی کو لکھا جو ماہنامہ'رومان'لاہور،نومبر 1937ء صفحہ 6 تا 8 شائع ہوا۔اس خط میں'رومان' کے شماروں کی غلط ترتیب کے بارے میں توجہ دلائی گئی ہے۔محققین کے لئے یہ پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے۔

2. مکمل شعر یوں ہے:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں   صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

3. یہ امیر خسرو کی غزل کے ایک شعر کا مصرع ہے۔مکمل شعر یوں ہے:

بہ لب آمدست جانم،تو بیا کہ زندہ مانم   پس ازآں کہ من نمانم،بچہ کار خواہی آمد

ترجمہ: میری جان لبوں تک پہنچ چکی ہے لیکن تو کہتا ہے کہ میں زندہ ہوں۔جب میں نہیں رہوں گا،تو کس کام سے آئے گا۔

صوفی تبسم (مرتب)،''انتخاب کلام۔امیر خسرو''صفحہ 33

4. یہ فارسی مثل ہے اس سے مراد ہے:رنج کے بعد خوشی ملتی ہے۔

5. خضر تمیمی نے یہ خط بصرہ (عراق) سے اپنے والد صاحب کو لکھا۔خضر تمیمی مئی 1956ء میں اپنے مرشد حافظ برکت علی قادری لاہوری کی قیادت میں دیگر پانچ ساتھیوں کے ہمراہ زیارات مقامات مقدسہ کے لئے گئے تھے۔اس خط میں جن افراد کے نام درج ہیں ان کی وضاحت خضر تمیمی کے بڑے بیٹے منظور نسیم تمیمی نے راقم کے گھر 16 اگست 2001ء کو ملاقات کے دوران کی۔خط مملوکہ منظور نسیم تمیمی ہے۔یہ خط تمیمی نے 4 جون 1956ء کو لکھا تھا۔

والدہ صاحبہ:بختاور۔بخت:نوشاد بخت تمیمی،منجھلا بیٹا۔نعیم:ساجد نعیم تمیمی،چھوٹا بیٹا۔ بھولا ریچھ:درشہوار،کاکی:فاطمہ درنظر کی بیٹی لبنیٰ۔فاطمہ بی بی:خضر تمیمی کی بیٹی،فاطمہ درنظر۔منورہ: خاتون،خضر تمیمی کی بیٹی شمیم:شمیم فاخرہ،خضر تمیمی کی بیٹی۔محمد شفیع:ڈائریکٹر منٹگمری بسکٹ فیکٹری۔ منشی:خضر تمیمی کے دفتر کا کلرک،خدا بخش۔اللہ دتہ:خضر تمیمی کے دفتر میں ٹائپسٹ۔غلام عباس

جعفری ایڈووکیٹ: خضر تمیمی کے دوست جو ہائی کورٹ لاہور میں پریکٹس کرتے تھے۔ بریگیڈیئر :منیر احمد ٹوانہ جو چک جھمرہ فیصل آباد کے قریب نیلیانوالہ گاؤں کے رہائشی اور خضر تمیمی کے موکل تھے۔ بیوی: عائشہ بی بی۔ مقصود: خضر تمیمی کی بیٹی منورہ خاتون کے خاوند۔

6. نذر محمد خان ضلع کچہری جھنگ میں وکالت کرتے تھے۔ ان کے خضر تمیمی کے ساتھ ذاتی مراسم تھے۔ نذر محمد خان کی وساطت سے انتخابی مہم کے سلسلہ میں یہاں کے وکلاء سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ ان دنوں معروف قانون دان راجہ محمد انور ایڈووکیٹ، بارکونسل لاہور کے ممبر کی نشست کے لئے امیدوار تھے۔ خضر تمیمی ان کے مددگار تھے انہوں نے ووٹ مانگنے کے لئے جھنگ آنا تھا تو اس سلسلہ میں یہ خط 29 اکتوبر 1969ء کو لاہور سے لکھا۔ یہ انتخابات 22 نومبر 1969ء کو ہونا تھے۔ یہ خط مملوکہ منظور نسیم تمیمی ہے جس سے راقم نے استفادہ کیا ہے۔

7. نذر محمد خان ایڈووکیٹ نے ذاتی کام کے سلسلہ میں ایک خط لکھا جس کا جواب 13 نومبر 1969ء کو خضر تمیمی نے دیا۔ راقم نے یہ خط مملوکہ منظور نسیم تمیمی سے استفادہ کیا ہے۔

8. منظور نسیم تمیمی نے اپنے والد خضر تمیمی کو ضمیر ٹیکسٹائل ملز کراچی میں اپنی ملازمت کے دوران ایک خط لکھا جس کے جواب میں خضر تمیمی نے 9 نومبر 1970ء کو انہیں یہ خط لکھا۔ یہ خط مملوکہ منظور نسیم تمیمی ہے اور راقم نے استفادہ کیا ہے۔

9. اس خط میں جن افراد کے نام موجود ہیں۔ خضر تمیمی کے بیٹے منظور نسیم تمیمی نے راقم کو 26 مارچ 2010ء کی ملاقات بمقام چنیوٹ میں ان ناموں کی وضاحت کی۔ خدیجہ: منظور نسیم تمیمی کی بیوی۔ فاطمہ: خضر تمیمی کی بڑی بیٹی فاطمہ درنظر۔ منظور: فاطمہ درنظر کا خاوند۔ عبدالغفور :خضر تمیمی کی سالی سبھرائی کا بیٹا جو منٹگمری بسکٹ فیکٹری میں ملازم تھا۔ بے بی: خضر تمیمی کی بیٹی درشہوار۔ پٹھانی: خضر تمیمی کی بیٹی درنجف۔ عنبرین خضر: منظور نسیم تمیمی کی بیٹی۔ شمیم: خضر تمیمی کی بیٹی شمیم فاخرہ۔ گڈی: فاطمہ درنظر کی بیٹی آصفہ نازلی۔ حمیرہ: فاطمہ درنظر کی بیٹی۔ کاکی: فاطمہ درنظر کی بیٹی، لبنیٰ۔ شیخ صاحب: شیخ محمد شفیع وہرہ، ڈائریکٹر منٹگمری بسکٹ فیکٹری۔ ڈاکٹر دین محمد: خضر تمیمی کے دوست جو ڈائریکٹر اور نیشنل میوچل لائف انشورنس کمپنی لاہور تھے۔

کتابیات

1. بلال زبیری ''تاریخ جھنگ'' جھنگ، جھنگ ادبی اکیڈمی، 1976ء
2. چرخ چنیوٹی ''حسن نظر'' دہلی، دتی پرنٹنگ ورکس، 15 اگست 1967ء
3. خضر تیمی (مترجم) ''بنیادی انسانی حقوق کا مسئلہ'' پہلی بار، لاہور، مکتبہ میری لائبریری 1965ء
4. سرفراز شاہد (مرتب) ''اردو مزاحیہ شاعری'' اشاعت اوّل، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، اکتوبر 1999ء
5. طاہر شادانی، ضیاء محمد ضیاء (مرتبین) ''نوادرات سخن'' طبع اوّل، لاہور، وکٹری بک ڈپو، اردو بازار، 1979ء
6. عبدالسلام خورشید (ڈاکٹر) ''وے صورتیں الٰہی'' لاہور، قومی کتب خانہ، دسمبر 1976ء
7. علی محمد خان (ڈاکٹر) ''لاہور کا دبستان شاعری'' لاہور، مقبول اکیڈمی، شاہراہ قائداعظم، 1992ء
8. فرح علی (مرتبہ) ''اردو کی ظریفانہ شاعری'' باراول، لاہور مکتبہ القریش، 1996ء
9. فوزیہ چودھری (ڈاکٹر) اردو کی مزاحیہ صحافت'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء
10. محمد امجد ثاقب (ڈاکٹر) ''شہر لب دریا'' لاہور، ایمی پبلشرز، 1993ء
11. محمد حیات خان سیال (پروفیسر، مرتب) ''غبار کارواں'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1979ء
12. میرزا ادیب ''مٹی کا دیا'' لاہور، مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ، 2000ء
13. نسیم رضوانی، محمد باقر (مرتبین) ''شعرائے پنجاب'' گجرات، گجرات پرنٹنگ پریس، 1937ء

اخبارات

1.	روزنامہ	امروز	لاہور	23 جون 1974ء
2.	روزنامہ	امروز	لاہور	20 فروری 1977ء
3.	روزنامہ	ندا	لاہور	21 مارچ 1990ء
4.	روزنامہ	نوائے وقت	لاہور	13 فروری 1974ء
5.	روزنامہ	عوام	لائل پور	26 نومبر 1973ء

رسائل

1.	ہفت روزہ	جہاں نما	چنیوٹ	5 دسمبر 1937ء
2.	ہفت روزہ	جہاں نما	چنیوٹ	21 فروری 1938ء
3.	ہفت روزہ	شیرازہ	لاہور	23 ستمبر 1936ء
4.	ہفت روزہ	یادخدا	چنیوٹ	26 جولائی 1940ء
5.	ہفت روزہ	یادخدا	چنیوٹ	8 جولائی 1941ء
6.	ہفت روزہ	یادخدا	چنیوٹ	22 جون 1946ء
7.	ماہنامہ	اتحاد زمینداراں	چنیوٹ	جون/جولائی 1967ء
8.	ماہنامہ	خیالستان	لاہور	فروری 1930ء
9.	ماہنامہ	رومان	لاہور	فروری 1936ء
10.	ماہنامہ	رومان	لاہور	مئی 1936ء
11.	ماہنامہ	رومان	لاہور	فروری 1937ء
12.	ماہنامہ	رومان	لاہور	مارچ 1937ء
13.	ماہنامہ	رومان	لاہور	مئی 1937ء
14.	ماہنامہ	رومان	لاہور	ستمبر 1937ء
15.	ماہنامہ	پرچم	لائل پور	جون/جولائی 1973ء

16:	ماہنامہ	قانونگو شیخ	لاہور	مارچ	1982ء
17.	سالنامہ	دی میوز	چناب کالج جھنگ		2000ء
18.	سالنامہ	کریسنٹ	اسلامیہ کالج لاہور	دسمبر	1930ء
19.	سالنامہ	کریسنٹ	اسلامیہ کالج لاہور	نومبر	1931ء
20.	سالنامہ	کریسنٹ	اسلامیہ کالج لاہور	یادگار نمبر فروری/اپریل 1951ء	
21.	سالنامہ	نقوش	لاہور	طنز و مزاح نمبر جنوری/فروری 1959ء	
22.	سالنامہ	حیات ناظم و وفات ناظم چنیوٹ		بروشر	1930ء

تمّت بالخیر
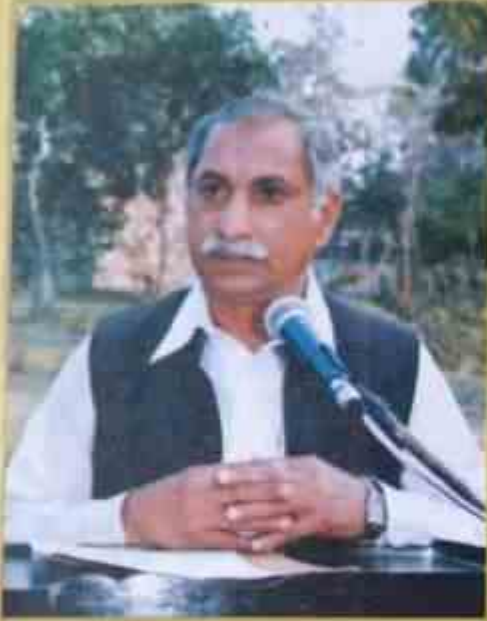
نام: صفدر علی شاہ

ولدیت: محمد حنیف شاہ

پیدائش: 12 اکتوبر 1952ء جھنگ صدر

تعلیمی قابلیت: ایم۔اے (اردو، سیاسیات) ایم۔ایڈ (سیکنڈری)

ایم۔فل اُردو

ملازمت: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ادبیات اُردو

گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج جھنگ

رہائش: محلہ امن آباد نزد فاروق اعظم روڈ، جھنگ صدر

مطبوعہ کتاب: ذوقِ جستجو (مقالات ومضامین) انعام یافتہ

اشاعت اوّل: ستمبر 2007ء اشاعت دوم: جنوری 2009ء

زیرِ ترتیب: پُھلاں بھری چنگیر (پنجابی) مقالات ومضامین

سخنورانِ جھنگ (اُردو) تحقیق وترتیب

جھنگ کا ادبی سرمایہ (اُردو) تحقیق وترتیب

شوقِ جستجو (اُردو) مقالات ومضامین